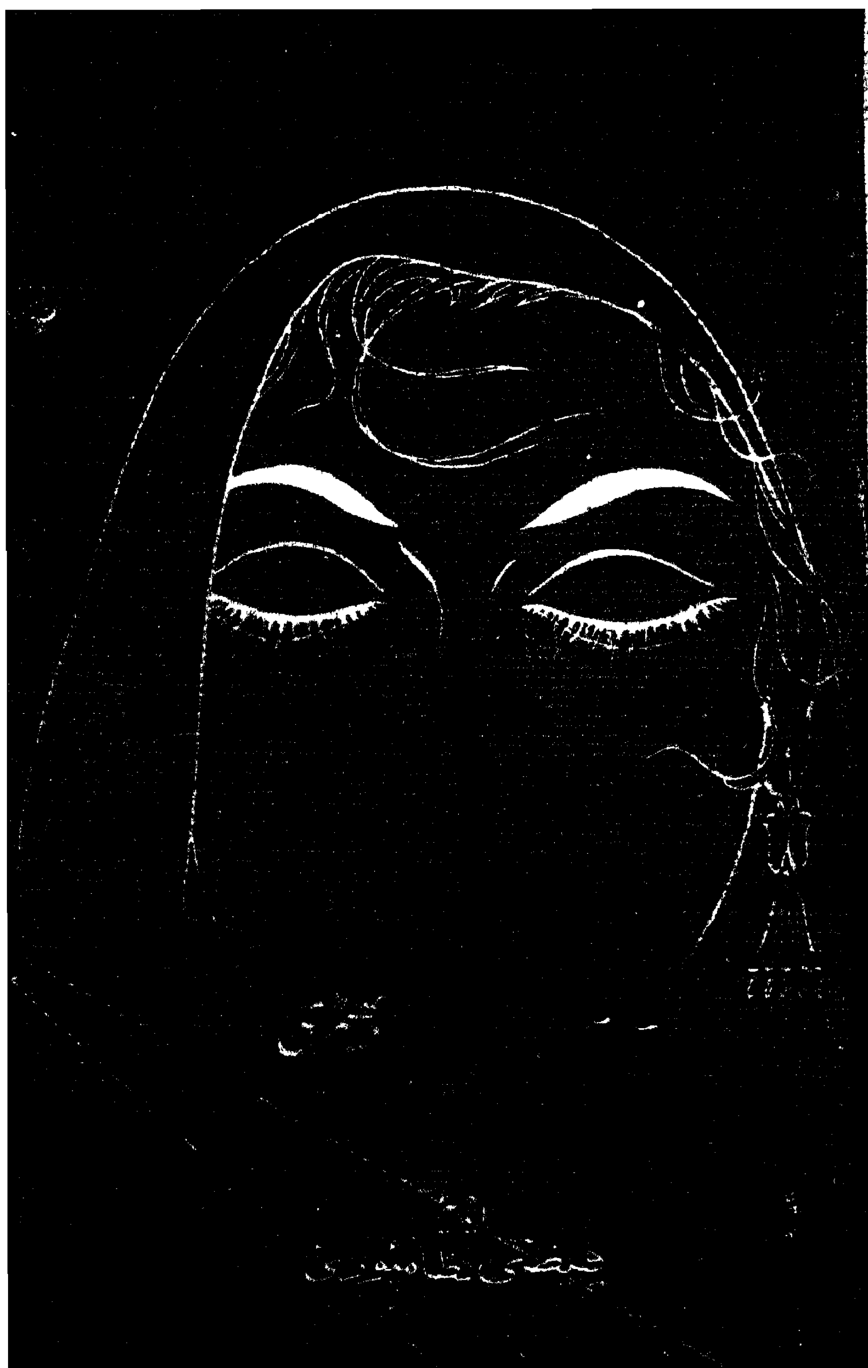
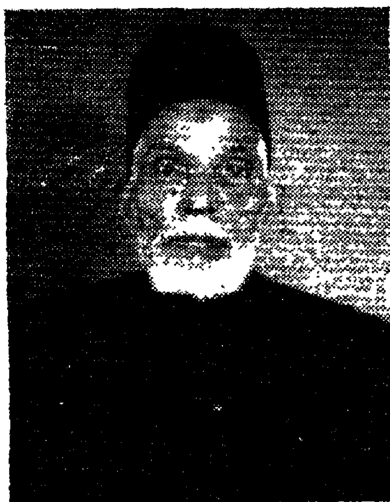


مت سہل انہیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں



بھیونڈی
کی
عظیم ترین
شخصیت



مرحوم
حاجی
عبدالصمد
حاجی
لعل محمد
مومن

آپ نے بھیونڈی میں سنہ ۱۸۸۵ ع میں مفلسی کی آغوش میں آنکھ کھولی۔ اور بہت جلد اپنی خداداد ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے تجارت میں عروج حاصل کیا اور بھیونڈی کی متمول ترین شخصیت بن گئے۔

آپ نہایت خوش اخلاق، خدا ترس، اور مخیر انسان تھے۔ تمام عمر عوام کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ملک و قوم کی بھلائی کیلئے ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے جو آپ کو رہتی دنیا تک زندہ رکھنے کیلئے کافی ہیں۔

سب سے پہلے آپ ہی نے بھیونڈی میں سنہ ۱۹۲۹ ع میں پاور لوم کا کارخانہ قائم کیا۔

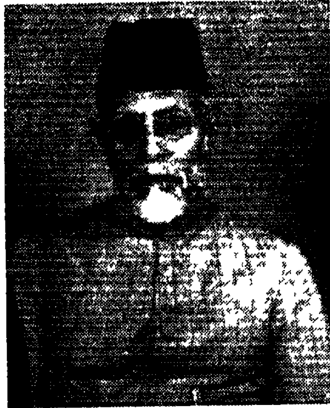
هینڈ لوم بنکروں نے مخالفت کی لیکن آپ نے سبھوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ اور انہیں کی بدولت آج یہ شہر صنعت پارچہ بافی کا مرکز بن گیا ہے۔

آپ نے سنہ ۱۹۴۴ ع میں بھیونڈی ویورس کو آپریٹیو سوسائٹی کو از سر نو زندہ کیا۔ جس سے بنکروں کو کافی فائدہ حاصل ہوا۔ آپ اس سوسائٹی میں سالہا سال تک صدر کے عہدے پر فائز رہے۔ اور اسکے لئے ہر ممکن مالی اعانت کرتے رہے۔ اور اسی سوسائٹی کے ممبران کے تعاون سے آپنے تعلیمی فنڈ قائم کیا جس سے سینکڑوں غریب طلباء فیض یاب ہوئے اور ہو رہے ہیں

تقریباً آٹھ سال تک آپ بھیمڑی نظام پور میونسپلٹی کے صدر رہے۔ آپ ہمیشہ سماجی کاموں میں پیش پیش رہے۔ آپ نے رئیس ہائی اسکول کے طلباء کے لئے ۴۰ ہزار کی رقم خرچ کرکے ایک شاندار ہوسٹل تعمیر کرایا۔ جو انہیں کے نام سے موسوم ہے۔

یہی نہیں بلکہ موجودہ میونسپل ڈسپنسری کے اوپر ایک منزلہ عمارت کھڑی کرکے آپنے تشخیص خانہ قائم کیا جہاں بلڈ، یورین اور اسکریننگ کا کام ہوتا ہے۔

آپ نے گاندھی میموریل فنڈ میں ۵ ہزار روپئے دئے۔ پبلک کے تعاون سے ایک شاندار یتیم خانے کی بنیاد ڈالی۔ جمسیں بہت سے یتیم بچے تعلیم سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔
ہریجن سماج اور ریمانڈ ہوم کو بھی مالی امداد دیتے رہے۔
آپ بھیمڑی میں ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار رہے۔
سنہ ۱۹۶۰ ع میں آپنے داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپکی زندگی ملک و قوم کیلئے ہمیشہ مشعل راہ بنی رہے گی۔



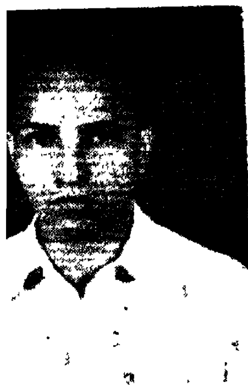
Allama Mehvi Siddiquee



Zohra Devlalvi



Asi Ram Nagri



Islam Zafar M.A.



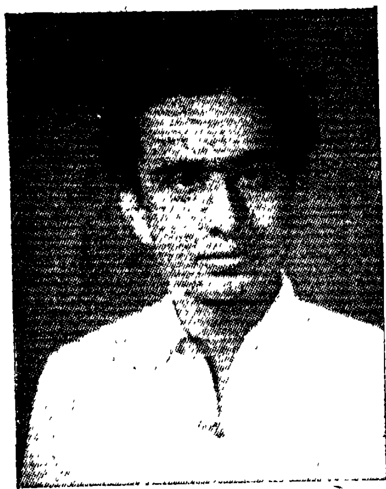
Shams Kanwal



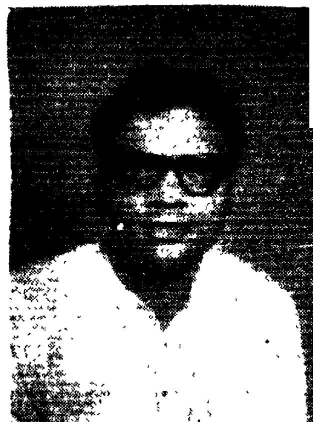
uralya M. Nudrat



Anwar Ahmed Soparvi



Akhter Nazmi M.A.B.E.D



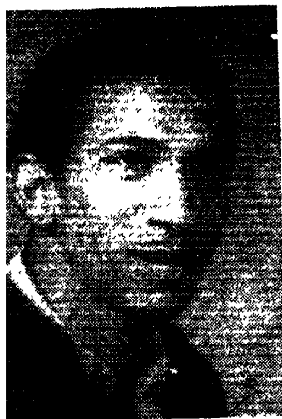
Khawer Bankoti



Ikram Jaweed



Sattiapal Anand



Mohan Yawar



Basheshar Pradeep



Noor Ansari



M.B Noor Bhagal Puri



Khursheed Ahmed



Noor Parkar



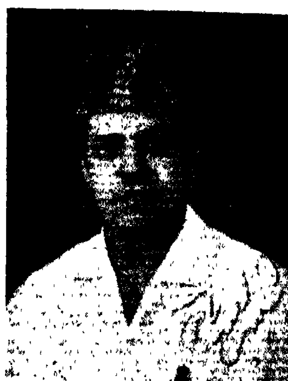
Betab Nizam Puri



Prince Naqi Ali Khan Saqeb



Syyed Hurmatul Ikram



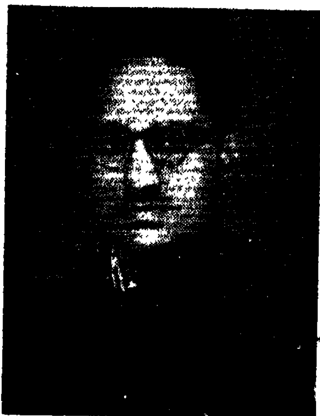
Shabbir Ahmed Rahi M.A.



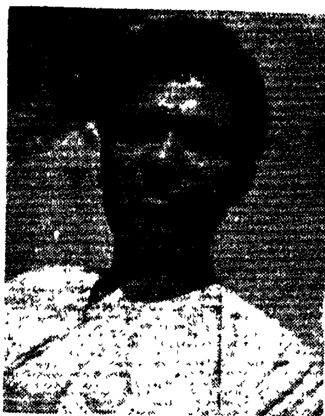
Nayae Sharma



Waqar Khaleel



Maftoon Kotvi



Zahidul Mehvi



Nayeem Kawsar



حضرت سہیل انصاری [illegible]

[illegible]

[illegible] اشاعت ادبی ماہنامہ

سالنامہ

نقّاش

سرپرست:- علامہ محوی صدیقی لکھنوی

نگران:- حضرت آسی رام نگری

مشیر:- مشتاق سہیل [illegible]
ایل ایل بی ایڈوکیٹ [illegible]

مالک و مدیر
فیضی نظام پوری

اپریل
[illegible]

معاون:- [illegible]

زرِ سالانہ
چھ روپے — غیر ممالک:- ۱۲ شلنگ

——— قیمت سالنامہ ۲ روپے

جلد ۲ ——— شمارہ ۱ - ۲ - ۳

[illegible] فیضی نظام پوری نے [illegible] پریس [illegible] سے چھپوا کر
[illegible] سے شائع کیا

لکھنے والے

نقشِ اوّل

گذشتہ چند صدیوں کے عصری تقاضوں کی دھوپ چھاؤں میں پیدا ہو کر ہندستان کی رنگا رنگ تہذیب و ثقافت کی ارتقائی منزلوں کے دوش بدوش پروان چڑھنے والی ہماری اُردو زبان جس قدر سخت جان ثابت ہوئی ہے اسی قدر اس کے موجودہ بولنے اور پڑھنے لکھنے والوں کی غالب اکثریت بے جان و بےحس پائی گئی ہے۔ ایسے نامساعد حالات میں کسی علمی و ادبی جریدے کا اجرا ایک زبردست جد و جہد کے آغاز سے کسی طرح کم نہیں۔ اور جد و جہد بھی ایسی کہ جس میں کامیابی کا امکان ایک ایسے چراغ کی حیثیت رکھتا ہے جو زبردست آندھیوں میں جلا دیا گیا ہو۔ اس تلخ حقیقت کے باوجود ہم نے بےجگری سے نقاش کے اجرا کا فیصلہ کیا

ابتدائی مراحل کے بعد جب پرچے کو منظرِ عام پر لانے کا وقت آیا تو ہمارے کئی کرم فرماؤں نے ہمیں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ بعض نے زور دیا کہ نقاش کا اجرا نہ کیا جائے۔ کیونکہ ان کی نظروں میں ایسے سینکڑوں جرائد کی مثال تھی جو اپنی تمام تر علمی و ادبی خوبیوں کے باوجود مرگِ جوانی کا شکار ہو گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کے لئے بہت بڑا سرمایہ درکار ہے۔ اور اگر سرمایہ ہو تو ایک جنونی جد و جہد اور مشینی تگ و دو کی ضرورت ہے۔ ان حضرات کا ارشاد بجا تھا لیکن ان کے علاوہ کچھ ایسے بھی حضرات تھے اور ہیں جنھوں نے ہماری اس جرأت رندانہ کو سراہا۔ ہمارے حوصلوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور دامے، درمے، قلمے اور سخنے امداد کا وعدہ کیا۔

نومبر ۱۹۶۲ء میں اس کا پہلا شمارہ منظر عام پر آگیا جو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ کشمیر سے [illegible] تک اردو کے ہر بڑے مرکز سے اس کی پذیرائی ہوئی۔ نقاش ماہ بہ ماہ روز افزوں مقبولیت کے ساتھ منظر عام پر آنے لگا۔ اور آج فخر اور اعتماد کے ساتھ نقاش کا پہلا سالنامہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔

گزشتہ ایک سال کے دوران میں جن قلمکاروں، ہمدردوں اور دوستوں نے نقاش کو فروغ دینے میں ہمارا ساتھ دیا۔ ان کے ہم زبان و دل سے شکر گزار ہیں۔ اور یقین دلاتے ہیں کہ نقاش ان کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائے گا۔

پیش نظر سالنامہ کے معیار کے متعلق کچھ لکھنا قبل از وقت بات ہوگی۔ ناقدین اور قارئین نقاش ہی اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہم اسے پیش کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن اس ضمن میں ایک بات کہنا ضروری خیال کرتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم نے کہنہ مشق فنکاروں کی عظیم تخلیقات کے ساتھ ساتھ نئے اور ابھرتے ہوئے فنکاروں کی تخلیقات بھی پیش کی ہیں اور ان کے انتخاب میں ہم نے قدرے نرمی سے کام لیا ہے۔

سالنامے میں کل ۱۰ مضامین، دو انشائیے، ۱۰ نظمیں، ۹ افسانے، اور ۳۹ غزلیں شامل ہیں۔ بعض تخلیقات تاخیر سے ملنے کی وجہ سے اپنا صحیح مقام حاصل نہ کر سکیں جس کا ہمیں افسوس ہے۔

مضامین

(۱) غالب کے تین شعر:- مولانا شہاب ہند و پاک کے کم تحریر مگر بالغ نظر محقق و ناقد ہیں۔ غالب کے تین اشعار کی تشریح موصوف کی زیر تصنیف کتاب سے لیا ہوا ایک تبرک ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ بھی مولانا اپنے تبرکات سے ہمیں نوازتے رہیں گے۔

(۲) پروفیسر عصمت جاوید نے غالب کے فن کے آئینے میں ان کی عملی سوجھ بوجھ کا نہایت ہی مفید اور دلچسپ جائزہ لیا ہے۔ امید ہے کہ یہ مقالہ غالبیات کے شیدائیوں میں دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

(۳) ریاض خیرآبادی پر فخر احمد دھولیوی کا ایک مخصوص مقالہ ہے اس میں [illegible] کا اقتباس

گو زیادہ ہے۔ لیکن اس سے شاعر کو فن کی کسوٹی پر پرکھنے میں آسانی ہو گی۔

(۴) اوج یعقوبی نے خورشید احمد جامی کو شعور فن کا نیا سویرا قرار دیتے ہوئے ہمیں ان کے ایک قابل توجہ اور منفرد شاعر سے روشناس کرایا ہے۔ جامی کا نام تو ہمارے لئے نیا نہیں لیکن یہ مقالہ ان کو اور ان کے کلام کی بنیادی قدروں کو کچھ ایسے خلوص اور دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ اردو شاعری خاص طور پر غزل کے میدان میں جمود کی باتیں کرنے والوں کی غلط فہمی دور ہو جاتی ہے اور یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اردو شاعری میں جمود ایسی کوئی چیز نہیں بلکہ ایسے لوگوں کی کمی ہے جو ہمارے قابل توجہ شاعروں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔

(۵) سید حرمت الاکرام پر ثریا محمود ندرت کے مقالہ سے ناظرین کو ان کی ادبی اور ذاتی خصوصیات کے سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔ لیکن مقالہ کی لمبائی ہمارے ساتھ قارئین کو بھی کھٹکے گی اور وہ ہے ان کے کلام کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کے ساتھ ہی ان کے اشعار کے اقتباسات کی کمی۔ تاہم مقالہ مجموعی طور پر عمدہ اور جاندار ہے۔

(۶) پروفیسر عبد الحی رضا نے کامل جاندپوری کا تعارف پیش کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ان ادیبوں میں سے نہیں جو کسی شاعر پر اس وقت قلم اٹھاتے ہیں جب اس کی تجہیز و تکفین یا آخری کریا کرم کی منزل پوری ہو گئی ہو۔ موصوف نے اردو کے ایک اچھے غزل گو کو ہم سے روشناس کرایا ہے مضمون گو طویل ہے لیکن ناگوار نہیں۔

(۷) "یہ جو ق تیرے آگے جبیں قسمت رہا ہے" میں شمس کنول (ایڈیٹر گگن) نے اردو جاننے والوں کی بے حسی کو جھنجھوڑا ہے۔ اور ان کی توجہ چاہی ہے۔
ہمیں یقین ہے کہ یہ مضمون اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہے گا۔ شمس کنول اپنے گگن میں ایک خاص طرز املا کو فروغ دے رہے ہیں۔ اس مضمون میں بھی ان کی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔

(۸) "شاعر کا خاص نمبر ۱۹۶۴" میں ظفر الاسلام ظفر نے شاعر کا مبصرانہ اور تفصیلی جائزہ لیا ہے اس میں چند باتیں ایسی پیش کی ہیں، جو نہ صرف ہندی مقالہ نگاروں کے لئے بلکہ ایڈیٹر شاعر کے لئے بھی غور طلب ہیں۔

(۹) قدیم ہندوستانی سکے " انور احمد سوباروی کا پر از تحقیق اور معلوماتی مضمون

ہے۔ خشک ہونے کے باوجود اہم ہے۔

(۱۰) رشید الدین نے ایک بادشاہ کی کہانی کا مبصرانہ جائزہ لیتے ہوئے ہمیں ایڈورڈ ہشتم کی رومانی زندگی کے چند اہم پہلوؤں سے روشناس کرایا ہے۔ مضمون ہے تو ہلکا پھلکا لیکن اس حیثیت سے یقیناً قابلِ توجہ ہے کہ ہمیں انگریزی زبان کی عظیم خود نوشت سوانح حیات کے خدوخال معلوم ہو جاتے ہیں۔ اور قاری اس کتاب کو پڑھنے کی کسی قدر تشنگی محسوس کرتا ہے۔

(۱۱) اصلاحات نحوی حفیظ مالیگانوی کا توجہی مضمون ہے۔ اس میں موصوف نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ "جائے استاد خالی است"

انشائیے

انشائیہ میں عرفان شرف کی بکری" اور قیام کنول کا "کنول موت کی آغوش میں" مقصدی ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہیں۔

نظمیں اور غزلیں

نظموں اور غزلوں کی فہرست کافی طویل ہے۔ اس میں ہم نے ہر مکتبہ فکر اور ہر مدرسہ خیال کے فنکاروں کی تخلیقات کو جگہ دی ہے۔ جو گلستان ہزار رنگ کی حیثیت رکھتی ہیں اور ہر پھول اپنے رنگ و بو کے لحاظ سے منفرد ہے۔

افسانے

افسانوں کے انتخاب میں اعتبار معیار حتی المقدور سختی سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن جہاں نئے اور ابھرتے ہوئے فنکاروں کی حوصلہ افزائی پیش نظر رہی ہے وہاں ہم نے نرمی برتی ہے۔ افسانہ "ناحق" نہ صرف پاکستان کے کسی جریدے میں شائع ہو چکا ہے بلکہ افسانہ نگار کے افسانوی مجموعے میں بھی شامل ہے ہم نے اسے اس لئے شریک اشاعت کر لیا ہے کہ ہمارے قارئین صرف اس وجہ سے ایک عمدہ تخلیق سے محروم نہ رہ جائیں کہ وہ کہیں دور چھپ چکی ہے اور کسی ایسے مجموعے میں شامل ہے جو ابھی تک ادب جاننے والوں کی دیرینہ عادت کم خریداری کا شکار ہے۔ مصنف نے ہمیں یہ افسانہ براہ راست ارسال کیا ہے

ہمارے افسانہ نگاروں کی فہرست میں آر سی رام نگری، سبینہ پال آنند، اقبال متین، آمنہ ابوالحسن، زینت ساجدہ، جیلانی بانو، بشیشر پردیپ، اکرام جاوید اور مومن یادور کے نام اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ قارئین کو نہ صرف کچھ اچھے بلکہ چونکا دینے والے افسانے پڑھنے کو ملیں گے۔

سالنامہ کی تاخیر کے اسباب

(۱) ایڈیٹر کی طویل علالت
(۲) بمبئی میں کاتبوں کی کمی
(۳) نیو قادری پریس (جہاں نقاش کی طباعت ہوتی تھی) کا نذر آتش ہونا
(۴) ریو بریس (جہاں "نقاش" کا سرورق اور نقشا وغیرہ چھپتے تھے) کے مالک جناب مقبول احمد تھوٹے کی گمشدگی (تا حال موصولہ اطلاعات کے مطابق)

مندرجہ بالا اسباب کی بنا پر ہم "نقاش" کا سالنامہ اعلان کے مطابق وقت پر شائع نہ کر سکے جس کے لئے ہم قارئین اور خریداران "نقاش" سے معذرت خواہ ہیں ہمیں یقین ہے کہ ہماری پریشانیوں کو دیکھتے ہوئے نقاش کے ہمدرد اور بہی خواہ نقاش کی جانب سے بدظن نہیں ہوں گے۔ اور حسب سابق سلسلۂ خریداری اور تعاون کو جاری رکھیں گے۔

"نقاش" کے آئندہ شمارے انشاء اللہ پابندیٔ وقت کے ساتھ منظر عام پر آتے رہیں گے کیونکہ ۔

اس کو ضد ہے کہ راہوں کو نہ بدلا ہم نے
کتنے طوفان اٹھے حادثے کتنے آئے

فیضی

غالب کے تین شعر

(پروفیسر شہاب مالیر کوٹلوی)

انسانی دل و دماغ اور اس کے روحانی تخیلات و تصورات عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ مثلاً کلکتہ میں غالب غریب الدیار ہیں۔ مخالفت کے طوفان اٹھ رہے ہیں ایسے وقت میں جو اگر انہیں بہ شدت اپنی غریب الوطنی کا احساس ہوتا ہے تو فطری طور پر پہلے پہل وطن، دربار، دوستانِ وطن کی یاد آ ہی جانی چاہیئے۔ اس وقت جذبات نازک ہیں اور حرکت آ جاتی ہے۔ اپنی موجودہ کمزوری اور بے چارگی اور غریب الوطنی میں نئی چوٹوں کے ساتھ پرانے زخم بھی پھر ہرے ہو جاتے ہیں اور وہ اقارب (مشکلات میں گھر کر انسان جن کی مدد پر طبعاً بھروسہ کیا کرتا ہے) پہلے تجربوں کی بنا پر عقارب دکھائی دینے لگتے ہیں اس خیال کے آتے ہی غریب الوطنی کی مصیبتوں کی شدت کم ہو جاتی ہے کچھ ایسی ہی کیفیت ہی ہو گی جس کے زیرِ اثر غالب نے کہا ہو گا۔

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں!

جس وطن کے در و دیوار دشمن ہو رہے ہوں وہاں کی بے مہریوں کے یاد آ جانے پر پرائے شہر کی بے مہریوں کا شکوہ کرنے کا حوصلہ کس کو ہو سکتا ہے۔ انتہائے بے چارگی و کم مائیگی ہے ایسے ہی وقت میں انسان ڈوب کر مر جانے کو ایسی آفت زدہ زندگی پر ترجیح دیا کرتا ہے اور دل میں فیصلہ کر لیا کرتا ہے کہ ذلت و رسوائی کی زندگی سے ڈوب مرنا اچھا تھا نہ جنازہ کو کندھا دینے والوں کے انتظار میں لاش یوں ہی بے گور و کفن پڑی رہتی ہے نہ قبر کی مٹی پٹنے کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ یہ خاموش تمنا ہوتی ہے کہ اگر مزار بنتا تو شائد

کبھی کبھار کوئی نہ کوئی ادھر آنکلتا۔ اور اس قبر پر آکر چراغ ہی جلا جاتا۔ ایسے ہی حالات کے باعث غالب کہتے ہیں کہ

ہوئے ہم جو مر کے رسوا، ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کسی لاش کے بے گور و کفن پڑے رہ جانے یا قبر کے پامال شدہ نشان کے ہونے یا مزار کے بے چراغ پڑے رہنے میں بظاہر مرنے والے کی جو رسوائی دکھائی دے رہی ہے وہ دریا میں ڈوب کر مرجانے میں باقی نہ رہتی تو یہ صحیح نہیں کیونکہ رسوائی سے بچنے کا علاج ڈوب کر مرجانا نہیں بلکہ ایسی موت تو دشمنوں کے ہاتھ میں ایک ڈھول دے دینا ہے۔ رسوائی سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ خود کو رسواکن حرکتوں سے بچایا جائے۔ اس لئے یہ دیکھنا ہے کہ اپنی اس حالت کو ہم بھی رسوائی ہی سمجھتے ہیں۔ یعنی ہم خطاکار ہیں تو یہ رسوائی ہماری خطاؤں کا کفارہ ہو جائے گی۔ جیسا کیا ویسا پایا۔ آخر میں دشمن بھی آپ ہی آپ تھک تھک کا جائینگے۔ ہمارا حال اور ہمارا انجام۔ ہماری خطاؤں کی سزا بن جائے گا، لیکن ہماری رسوائی ہماری کسی نادانی کا نتیجہ نہیں بلکہ ہمارے دشمنوں کی بالادستی کا نتیجہ اور ہماری بیچارگی کا پھل ہے۔ تو ہماری لاش کا بے کفن رہنا یا ہمارے لاشے کا بے گور پڑے رہنا یا ہمارا ناسازگار حالات سے تنگ آکر خودکشی کر لینا حقیقتہً ہماری رسوائی کا سبب نہیں برخلاف اس کے ہماری بے گناہی کا، بلند بانگ خاموش اعلان اور سماج کی قساوت قلبی کا شرمناک ماتم ہے۔ کہ وہ اپنے جگر گوشوں کو قتل کرنا اور کچل دینا تو جانتی ہے مگر نہیں چاہتی کہ وہ عزت نفس کے ساتھ بے ہمہ و باہمہ جی سکیں غالباً اس خیال کو غالب ہی نے ذیل کا شعر کہہ کر کسی شہید جفا اور قتیل ناروا کو پرسا دیا ہے۔

یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اسدؔ بے چارہ زندگی میں خستہ جان تھا اس کی باعزت معیشت کا کوئی سامان نہ تھا مرا تو دیکھو اس کا لاشہ بے کفن پڑا ہے۔ بیچارگی کا یہ عالم ہو کہ زمین اپنی جسم کے دیکھ رہی ہے کہ اس

کی دھرتی بے بس ماں (زمین) کے سینے پر پڑی سڑ رہی ہے اور بیچاری ماں ہے کہ اپنی گود کھول نہیں سکتی۔ کہ وہ اس میں سما جاتا۔ کیا اس کی خستہ حالی اس کی کسی نالائقی اور نا اہلی کے سبب تھی یا اس کی لاش کا بے کفن پڑے رہنا اس کے کسی گناہ کی سزا ہے۔ نہیں۔ ایسا تو نہیں۔ بلکہ یہ ظالم سماج کا ظلم ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اسد ایک آزاد مرد تھا اور مسلکاً آزاد رو انسان تھا۔ جب تک جیا مخالف حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا رہا۔ جب جہاد زندگی میں لڑتا لڑتا زخمی ہو کر گر پڑا اور ختم ہو گیا یا بوٹی بوٹی کر کے چیل کوؤں کے لئے چھوڑ دیا گیا تو انسانیت کے ضمیر نے صدا دی کہ اسد جس حق کا اعلان کرتا ہوا کھیت رہا ہے وہی حق تعالیٰ اس کی معونت کرے اس کی آزادی، آزاد روی، حق پرستی، حق پژوہی کی لاج اب حق تعالیٰ کے ہاتھ ہے۔ کیونکہ کہا گیا ہے کہ ؎

جس کا کوئی کبھی نہ ہوا اس کا خدا ہوتا ہے

غالب کی عملی سوجھ بوجھ فن کے آئینے میں

پروفیسر عصمت جاوید

ایک بااصول اور راسخ العقیدہ آدمی اپنے ہی عقائد اور اصولوں کے شکنجے میں کسا ہوا آدمی ہوتا ہے۔ اور اس حقیقت سے اس کی شخصیت بڑی ٹھوس اور قابل قدر ہوتے کے باوجود جامد اور یک رخی ہوتی ہے۔ اس میں اتنی لچک نہیں ہوتی کہ وہ بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگی پیدا کر کے اس خول سے باہر نکل آئے جس میں اسے خود اس کی نظریاتی صلابت نے قید کر رکھا ہے ۔۔۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ بڑا آدمی جو بااصول اور راسخ العقیدہ ہوتا ہے۔ حالات کا رخ بدل سکتا ہے لیکن ہماری نظروں میں اس آدمی کی وقعت بھی کچھ کم نہیں جسے زندگی سے اس قدر پیار ہو کہ وہ اس کے لئے اپنے اصول میں بھی ترمیم و تنسیخ کرے۔ جو دوستی پر اپنے عقائد کو قربان کر دے جو مذہب کو ظاہری رسوم عبادت کا مجموعہ نہ سمجھے بلکہ جسکے مذہب کی اساس بنی نوع انسان کی عالمگیر محبت پر ہو دوسرے الفاظ میں جو وسیع المشرب ہو۔ جو خود جینا چاہے اور دوسروں کو جینے دے جس کے فلسفۂ اخلاق میں دل آزاری ہی واحد اور سب سے بڑا گناہ ہو۔ جو ریاکاری نہ جانتا ہو جس کا ظاہر و باطن ایک ہو۔ جو معاملہ فہم اور نباض فطرت ہو۔ خذ ما صفا جس کا اصول زندگی ہو ۔۔۔ جو جذبہ برتری سے سرشار اور وضعدار ہونے کے باوجود کم نما اور کم آمیز نہ ہو بلکہ یار باش خوش معاش ہو۔ جس نے اپنی زندگی میں چاہے کوئی بڑا کارنامہ انجام نہ دیا ہو لیکن جو ہجوم غم میں مسکرانے کا حوصلہ رکھتا ہو جس کی زندگی آلام آفات کی آماجگاہ ہو۔ پھر بھی وہ ہمت نہ ہارے جس کے عزائم بلند ہوں اور جو زندگی کو سلیقے سے گزارنے کا نہیں بلکہ زندگی برتنے کا سلیقہ رکھتا ہو یہ تمام خصوصیات اس شخص میں مجتمع ہوتی ہیں جسے

شخصیت کی ساخت میں عمل پسندی جزو غالب کی حیثیت رکھتی ہو۔ غالب بھی اس طرح کے ایک عملی انسان تھے ـــــــ ۔

غالب اردو ادب کے ان خوش نصیب شعرا میں سے ہیں جن کی شخصیت اور فن دونوں نقادانِ ادب کی توجہ خاص کا مرکز رہے ہیں۔ غالب کی شخصیت بڑی پہلو دار شخصیت ہے۔ اس طرحدار شخصیت کے پیچ و خم کھولنے، اس کے تہ خانوں میں جھانکنے اور فن کے آئینے میں اس جاندار شخصیت کا جلیلہ عکس دیکھنے اور اسے سمجھنے اور سمجھانے کے سلسلے میں جو کچھ بھی کام ہوا ہے، وہ قابلِ تعریف ہے۔ اس مضمون میں صرف یہ بتلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ غزل کے روایتی اسلوب سے کلام غالب کی ایک خصوصیت جو بار بار جھانکتی ہے وہ غالب کی شخصیت کا بنیادی عنصر یعنی ان کی عمل پسندی اور عملی سوجھ بوجھ ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب کا کلام تہ در تہ دار ہے۔ اس میں جذبہ رشک کی کارفرمائیاں بھی ہیں اور شوخی و ظرافت کی چاشنی بھی۔ ان کے یہاں محبت کا مثالی تصور بھی ہے اور انسان کی عظمت کا شعور بھی۔ اس پیالے میں ہر رنگ کی شراب ناب ہے لیکن ایک موج زیرِ آب جو ان کے کلام میں اس سرے سے اس سرے تک بہتی ہے اور اکثر اوقات سطح سے بلند ہو کر نہ صرف اپنے وجود کو تسلیم کراتی ہے بلکہ اس پاس کی بظاہر بلند موجوں پر بھی حاوی ہو جاتی ہے عملی سوجھ بوجھ Practical Wisdom کی وہ بے پناہ خصوصیت ہے جو غالب کے فکر و فن کی اساس ہے۔

غالب کے جو بھی حالات منظرِ عام پر آ چکے ہیں ان کے مطالعے سے ہمیں ان کی زندگی میں ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے ان کی شخصیت کے عمل پسند پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ عمل پسند ہونے کی حیثیت سے غالب مومن کے برخلاف خارجی شخصیت کے مالک (Extrovert) تھے۔ وہ کثیر الاحباب تھے۔ ان کے حلقۂ احباب میں سنی شیعہ تو خیر ہندو اور انگریز بھی تھے۔ وہ کم آمیز نہیں بلکہ منفرد ([illegible]) تھے۔ اسی لئے تنہائی کے احساس کو دور کرنے کے لئے انھوں نے دوستوں سے خط کتابت کا سہارا ہی نہیں لیا بلکہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔ ان کے عمل پسند ہونے کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے فن کو نکھارنے اور سنوارنے کیلئے اپنے با مذاق دوستوں کے مفید مشوروں سے استفادہ کیا۔ انھوں نے

اپنے اشعار میں کنارہ ہی نہیں کی بلکہ خود اپنے قلم سے اپنے ابتدائی نتائج فکر پر خط تنسیخ کھینچ دیا
کلکتے کا واقعہ بھی ان کی عملی سوجھ بوجھ پر روشنی ڈالتا ہے۔ انھوں نے کلکتے میں حامیان قتیل سے جھگڑا
تو مول لے لیا (بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ حامیان قتیل نے آبیل مجھے مار پر عمل کیا) لیکن اپنے دوست نواب
اکبر علی اور مولوی محمد حسن کے مشورے سے مثنوی باد مخالف بھی لکھی جس میں انھوں نے اپنی طبیعت کے خلاف
قتیل کی تعریف کر کے حامیان قتیل کے سامنے دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ ایک مرتبہ جب شہزادہ جواں بخت کے
سہرے میں مقطع میں سخن گسترانہ بات آپڑی تو انہوں نے شاہ ظفر کے تیور دیکھ اور ذوق کا جوابی سہرا
سن کر جواب الجواب نہیں لکھا بلکہ اعتذار پیش کر کے معاملے کو رفع دفع کر دیا۔ یوں تو غالب نے عشق
پاکیزہ کا مثالی تصور بھی پیش کیا ہے لیکن اس سے قطع نظر ان کے نظریۂ محبت کا اندازہ تو اس خط سے
لگایا جا سکتا ہے جس میں انہوں نے حاتم علی مہر کو شہد کی نہیں بلکہ مصری کی مکھی بننے کا مشورہ دیا ہے۔ انہوں
نے اپنے آپ کو لے در لیغا وہ رند شاہد باز کہہ کر بھی یاد کیا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ رند
تھے اور تمام عمر رند رہے۔ انہوں نے اپنے سامنے زندگی کا کوئی بلند اور پاکیزہ نصب العین نہیں رکھا
لیکن یہ ان کی حوصلہ مندی، اخلاقی جرأت اور بے ریائی ہے کہ انہوں نے اس بات کا کھلے بندوں
اعتراف بھی کیا ہے کہ ۔ سرخود برستاں نمی خواہم ۔ وہ دبستان لکھنؤ سے تعلق رکھنے کے باوجود دلی
میں قحط الرجال ہونے کے بعد اپنے عزیز شاگرد میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں بالواسطہ دبستان
لکھنؤ کی برتری کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس راست گوئی اور اعتراف کا حوصلہ انہیں ان کی عمل پسند
طبیعت ہی نے عطا کیا تھا۔ انھوں نے اپنے عقاید پر دوستی کو قربان نہیں کیا اس کا اندازہ عقیدہ
امتناع النظیر خاتم النبیین سے متعلق اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جس کا ذکر مولانا حالی نے یادگار
غالب میں کیا ہے۔ انہوں نے محض اپنے دوست فضل حق خیرآبادی کی خاطر اپنے عقیدے کو لپیٹ
ڈالا۔ فی زمانہ یہ بات شاید بہت معمولی معلوم ہو۔ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ واقعہ اس ماحول میں
پیش آیا ہے جہاں مذہبی عقیدے کی بنیاد پر بھائی بھائی کا باپ بیٹے کا اور دوست دوست
کا جانی دشمن ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ غدر کے بعد اپنی جان بچانے کے لئے انہوں نے ایک انگریز
افسر کے سامنے جو خود کو آدھا مسلمان ظاہر کیا تھا تو دراصل یہ واقعہ ان کی طبعی ظرافت پر ہی روشنی
نہیں ڈالتا بلکہ ان کی شخصیت کے عمل پسند پہلو کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ یہ ان کی دور رس نگاہ

اور عمل پسند طبیعت ہی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے آئین اکبری پر صاحبان انگلستان کے آئین
کو ترجیح دی اور مردہ پروری کو نامبارک فعل قرار دیا۔ جب انھیں پتہ چلا کہ انگریزوں نے ظفر
کے ولی عہد کو ظفر کے بعد بادشاہ تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے تو انہوں نے فرماں روائے
انگلستان کی شان میں قصیدہ لکھ کر کوین پوئٹ بننا چاہا اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ غالب غدار
وطن تھے۔ انتہائی بے سروپا بات ہے۔ وطن کا موجودہ تصور غالب کے زمانے میں موجود نہیں
تھا یہ فعل تو ان کے حقیقت پسندانہ رجحان کا آئینہ دار ہے اور بس۔ غالب کے نزدیک تو
یہ ایسا تھا جیسے ایک دربار کا رنگ پھیکا پڑتے دیکھ کر کوئی شاعر دوسرے دربار سے منسلک
ہو جائے ـــــ ۔

فن نہ صرف زمانے کا بلکہ فنکار کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب
ہوگا کہ فن زمانے سے متاثرہ شخصیت کی ترجمانی کرتا ہے۔ فن کے آئینے میں فنکار کی شخصیت
کے جلوے کا نظر آنا ناگزیر سی بات ہے حتیٰ کہ غزل میں بھی جاندار شخصیت کا عکس دکھائی دیتا
ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غزل کا مزاج سراسر داخلی ہے۔ یہ صرف تاثرات کی زبان
ہے جس میں بادہ و ساغر اور گل و بلبل بطور علائم استعمال ہوتے ہیں۔ اس لئے فنکار
کے خیالات ان علائم کے پردے میں روپوش ہوتے ہیں۔ پھر بھی چونکہ یہ خیالات اور
تاثرات فنکار کے تجربے کی بھٹی میں گلے ہوئے اور اس کے تحت الشعور کی گود میں پلے ہوئے
ہوتے ہیں اس لئے بعض اوقات بآسانی مگر اکثر بہ مشکل وہ اپنے انداز قد سے پہچانے جا
سکتے ہیں بشرطیکہ فنکار کی شخصیت کے بنیادی عناصر کا علم ہو جائے۔ غالب کی شخصیت
ہمارے لئے جانی پہچانی شخصیت ہے۔ یوں تو اس کی پیچیدگی کو سمجھنا جوئے شیر لانے کے
برابر ہے لیکن ہم اتنا تو بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ اس شخصیت کا بڑا مظہر ان کی عملی سوجھ بوجھ
ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ یہ خصوصیت ان کے کلام میں کسطرح جھلکتی ہے ـــ ۔

ان کی عملی سوجھ بوجھ جام جم جیسی نادر شئے کے مقابلے میں جام سفال کو صرف اس لئے
ترجیح دیتا ہے کہ اگر یہ ٹوٹ گیا تو پھر بازار سے خریدا جا سکتا ہے۔ سخت سے سخت واقعے
کی تاب لانا ان کے لئے اشد ضروری اس لئے ہے کہ انھیں اپنی جان سب سے زیادہ پیاری ہے

تاب لائے ہی بنے گی غالب — واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

اس طرح سوچنا ایک عمل پسند طبیعت ہی کا خاصہ ہے۔ وہ جنت کے وجود کو خیالی اور اس کے تصور کو وہی بہلاوے کی چیز اسلئے سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہی نہیں اور تو اور اگر وہ قد یار کا عالم اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتے تو قیامت کے بھی وجود سے انکار کر دیتے ؎

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم — میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

ان کا نظریۂ محبت بھی سراسر عملی ہے۔ ایک عمل پسند انسان ہونے کے باعث وہ ہجر کے مقابلے میں وصل کو ترجیح دیتے ہیں اور معشوق شوخ کے قائل۔ ایسا وصل ان کی نظر میں ہجر کے برابر ہے جس میں ایک طرف محبوب شان بے نیازی دکھائے اور دوسری طرف عاشق ضبط سے کام لے سکتے ہیں ؎

ہے وصل ہجر عالم تمکین و ضبط میں — معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیئے

ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

خو نے تری افسردہ کیا وحشت دل کو — معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

معشوق اگر بے حوصلہ ہو تو غالب جیسا عملی عاشق اسے کیوں پسند کرنے لگا۔ ان کی عمل پسندی نے ان کے تصور حسن کی بنیاد بھی افادیت پر رکھی ہے۔ چونکہ نزاکت افادی نقطۂ نظر سے کوئی اہمیت نہیں رکھتی اس لئے وہ از حد نازک محبوب کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے ؎

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا — ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

یہ رند شاہد باز تو ایسے وصل کا قائل ہے جس میں عاشق کے بازو پر محبوب کی زلفیں بکھری ہوں۔ اسی لئے تو وہ جذبۂ عشق کو پرستش قرار دینے والوں کو احمق قرار دیتے ہیں ؎

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار — کیا پوجتا ہوں اس بت بیداد گر کو میں

اور یہ جذبۂ عشق کا پرستار اور خواہش پرست عاشق بیقرار ہو کر کہہ اٹھتا ہے ؎

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس — زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے
اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے

یہی وجہ ہے کہ وہ محبت میں شوق فضول و جرأت رندانہ کے قائل ہیں۔ زندگی ان کی نظر میں فانی سہی لیکن اگر معشوقوں کی صحبت میسر آجائے تو یہی کیا کم ہے ؎

غنیمت صحبت خوباں ہی غنیمت سمجھو نہ ہوئی غالب اگر عمر طبیعی نہ سہی

وہ زلیخا کی طرح خواب میں وصال محبوب کے قائل نہیں فرماتے ہیں

ابھی آتی ہے بو بالش سے اس کے زلف مشکیں کی ہماری دید کو خواب زلیخا عار بستر ہے

اس لئے جب کلکتے کی نازنین بتان خود آرا کی یاد آتی ہے تو ہائے ہائے پکار اٹھتے ہیں۔ وہ اپنے محبوب کا وصل ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ حتیٰ کہ یہاں ان کا جذبۂ رشک بھی مدھم پڑ جاتا ہے ؎

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

ایک جگہ تو یہاں تک کہہ اٹھے ہیں ؎

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے ؎

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے

بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو مل جاؤ قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی

یوں تو وہ محبوب کے وصال کے آرزومند ہیں لیکن اگر یہ میسر نہ ہو تو محبوب سے کسی نہ کسی طرح رابطہ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

لاگ ہو تو اسکو ہم سمجھیں لگاؤ ‏ ‏ گر نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو ‏ ‏ یہ نگاہ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

وہ اپنے محبوب کو اپنی آنکھوں کے سامنے چاہتے ہیں۔ مال عرب پیش عرب۔ وہ خط سے جو نصف ملاقات کا درجہ رکھتا ہے۔ مطمئن نہیں۔ فرماتے ہیں ؎

غلط نہ تھا مجھے خط پر گماں تسلی کا ‏ ‏ نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

وہ صرف دیدار سے بھی مطمئن نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنے محبوب سے بات چیت بھی کرنا چاہتے ہیں

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا ‏ ‏ بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

جب ان کے دوست احباب ان کے سامنے ان کے محبوب کا تذکرہ کرتے ہیں تو وہ اس تذکرے سے کوئی خاص لطف حاصل نہیں کرتے۔ یہ تذکرہ تو انھیں اسوقت مزہ دے گا جب ان کے دوست غالب کے محبوب کو آتے ہوئے دیکھکر گھبرا جائیں اور گھبرا کر کہہ اٹھیں "وہ آئے"

کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے ‏ ‏ اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ "وہ آئے"

عاشق ہوتے ہوئے بھی معشوق فریبی ان کا نام ہے یہاں تک کہ انکے آگے لیلیٰ بھی مجنوں کو برا بھلا کہنے لگتی ہے۔ علی الانسان ہونے کی وجہ سے وہ محبوب سے گلہ بھی اسی وقت کرتے ہیں جب انھیں کوئی امید ہو ؎

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ ‏ ‏ کیا کسی سے گلہ کرے کوئی

رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی ‏ ‏ تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

غالبؔ کا جذبۂ رشک اپنی جگہ مسلم۔ جب ان پر یہ جذبہ طاری ہوتا ہے تو وہ اپنے محبوب کو خدا تک کو سونپنے سے ہچکچاتے ہیں۔ لیکن جب ان میں عمل پسند غالب جاگ اٹھتا ہے جو ہر فعل کا تجزیہ کرتا ہے اور اسے عقل و تجربے کی کسوٹی پر پرکھنا جانتا ہے۔ تو وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ سچ۔ عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا۔ رقیب کو غمازی سے روکنے کے لئے کیا اچھی ترکیب نکالی ہے اور ترکیبیں انہی کو سوجھتی ہیں جو عملی

یوں کہتے ہیں ۔

دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا　　تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو

ان کی عمل پسندی بلند سطح پر پہنچ کر ان سے کہلواتی ہے ۔

جان تم پر نثار کرتا ہوں　　میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

یعنی وہ دعا کے نہیں بلکہ جان دینے کے قائل ہیں یعنی فعل کو قول پر ترجیح دیتے ہیں ۔ اسی طرح وہ اپنے محبوب کو اپنا حال دل لکھ کر بتانے کی بجائے اس کا ٹھوس عملی ثبوت پیش کرنا ہے زیادہ پسند کرتے ہیں ۔

انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا　　درد دل لکھوں کب تک جاؤں انکو دکھلادوں

ایک عمل پسند آدمی کی نظر ہر شئے کے افادی پہلو پر ہوتی ہے ۔ چاہے وہ چیز کتنی ہی معمولی یا بری کیوں نہ ہو غالب نے جسطرح جام سفال کو جام جم پر ترجیح دی ہے اسی طرح ان کی حقیقت پسند نظریں کثافت کی اہمیت کو بھی دیکھ لیتی ہیں بلکہ اس حقیقت کا ادراک ہو جاتا ہے کہ لطافت کے اظہار کے لئے کثافت ضروری ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہے ۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی　　چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا

کوہکن ان کے نزدیک عملی عاشق نہیں اسی لئے ناکام ہے کیونکہ آ تنگ سے سر مار کر پیدا ہونے آشنا عمل پسند ہونے کی وجہ سے شخصیت پرستی ان کا شیوہ نہیں وہ خضر کی رہبری اس لئے تسلیم نہیں کرتے کہ انہوں نے سکندر کے ساتھ جو کیا ظاہر ہے ۔ وہ تو اپنے محبوب کی مسیحا نفسی کو بھی اسی وقت ماننے کیلئے تیار ہیں جب ان کے دکھ کا علاج کب جائے یعنی اس کا عملی ثبوت پیش کیا جائے ۔

میرے دکھ کی دوا کرے کوئی　　ابن مریم ہوا کرے کوئی

ایک داخلیت پسند (Introvert) انسان کو اپنے گھر اور وطن سے گہری محبت ہوتی ہے ۔ وطن سے یہاں مراد مقام پیدائش ہے ۔ غالب کے زمانے میں وطن کا یہی تصور تھا۔ لیکن چونکہ غالب عمل پسند انسان تھے اس لئے سعدی کی طرح انہیں اپنے وطن سے اتنی گہری محبت نہ تھی ۔ کہ وہ اسے کسی حالت میں ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوں ۔

سعدیا حب وطن گرچہ حدیثیست ولے نتواں مُرد بہ سختی کہ من اینجا زادم

ذوق کو باہر سے بلاوا آیا تو وہ یہ کہہ کر کہ ع ۔ کون جائے ذوق اب دلی کی گلیاں چھوڑ کر۔ ترک وطن کا ارادہ نہ کر سکے لیکن غالب تو زندہ رہنے کیلئے دلی کو بھی خیرباد کہہ سکتے تھے ۔ ع "ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا" جب اضمحلال ہے بہری یاران وطن یاد آتی ہے تو وہ غربت کی صعوبتوں کو ہنس ہنس کر جھیل جاتے ہیں ـــ ۔

اب ان کی شراب نوشی کی طرف آیئے ۔ دیکھئے یہاں بھی ان کی عمل پسند شخصیت غیر شعوری طور پر کیسے کیسے مضمون سجھاتی ہے ۔ جام سفال کی افادیت کا ذکر ہو ہی چکا ہے یہ تو بہرحال ظرف ہے لیکن وقت پڑنے پر ایک عمل پسند آدمی تو مظروف کو ظرف پر ترجیح دیتا ہے ہے ۔

پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

ان کی نظر میں ساقی کی حیثیت بھی ثانوی ہے اگر کسی دن بزم میں ساقی نہ ہوا تو نہ سہی ۔

مے پرستاں خم مے منہ سے لگائے ہی بنے ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

ظاہر ہے کہ ایسا عمل پسند آدمی شراب طہور کو کیا خاطر میں لائیگا جس کا نام ہی نام ہے ۔ اس لئے کہہ اٹھتے ہیں ؎

واعظ نہ پی سکو نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

مذہبی معاملات میں بھی ان کی عمل پسند طبیعت اوامر و نواہی سے ابا کرتی ہے اس لئے ثواب طاعت و زہد جاننے کے باوجود ان کی طبیعت ادھر نہیں آتی ۔ وہ تو کہتے ہیں ع ۔ رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھکر ۔ ایسی صورت میں سبحہ و صد دانہ کے مقابلے میں وہ زنار کو سبحہ پر اس لئے ترجیح دینے پر مجبور ہیں کہ سبحہ صد دانہ ہے ۔ اسکو اختیار کرنے پر مثبت و منفی احکامات پر عمل کرنا پڑتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ غالب جیسا بادہ خوار صوفی ایسی پابندیوں سے کیوں نہ گریز کرتا ۔ اب روزے ہی کو لیجئے ۔ روزہ رکھنا اور کھونا غالب کو اس وقت لطف دیتا ہے جب خسخانہ و برفاب ہوں ۔ ان کے نہونے پر وہ مجبوراً روزے کھانے لگے ۔ حج جیسے اہم رکن اسلام کی مذہبی اہمیت و افادیت

ان کی نظر میں کچھ نہ تھی ۔ وہ تو حج اس لئے کرنا چاہتے تھے کہ سیر ہو جائے گی ۔ بہادر شاہ ظفر سے فرماتے ہیں ؎

غالب اگر سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں   حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

وہ عمل پسند شہر سے انہیں معلوم ہے کہ فرشتے احساس کمتری کے شکار ہیں ۔ کیا پتہ کراماً کاتبین انسان کے کارناموں کو کس رنگ میں پیش کریں ۔ غالب اس یک طرفہ کاروائی سے خوش نہیں ۔ اس لئے وہ دمِ تحریر اپنا آدمی چاہتے ہیں ؎ .

ایک عمل پسند انسان غمِ روزگار سے پہلو تہی نہیں کر سکتا ۔ سودا نے فکر معاش کا واضح طور پر ذکر کیا ہے ۔ غالب نے بھی غمِ عشق کے علاوہ غمِ روزگار کے وجود کو شدت سے محسوس کیا ہے ۔ فرماتے ہیں ؎

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں   تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی   وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

مختصر یہ کہ غالب ایک عمل پسند انسان تھے اور ان کی شخصیت کا یہ بنیادی رجحان غزل کے دبیز پردوں سے بھی جھانکتا ہے ۔ وہ ع "مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے" کے قائل تھے نا اور ع "کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے" ان کی زندگی کا اصول تھا ان کی عمل پسند طبیعت یہ بھی جانتی تھی کہ بڑے سے بڑے آدمی کے مرجانے سے بھی دنیا کے کاروبار نہیں رک جاتے ۔ اس لئے تو وہ کہہ گئے ع

"غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں"

یہ بات اپنی جگہ پر ایک حقیقت سہی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر غالب نے غزل کو وقار اور نئی بلندیاں نہ دی ہوتیں تو اردو غزل کا ارتقا اس قدر تیزی سے نہ ہوتا اور وہ ہمیں اس مقام پر نظر نہ آتی جہاں ہم اسے آج دیکھتے ہیں

ریاض خیرآبادی اور ان کی شاعری

از:- ..... پروفیسر افتخار احمد فخر دھرلیوی ایم اے (ایم جے کالج جلگاؤں)

۱۸۵۳ء میں ریاض کی ولادت خیرآباد ضلع سیتاپور میں ہوئی اور اس جہان آب و گل میں ایک مدت تک وہ حالات سے جنگ کرتے رہے۔ ۲۰ جولائی ۱۹۳۴ء میں داعی اجل کو لبیک کہتے ہیں۔ ریاض نے جب ہوش سنبھالا لکھنوی شاعری شباب پر تھی آغاز [illegible] اسیر کے شاگرد ہوئے لیکن بعد میں ان کے جانشین حضرت امیر مینائی سے وابستہ ہوگئے۔ وہ امیر مینائی سے بے انتہا عقیدت بھی رکھتے تھے۔ اس کے باوجود شاعری میں داغ کا تتبع کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری پر داغ دہلوی کا گہرا اثر صاف اور واضح طور پر نظر آتا ہے۔ رامپور میں داغ مرحوم کے علاوہ دیگر دربار رامپور کے شعراء کے ہجوم میں ریاض بھی تھے اور شاید ان کی شاعری پر داغ کی شاعری کی گہری چھاپ جو ہم کو نظر آتی ہے یہ اسی کا اثر ہو۔ ہر چند کہ ریاض کی شاعری بھی روایتی اور گل و بلبل کی شاعری ہے اور جس میں رعایت لفظی کے محور پر تمام چیزیں گھومتی ہیں لیکن ان کا کوئی شعر ایسا نہیں ہے جس میں زبان و اسلوب کا رکھ رکھاؤ نہ ہو اور شوخی بیان نے اس میں ایک قسم کی نشتریت نہ پیدا کردی ہو۔ بہرحال ہمیں ریاض کو سمجھنے کیلئے اس عہد کی طرف لوٹنا چاہیئے جس میں ان کی شاعری نے خراج تحسین حاصل کیا۔ یہ وہ دور ہے جو دوسرے لفظوں میں واجد علی شاہ کا دور کہلاتا ہے۔ "اودھ اختر پیا" اور ان کے لکھنؤ کی اس وقت کی شاعری "وہی کنگھی چوٹی نئے معشوق، ہجر و وصال اور شیخ و زاہد" کے مضامین والی شاعری ہے چنانچہ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے کی لکھنؤ کی سوسائیٹی کا عکس ان کی تقلیدی اور روایتی شاعری میں ہمیں صاف نظر آتا ہے۔ لہذا ریاض کی شاعری کو اس کے دور کے پس منظر دیکھنا ہی انصاف کا تقاضہ ہے۔

پروفیسر فراق گورکھپوری نے ریاض کی شاعری پر بڑی جچی تلی رائے دی ہے ۔ فرماتے ہیں
"لکھنؤ کے دورِ انحطاط میں لکھنؤ کی سو برس کی بزم آرائیاں سمٹ کر ان کی (ریاض کی) شخصیت
میں سما گئی تھیں اور وہ تمام بانکے اور ماہ پارہ عورتیں جنھوں نے کبھی لکھنؤ کو لکھنؤ بنا دیا تھا ۔ سب کی سب
ریاض کی زندگی کا جزو بن گئے تھے ۔ سو برس کے لکھنؤ نے اپنے آخری لمحوں میں ریاض کے اوپر اپنے آپکو
صدقے کر دیا ۔ لٹا دیا ، پورا لکھنؤ سمٹ کر ریاض بن گیا ۔ ہر دور انحطاط میں یہی ہوتا ہے ۔" بھڑکتا
ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے" مٹتے مٹتے وہ بے جان جھوٹ جس کا نام لکھنؤ تھا ایک
جیتا جاگتا چلتا پھرتا سچ بن گیا ۔ ریاض کے روپ لو بھیس میں جس تاثر ، خلوص اور انفعال کا فقدان
لکھنؤی زندگی اور شاعری میں ملتا ہے ۔ اس کی نفی کی نفی "Negation of negation"
ریاض تھے ۔"

جیسا کہ ابھی اوپر بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنی شوخی بیان کی وجہ سے نشتریت پیدا کرتے رہتے ہیں
اور اس دورِ انحطاط کی روایتی اور ابتذال کی حدوں کو چھوتی ہوئی شاعری میں بھی جو کہ انحطاط کی وجہ سے لازمی
طور پہ پیدا ہوہی جاتی ہے ۔ ریاض اپنی شوخیٔ بیان کی وجہ سے منفرد مقام رکھتے ہیں ان کے اندازِ بیان
کا بے ساختہ پن ، حلاوت اور شیرینی ، زبان کی روانی اور طراری میں فصاحت کا مزہ ملتا ہے ان کا چلبلا پن
کبھی کبھی تو محاکات کی بہترین تصویریں کھینچ دیتا ہے ۔ وہ کبھی کبھی تو حالات حسن و عشق کو بڑی بے باکی سے
اشعار کا جامہ پہنا دیتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام سے ہر مکتبِ خیال کے لوگ اور ہر طبقے کے
افراد لطف اندوز ہو سکتے ہیں ۔ ذیل کے اشعار سے کسی حد تک اس خیال کی تصدیق ہو جائے گی

تم اپنے بام سے فریاد کی اجازت دو ∴ بیاں نے تو نہیں سنتا ہے آسماں میری
چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی ∴ تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی
جب سے ہیں تجھ مری آغوش میں وہ حشر کے دن ∴ یہ وہی ہیں جنھیں پیمانِ وفا یاد نہیں
کیا جانے بات پہنچے یہ کس کس کے کان تک ∴ مجھکو دبی زبان سے کوسا نہ کیجیے !
منہ چوم لوں یہ کس نے کہا مجھ کو دیکھکر ∴ دیوانہ تھا ہی اور بھی دیوانہ ہو گیا
دبی زبان سے میرا بھی ذکر دینا ∴ کلیم طور پہ ان سے جو گفتگو آئے
نزع میں یاد سے ایسے پیمانِ وفا کرتے ہیں ∴ اس دغا باز سے ہم آج دغا کرتے ہیں

آنچل ڈھلا ہوا ہے مست شباب کا ؛ اوڑھا گیا کبھی نہ دوپٹہ سنبھال کے !
ڈرتے ہو چھوٹتے پائے حنائی سے قبر کو ؛ بیٹھو بھی تم سے حشر اٹھایا نہ جائے گا
ضد آپکو اثر سے اثر کو دعا سے لاگ ؛ فرمائیے تو ہاتھ اٹھا لیں دعا سے ہم

خمریات ریاض یہ عجیب سی بات ہوگی اگر "خمریات ریاض" کا ذکر نہ کیا جائے ؛ کیونکہ ریاض مرحوم کا ذکر آتے ہی ہمیں ان کے وہ اشعار یاد آجاتے ہیں، جن کا خمیر خمریات سے یا متعلقات بادہ وجام سے بنا ہے ان کی شہرت کی بڑی وجہ در اصل یہی خمریات کے عناصر خیالی ہیں۔ جس طرح داغ مرحوم عشق اور عشق کے معاملات کو نہ صرف یہ کہ مزے سے لے کر بیان کرتے ہیں، بلکہ اسے برتا بھی تھا برعکس اس کے امیر مینائی کا عشق تمام تر خیالی ہے بالکل اسی طرح ریاض کے شراب کے متعلق مضامین سراسر خیالی ہیں۔ مگر اپنے اشعار میں انھوں نے جام و شراب اور اس کی کیفیات کو اس شدت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہمیں دھوکا ہونے لگتا ہے۔ اور ہمارا گمان یقین کی حد تک پہنچ جاتا ہے کہ ان کو زندگی بھر شغل مے و مینا ہی سے سروکار رہا ہے، حالانکہ انھوں نے کبھی شراب کو منہ نہیں لگایا۔ ان کی خمریات میں ہمیں جو شوخی ملتی ہے وہ ان کے تمام اشعار پر چھائی ہوئی ہے چونکہ انھیں "خمریات" میں انھیں اپنی شوخی کے جوہر دکھانے کے زیادہ مواقع تھے۔ اسی لئے لوگوں نے انھیں "شاعر خمریات" کے نام سے زیادہ جانا ہے۔ بقول نیاز فتحپوری -

" ریاض کی شاعری یکسر رندانہ ہے اور اس مخصوص رنگ کیلئے جس قدر شوخی کی ضرورت ہے وہ ان میں (ریاض مرحوم ہی) بدرجہ کمال پائی جاتی ہے۔ پھر چونکہ رندانہ کلام کا لطف بھی خمریات ہی میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اس لئے وہ لوگ "خمریات" کے لحاظ سے زیادہ مشہور ہوئے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ شوخی کا جس حد تک تعلق ہے وہ خمریات اور غیر خمریات میں کامیاب نظر آتے ہیں اور حسن و عشق کی کامیاب زندگی اور واردات محبت کی سچی آفرینیوں میں مشکل سے کوئی دوسرا ان کا ہمسر پیش کیا جا سکتا ہے۔

ریاض کا یہ آرٹ الفاظ ہی تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے افسانوں کو حقیقت کا روپ دیا۔ جھوٹ کو اس انداز سے پیش کرنا کہ وہ سچ معلوم ہونے لگے یہی ان کا کمال ہے

اب ذیل کے اشعار کو ملاحظہ فرمایئے اور بتلایئے کہ کیا یہ مضامین تجربہ کار بادہ پرست کے نہیں ہیں؟
رچہ ان میں کیفیت کا عنصر کم ہے۔ مگر حقیقت کچھ یوں ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے یا
ود ریاض کی زبانی سنیئے۔

ہے ریاض آپ جو ان مست خرام ∴ نہ پیئے اور جھومتا جائے

اب آپ میخانہ ریاض سے چند جام ہائے رنگین کا لطف لیتے چلیں۔ ان کی شوخ بیانی
اور شگفتہ نگاری کی گہری چھاپ یہاں بھی نظر آتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ

جب دیکھئے تو ہے مئے و معشوق پر نگاہ ∴ یوں ہیں ہم ریاض بڑے پارسا بھی ہیں

ذرا یہ شوخی اور دخت رز سے تعلق خاطر کو بھی ملاحظہ فرمایئے

مر گیا ہوں پہ تعلق ہے یہ میخانے سے
میرے حصے کی چھلک جاتی ہے پیمانے سے

اور ذیل کے اشعار تو کما حقہٗ ہمارے خیال کی تصدیق کرتے ہیں جن میں شوخی بھی بدرجہ اتم موجود ہے

جام مے توبہ شکن، توبہ مری جام شکن ∴ سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے
توبہ سے ہماری بوتل اچھی ∴ جب ٹوٹی ہے جام ہو گئی ہے
مئے چرانے میں ہیں ہم ید طولیٰ کیسا ∴ ہم اڑا لائے سبو آج اچھوتا کیسا
جس دن سے حرام ہو گئی ہے ∴ مے خلد مقام ہو گئی ہے
شراب پیتے ہی مسجد میں ہم کو گرنا تھا ∴ یہ شغل بیٹھ کے اچھا تھا قبلہ رو کرتے
یہ وضع اپنی اور وہ دشنام مئے فروش ∴ سن کر جو پی گئے وہ مزا مفلسی کا تھا
نیچی داڑھی نے آبرو رکھ لی ∴ قرض پی آئے اک دکان سے آج

پارسا بن کے ریاض آئے ہیں میخانے میں
آپ بیٹھے ہیں بچائے ہوئے دامن کیسا

بنائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ہم خشت خم رکھ دیں ∴ جہاں ساغر ٹپک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے
یہ کیا مذاق فرشتوں کو آج سوجھا ہے ∴ ہجوم حشر میں لے آئے ہیں پلا کے مجھے

حاصل ریاض کی زندگی میں ریاض کو کبھی چین نصیب نہ ہوا، اس لئے ریاض خود دنیا کی تلخیوں سے

سے گھبرا کر مے و مینا کی خیالی دنیا میں پناہ لی تھی۔ وہ فطرتاً زندہ دل واقع ہوئے تھے خندہ روئی اور بذلہ سنجی ان کے مزاج میں داخل تھی اس لئے وہ بڑے باغ و بہار آدمی ہونے کے ساتھ ساتھ مرنجان مرنج تھے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ زندگی بھر پریشان رہے اور پریشان جئے ان کی شاعری تمام تر ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہے۔

ریاض کی شاعری میں تمسخر، اور ظرافت کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ موقع آنے پر وہ طنز و ظرافت کا تیر چلانے سے نہیں چوکتے، اس قسم کے اشعار بیشتر ان کے کلام میں وہاں نظر آتے ہیں جہاں انھوں نے واعظ اور شیخ کی خبر لی ہے۔ ویسے ہماری اردو شاعری میں کوئی شاعر واعظ، زاہد اور شیخ کو طنز و تمسخر کا نشانہ بنائے بغیر نہیں رہ سکا ہے۔ مگر ریاض کے یہاں ان کی شوخی نے وہ گل کھلائے ہیں کہ بس! پڑھیے اور لطف لیجئے۔ پہلے شیخ صاحب کی درگت ملاحظہ کیجئے۔

جناب شیخ الجھتے ہیں کس تعلق سے ∴ یہ دختِ رز کے کوئی رشتہ دار بھی تو نہیں
شیخ یہ کہتا گیا پیتا گیا ∴ ہے بہت ہی بدمزہ اچھی نہیں
شیخ جی میکدہ وہ جنت ہے ∴ تم بھی پی کر جوان ہو جاتے

اب ذرا واعظ ناداں کی تصویر دیکھئے

منہ بناتا ہے برا کیوں وقت وعظ ∴ آج واعظ تو نے پی اچھی نہیں۔
سر بزم واعظ سے دینا پڑا ∴ وہ خم سے بھلا تھا تن و توش میں
وہ آ رہا ہے عصا ٹیکتے ہوئے واعظ ∴ بہا دے اتنی کہ ساقی کہیں نہ تھام لے

لگے ہاتھوں زاہد شب زندہ دار کا عالم بھی ملاحظہ فرمائیے

اللہ رے شغل زاہد شب زندہ دار کا ∴ پی پی کے اس نے سجدے کئے ہیں تمام رات
زاہد وہ حور کے دامن میں ہے چھپائی ہوئی ∴ پاک و صاف ایسی ہے جسے پی فرشتہ ہو گیا

شیخ صاحب سے متعلق ذیل کے اشعار بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔

شیخ جی اچھی ہے یہ دستار رہنے دیجئے ∴ اپنے سر سے گنہ کا بار رہنے دیجئے
جناب شیخ نے جب پی تو منہ بنا کے کہا ∴ مزہ بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں

چمن چمن کے آج شیخ نے انگور کھالئے ∴ اب کیا کھنچیگی تاک کا حاصل نکل گیا
ہماری نظر حشر میں شیخ پر تھی ∴ وہ سر پر لئے حوض کوثر نکلے
اے شیخ تو چڑکے بے جب بھی ہے ∴ تیری طرح کسی کی نہ نیت خراب ہو

گورکھپور۔

ریاض مرحوم کا ذکر ادھورا رہ جائے گا اگر گورکھپور سے تعلق خاطر کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ گورکھپور اور ریاض لازم و ملزوم ہیں۔ ریاض کو گورکھپور سے خاص قلبی لگاؤ رہا ہے۔ نہ صرف یہ کہ انھوں نے گورکھپور کی خاک چھانی نہ تھی۔ بلکہ انھیں گلیوں میں اپنی جوانی بھی کھوئی تھی۔ دیکھئے کس حسرت سے گورکھپور اور اس کی گلیوں کو یاد کرتے ہیں۔ —

جوانی جن میں کھوئی ہو وہ گلیاں یاد آتی ہیں ∴ بڑی حسرت سے لب پر ذکر گورکھپور آتا ہے

یوں تو ریاض نے اپنے آخری ایام زیادہ تر خیرآباد اور لکھنؤ میں گزارے جس کا اندازہ کسی صورت میں ۳۰ سال سے کم نہ ہوگا۔ مگر کسی نہ کسی بہانے اپنے زخم کہنہ کو تازہ کرنے گورکھپور بھی ہو آیا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ وہی گورکھپور ہے جس نے ان کی جوانی کیلئے جولانگاہ مہیا کی تھی اور ان کی شاعری کو خون جگر عطا کیا تھا جس کے نتیجے میں انھوں نے اپنی شاعری اور فن کے حسین نقوش یادگار چھوڑے جیسا کہ بقول اقبال "نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر" اور گورکھپور ہی کے طفیل ریاض کو خون جگر کی کمی محسوس نہ ہوئی۔ انھوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ اس خطے سے جوان ہی پایا۔ عارضی طور پر ہی سہی جیسا کہ ایک جگہ اور فرماتے ہیں۔

اے ریاض اس طرح آجاتا ہے دو دن کو شباب
داغ کہنہ تازہ کرلاتے ہیں گورکھپور سے۔

یہ حقیقت ہے کہ اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ ریاض نے گورکھپور میں ہی بسر کیا ہے اسی باعث وہاں کی یاد کو دم آخر تک سینے سے لگائے رہے۔ ذیل کے اشعار سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے کہ ریاض مرحوم کو گورکھپور سے کس قدر محبت تھی اور کیسے البیلے انداز میں وہ گورکھپور کو یاد کرتے ہیں

پکارتے ہیں یہی دل فریبیاں اس کی ∴ کہ آ گئے ہو جیسے جانانہ آئے گورکھپور

گورکھپور سے انکا عشق بے معنی نہیں تھا چنانچہ ذرا کھل کر اس طرح فرماتے ہیں۔

حسین لگائیں منگا کر حناے گورکھپور ∴ ہم اپنے خون تمنا سے سینچ آئے ہیں

صاف اور واضح طور پر ریاض نے بتادیا کہ گورکھپور کی یاد انھیں کیوں بے چین کردیتی ہے آگے چل کر وہ خود ہی بتاتے ہیں کہ وہ اس قدر بند اکیوں ہیں۔

کہ اک جہان جدا ہے اداے گورکھپور ∴ اودھ کی شام بنارس کی صبح ہو صدقے

الغرض انھوں نے اپنی شاعری سے گورکھپور کو ضرور غیرفانی بنادیا۔

ایک جگہ انھوں نے اپنی اس آخری خواہش کو یوں ظاہر کیا تھا کہ

ریاض اب کیا کریں اس شہر کا اب قصد جانے کا

نصیبوں میں لکھا ہے خاک گورکھپور ہوجانا

مگر افسوس صد افسوس کہ انکی یہ آرزو پوری نہ ہوسکی اور وہ اپنے وطن خیرآبادی میں ۳۰ جولائی ۱۹۳۴ء کو سپرد خاک ہوئے۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

ذیل میں ان اشعار کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جہاں ان کی شوخی متانت کی حدوں کو توڑ کر برہنگی اور عریانیت کی حدود کو چھولیتی ہے۔ اور ایک قسم کا ابتذال نمایاں ہوجاتا ہے ہرچند کہ وہ اشارات وکنایات کے ماہر ہیں تاہم ان کی خارجیت میں جب داخلی بیانات بھی شامل ہوکر بیباکی اختیار کرلیتے ہیں تو وہ تہذیب سے باہر ہوجاتے ہیں اور خوب کھل کھیلتے آئے ہیں۔ لیکن ایسے اشعار کو ہم بازاری اور سوقیانہ نہیں کہہ سکتے، کیونکہ ان میں ایک قسم کا حسن ہے ایسا حسن جو بادہ سرجوش کی سرمستیاں رکھتا ہے۔ اور لطف سے خالی نہیں۔ تفنن طبع کے لئے درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

آفت ہیں کمسنی کی ادائیں شب وصال ∴ کیسے وہ خوش ہیں پاس سے پھر اکے ہاتھ

باہم شب وصال کے لوٹے ہیں وہ مزے ∴ وہ بھی یہ کہتے ہیں الٰہی سحر نہ ہو!

ہاں ہاتھوں نے لیا ہونٹوں نے اذن چین لیا ∴ تمکے قابو میں لٹا آپ کا جوبن کیسا

کوئی منہ چوم لیگا اس نہیں پر ∴ شکن رہ جائے گی یونہی جبیں پر

اس طرح تم کہ کنگرو کوئی جیا گل کا نہ بولے ∴ جب چم سے جلیں گودیں چپکے سے اٹھالو

سمجھتے ہیں چھپ جائیں گے راز شب کے ∴ وہ جوڑا جو کھلے پھر باندھتے ہیں

یہ گوارا کہ مرا دست تمنا باندھے ∴ اپنے محرم کو نہ کس کر تو کوئی اتنا باندھے

وصل کی رات نہیں چین سے سونے کے لئے ∴ آ رہی ہے یہ حیا ہی یہ حیا بھی کیسی

کسی سے وصل میں سنتے ہی جان سوکھ گئی ∴ چلو ہٹو بھی، ہماری زبان سوکھ گئی

تمام شب وصال مری بیقراریاں ∴ انکار دل زباں سے کہنا ابھی نہیں

سحر ہوتے وہ اپنا چاک دامن سی کے بیٹھے ہیں ∴ رفو کرنے کو تار دامن مریم نکلتا ہے

مجھ سے بڑھ کے ہیں گستاخ دست شوق مرے ∴ نہ کیجئے گا ذرا ہاتھ اٹھا اٹھا کے مجھے

ہم لاکھ پارساؤں کے اک پارسا سہی ∴ موقع سے تم کو پائیں تو بتلاؤ کیا کریں

نکال دوں گا شب وصل بل نزاکت کے ∴ ڈرا لیا ہے بہت تیوریاں چڑھا کے مجھے

ابتذال سے قطع نظر جہاں کنایات اور رمز و اشارات ہیں وہاں پر لطف دوگونہ ہو جاتا ہے کہ ع برہنہ حرف نگفتن کمال گویائی است۔ آخر میں ہم قارئین کرام کیلئے ریاض کے اشعار کا ایک ایسا انتخاب پیش کر رہے ہیں جو ان کی "خمریات" سے نہیں مگر ان اشعار سے ہم ان کی شاعرانہ خصوصیات اور رنگ سخن کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔

غم مجھے دیتے ہو دشمن کی خوشی کے واسطے ∴ کیوں برے ہوتے ہو تم ناحق کسی کے واسطے

بڑے پاک باطن، بڑے صاف طینت ∴ ریاض! آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

نہ دیکھے تھے کبھی جو نظر اٹھا کے مجھے ∴ وہ دیکھتے ہیں دم حشر مسکرا کے مجھے

گلا میٹھا ہوا، خدمت اذاں کی وہ بھی کعبہ میں ∴ کھلے سے ہم دبا لائے تھے ناقوس برہمن کو

عالم ہو میں اک آواز سی آ جاتی ہے ∴ چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا

کیا قیامت ہے شب وصل خموشی اس کی ∴ جس کی تصویر کو بھی ناز ہے گویائی کا

گل مرقعے ہیں ترے چاک گریبانوں کے ∴ شکل معشوق کی انداز ہیں دیوانوں کے

تمہارے کوچے میں کچھ طور والے بیٹھے ہیں ∴ ذرا تم آ کے لب بام مسکرا دینا

جب حال کہا تو یہ سننا پڑا ہمیں ∴ تم تو سنا رہے ہو فسانہ سنا ہوا!

وہی ہم ہیں نہ چھوڑا تار تک اپنے گریباں کا ∴ وہی ہم ہیں کہ اب ٹکڑے لئے دامن کے بیٹھے ہیں

جاؤں کیا گرمی گفتار سے جی ڈرتا ہے ∴ طور کو پھونک نہ دے شعلۂ آواز کہیں
سحر ہوتی ہے ٹھہر رات آخر وقت آخر ہے ∴ نہ جاؤ! ختم ہوتی ہے کہانی دیکھتے جاؤ
تمہیں کیونکر بتاؤں کیا گزرتی ہے مرے دل پر ∴ تمہیں کیوں کر دکھاؤں تم میں کیا عالم نکلتا ہے
حسن پُر احسن تبسم، جانِ حسن ∴ جب ہنسیں منہ چوم لینا چاہیئے۔
دامن اٹھائے صبح قیامت سے بھاگتا ∴ آئے ہیں جلوہ گاہ سے وہ خواب گاہ میں
ریاضؔ اک عمر گزری دیر میں آئے گرا تیک ∴ حرم میں گو بختی پھرتی ہے راتوں کو اذاں میری
ریاضؔ ایسا گیا گزرا انہیں جو شان جانے دے ∴ گدائی کے لئے بھی لے کے جام جم نکلتا ہے
شمع بھی محفل میں ہے پروانہ بھی محفل میں ہے ∴ تم بھی ہو ہم بھی ہیں لیکن بات دل کی دل میں ہے
وہ بیخود ان عشق کو عشرائیں تو ہی سی ∴ ابھی کبھی کہ ہوش میں آیا نہ جائے گا۔
نازک کلائیوں میں حنائی ہتھیلیاں ∴ شاخوں میں جیسے ہیں مہندی کلیاں گلاب کی
بتوں کو دیکھ کے اللہ یاد آتا ہے ∴ وہ دن گئے وہ محبت گئی وہ پیار گیا

کعبہ، سنتے ہیں کہ گھر ہے بڑے داتا کا ریاضؔ
زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا
کیجیے کیا اسے، ہے موت بھی ان کے بس کی
زہر ہم کھائیں گے تو بھی ہمیں جینا ہوگا



ایک شخص :۔ حکیم صاحب جب بھی آپ قبرستان میں سے گزرتے ہیں، منہ کیوں چھپا لیتے ہیں۔؟

حکیم صاحب :۔ کیا کہوں حضرت! مجھے ان مُردوں سے شرم آتی ہے کیونکہ یہ سب میرے علاج سے یہاں پہنچے ہیں۔

جامی

شعورِ فن کا نیا سویرا

اوج یعقوبی

ملک کے ممتاز ادیب اختر حسن خورشید احمد جامی کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ "اس نے غزل کو اپنے فن کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے"۔ عام شاعر کیلئے غزل کو اظہارِ فن کا ذریعہ بنانا کوئی خاص بات نہیں ہے۔ لیکن کسی مبصر کا ایسی عام بات کو دہرانا سستی بات ہے۔ میری رائے میں جامی کو چند ان گنے شاعروں میں شمار کیا جانا چاہیئے جنھیں غزل کی بے پناہی اپنی نئی گنجائشوں کیلئے خود منتخب کرتی ہے۔

جامی کے شعری ادب کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد صرف یہی کہنے پر اکتفا کرنا کہ ان کا لب و لہجہ عام غزلوں سے مختلف ہے۔ ایک چھوٹا سا اعزاز ہوگا۔ وگرنہ منصفانہ نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ جامی نے اردو زبان میں غزل کے نام سے کئی نئے اور خوبصورت تجربے کئے ہیں بلکہ لفظوں کی گہرائیوں میں اتر کر اچھوتے حسین اور قرینِ قیاس مفاہیم کی تلاش کی بدولت یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ انھوں نے ایک علیحدہ زبان مرتب کرلی ہے۔ نئی نئی ترکیبوں کے ذریعہ ایک نئے لب و لہجہ کو جنم دیا ہے دنیائے شعر کی بے شمار آوازوں میں اپنی آواز کو پالینا ہی جہاں بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ وہاں جامی نے آوازیں سننے کے فرسودہ طریقہ کار سے بغاوت کرکے "نئی آواز" بنانے کا کارنامہ انجام دیا ہے۔

کم و بیش کوئی تیس برس کی بات ہوگی جب میں ایک منتشر لڑکا اور جامی ایک مرتب نوجوان تھے۔ یوں ہی رفتہ سے ان کی نظر میں ہوں اور وہ میرے مطالعہ میں۔ لیکن ان کی نظر اس وقت بھی پختہ تھی جنانچہ ان کی بالکل ابتدائی شاعری کے کچھ شعر مجھے اب تک یاد ہیں۔

مجھ کو میرا سیتہ نفس منت ٭ بے خودی کچھ بتا کہاں ہوں میں
ناز کرتا ہے مجھ پہ ویرانہ ٭ حاصل سعی رائیگاں ہوں میں

ایک غزل کے دو شعر ہے

ان سے پھر رسم و راہ ہوتی ہے : دل کی دنیا تباہ ہوتی ہے
اب یہ حالت ہے ہجر میں تیرے : رات دن آہ آہ ہوتی ہے

میں کامل وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ غزلیں جامی کی شاعری کے عہدِ طفلی کی اولین غزلیں ہیں۔ اس وقت جامی مشکل سے ۱۹، ۲۰ برس کے ہوں گے۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ ان کا شعور بھی کروٹیں لیتا رہا۔ اور پانچ برس کی مشق ہی میں انھوں نے فن شعر پر کافی دسترس حاصل کر لی لیکن حضرت علی اختر مرحوم کے دائرۂ تلمذ میں آنے کے بعد ان کے جوہر تیزی سے کھلنے لگے۔ بالغ نظر استاد کی نظر کاری نے اس قدر تربیت دی کہ جامی کے اندر کا شاعر واضح خط و خال کے ساتھ دس سال کے قلیل عرصہ میں پوری طرح نمایاں ہو گیا اس شاعر نے جب آنکھ کھولی تو دنیا دوسری جنگ عظیم کے شعلوں سے جھلس رہی تھی۔ غیر ممکن تھا کہ پوٹے احساسات کے ساتھ پیدا ہونے والا شاعر جنگ کی تباہ کاریوں، ہولناکیوں اور انسانی خون کی ارزانی و بربادی کی طرف سے آنکھیں میچ لیتا۔

جامی کا شاعرانہ شعور پوری طرح بیدار ہوا اور پہلی مرتبہ اس کے قلم نے "جنگ" اور "جنگ بازوں" پہ "شرارے" برسائے۔ "شرارے" نازیت اور فسطائیت کے خلاف شدید نفرت کے جذبات کو اپنے میں سموئی ہوئی بیشتر نظموں پر مشتمل جامی کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ جو پہلی مرتبہ ۱۹۴۳ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔ یہ کتاب جہاں موضوع کے اعتبار سے نظموں کا ذخیرہ ہے وہیں جامی کی شاعرانہ غرور اعتمادی کا زینۂ اول بھی "دو باتیں" کے زیر عنوان جامی نے اس کتاب میں اپنے تعلق سے جو نثر پارہ سپرد قلم کیا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ۔

"شعر و ادب ہی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں زندگی اپنی تمام کیفیتوں کے ساتھ چلتی پھرتی، ہنستی اور سسکتی نظر آتی ہے۔ اگر میری ان نظموں میں بھی آپ کو عصر حاضر پر چھائے ہوئے آگ اور خون کے طوفانی مناظر کی جھلک نظر آئے تو یقیناً آپ میرے خلوص نیت پر کسی قسم کا شک نہ کر سکیں گے۔ بہر حال میں تو اس پر مطمئن ہوں کہ یہ جو کچھ ہے میرے سینے ہی آتشیں احساسات کا ایک عکس ہے روسی فرانسیسی اور انگریزی تخیلات سے بھیک لیکر انقلاب کا نقیب بن جانا مجھے نہیں آتا۔ میرے ذوقِ شعر نے صرف جذبات و مشاہدات کے سائے میں پرورش پائی ہے۔ فن و اصطلاحات کے

فلک بوس رنگین ایوانوں سے دور رہا ہوں اور سیاست کی بارگاہوں سے بھی الگ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس شعر کو پڑھنے کے بعد اس وقت کے بہت سے معاصرین نے ان کے اظہار خود اعتمادی کا مضحکہ اڑایا تھا ــــ لیکن تصوّر خود اعتمادی جب مجسم ہوکر قوی بن چکا تو جامی کو تقلیدی اور روایتی شاعری کی لفظی جنت سے باہر کھینچ لایا۔ جنت بدر ہونے کے بعد جب فسکر شعر نامانوس دشت بے برگ و بار میں پہنچی تو جامی نے ہراساں یا فرار ہونے کے بجائے اپنی خود اعتمادی سے خود اختیاری نگی یہاں سے جامی کی "ذ اتفعاتی شاعری" کا آغاز ہوا۔

شعر کی دنیا میں جامی کی بڑھی ہوئی انفرادیت پسندی انھیں ایسے تخیلات کی وادیوں میں لے آئی جہاں فطرت اپنے پورے مظاہر حسن کے ساتھ نظر نواز تھی۔ جامی یہاں آتے ہی ان نظاروں میں کھو گئے اور یہ بھول گئے کہ وہ بہت دور نکل آئے ہیں۔ راستے کے تماشے دیکھتے دیکھتے بھٹکے ہوئے بچے کی طرح جامی بھی صبح سے شام تک اپنے خیال کی نئی اور دلآویز وادیوں کے مطالعہ و سیل میں مصروف رہے لیکن جب شام گہری ہونے لگی تو انھیں احساس ہوا کہ وہ کچھ کھو گئے ہیں مگر اس احساس نے ان میں ہمت شکستگی یا مایوسی کے بجائے ایک نئے راستے کی تلاش اور ایک نئی منزل کے تعین کی بصیرت پیدا کردی اب جامی اپنا راستہ بناتے ہوئے بڑھنے لگے۔ یہاں سے ان کی تخلیقی شاعری کا آغاز ہوتا ہے بنے ہوئے راستوں پر چلنے والوں سے لغزشیں نہیں ہوتیں۔ نیا راستہ بنانے والا ہی ٹھوکریں کھاتا ہے لیکن اس کا ٹھوکریں کھانا راستے کے شدائد کو ٹھوکریں لگانا سمجھا جانا چاہیئے۔ جامی کا تیشۂ قلم وقت کی چٹانوں سے ٹکراتا اور رسرمہ بناتا رہا۔ تیشہ زنی میں اس کے مقصد کا لپسینہ جہاں جہاں گرا زمین نم ہوتی گئی۔ جب زمین خاطر خواہ ملائم ہوگئی تو جامی نے تیشہ زنی کے فرائض بدل دیئے اور اس تیشہ کو اپنے قلم کی روانی، دل کے گداز اور آرزووں کے خون میں ڈبو کر نقش کار رنگ کار اور ضیا بار بنادیا

ہر جگہ وقت کی چٹانوں سے خوبصورت خیال ٹکرائے

زندگانی کے ریگزاروں میں زخم جن جن کے پھول برسائے

"شرارے" برسانے والے تیشہ کو گلاب کا قلم بنا کر کشت شعر میں بونے تک جامی کو کتنے مضحکوں مخالفتوں، مایوسیوں اور مشکلوں سے گزرنا پڑا۔ یہ کچھ انہیں کا دل جانتا ہے۔ ہمارے ہم وطن بیگانوں کے لئے ہمیشہ مشفق و مہمان نواز اور مقامی فنکاروں کے حق میں جراحت نواز رہے ہیں۔

جامی دکن میں قدر کمال سخن نہیں :. ارزاں لٹا رہا ہوں متاع سخن کو میں

ناقدری کمال کا احساس ہونے کے بعد کم از کم جامی قبر پہ جاکر رونے والوں کی طرح کوئی پارٹ ادا نہیں کر سکتے تھے وہ اپنا دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے رفتار میں ثابت قدمی، دل میں خود اعتمادی، فکر میں خود اعتیاری! ایک آلۂ خود کار کی طرح وہ آگے بڑھنے لگے۔ انھیں اپنے نگار خانۂ فن کی بنیاد رکھنے کیلئے خوشگوار فضا، دلپذیر محل وقوع اور خوبصورت بلندی کی تلاش تھی۔ فن میں علیحدگی پسندی اور انفرادیت کے جذبے نے انہیں اپنے افکار دوسرے لفظوں میں معنوی اولاد سے بے پناہ پیار بھی پیدا کر دیا — جامی کا نگار خانۂ فن بیا کے گھونسلے کی طرح نازک شاخ کی انی پر بھی ہے، اور خوبصورت مگر خطرناک ابدی بلندی پر بھی! اس عبارت کی روشنی میں جامی خطرناک حد تک رفتار پسند اور آزمائش مسلسل کے بیباک پرستار معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے جہاں تحفظ متاع فن کے لئے —— ایک مامون و محفوظ گوشے کی تلاش کی ہے، وہاں یقیناً یہ بھی جانتے ہیں کہ اس خطرناک بلندی پر پڑا ازِ مسلسل ہی انھیں قائم رکھ سکتی ہے۔ وہ اپنے نگار خانے کے اندرونی حصے میں بیٹھے ایک چابک دست اور تیز نظر سنار کی طرح غزلوں کے اربانے اور خوبصورت ترکیبوں کے نگینے جڑتے ہیں۔ اور نگار خانے کے بیرونی حصے میں اس جڑاؤ ہار کو ایک سلیقہ مند جوہری کی طرح پیش کرتے ہیں۔ کچھ نمونے ملاحظہ کے لئے پیش ہیں۔

نیا راہ دشاں سے خوشی کے دھوکے ہیں
وہیں مقیم ہے مدت سے تشنگی اے دوست
ترے قریب پہنچ کر بھی کم نہیں ہوتے
بہت طویل سہی، راہ جستجو لیکن!

ہزار بار نئے غم خرید لائے ہیں
تری نظر نے جہاں میکدے بنائے ہیں
غم حیات نے جو فاصلے بڑھائے ہیں
بہت حسین ترے گیسوؤں کے سائے ہیں

مسافران شب غم کی راہ میں جامی
نئے چراغ مری فکر نے جلائے ہیں

جامی کی شاعری صرف مصرعوں کی خوبصورت ساخت، چمکیلے لفظ اور رنگیلی ترکیبوں کا نام نہیں؛ ظاہر ہے کہ نیا شعر تو نئی تختی پر لکھا جاتا ہے اور نہ صرف نئے انداز کو کہا جا سکتا ہے بلکہ نیا شعر، نئی بات اور نئے انداز کی جمع کا عبارت سے ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ہمیں بات اور انداز کو سمجھنا چاہیئے، پھر نئی بات اور نئے انداز کو۔ بات اور انداز کو اس شعر میں دیکھیئے۔

ناشناسوں کے عہدِ حکومت تک صبر کرتے ہوئے دکھ اٹھاتے رہے

آپ کے دورِ انصاف میں بھی اگر ظلم ہو گا تو پھر ہم کہاں جائیں گے

اس میں بات اور انداز دونوں تفصیلی ہیں اب اسی بات کو نئے انداز میں دیکھئے۔

رات کالی تھی بہت پر یہ گماں تک بھی نہ تھا

دامنِ صبح میں بھی تیرگیٔ شب ہو گی

ناشناسوں کے عہدِ حکومت اور دکھ اٹھانے اور صبر کرنے تک کی تفصیل کیلئے عہدِ حاضر کے شاعر نے صرف رات کے لفظ کو بطور سمبال (Symbol) استعمال کیا اور دورِ انصاف کیلئے صبح کے لفظ کو آثارِ ظلم کی تفصیل کو تیرگیٔ شب کے علامیہ میں کھپا دیا گیا لیکن جامی کا شعر پڑھنے کے بعد یہ گمان ہوتا ہے کہ اتفاقاً وہ عہدِ حاضر کو مل گئے ہیں ورنہ وہ کچھ اور بعد آنے والے زمانے کے نقیب ہیں

وہ رات کے دامن میں تاریکی کی بات کے اظہار کو "دنداں توجلہ درد ہاتند" والی بات سمجھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ رات کے پاس تیرگی تو ہوتی ہے لہٰذا وہ روایات کے کہرام کدے سے ہٹ کر اپنے نگار خانۂ سخن میں ایک نئی آواز بلند کرتے ہیں

یہ کیا ہوا کہ صبحِ بہاراں کے پاس بھی — پھولوں کی دلکشی ہے نہ گیتوں کا بانکپن

کتنی شبوں کا زہر پیا ہے نگاہ نے — اس انتظار میں کہ نگارِ سحر ملے!

جامی نے اپنی غزلوں میں اس طرح کے نئے انداز، نئی باتوں اور نئی آوازوں کے انبار لگا دیئے ہیں۔ ان کی نئی بات میں ذکرِ جاناں اور یادِ یاراں کے ساتھ ساتھ انفس و آفاق کی باتیں بھی ہیں ان کی غزلوں میں کائناتی ارتقا و نمو کے عکس بھی ملتے ہیں اور مزید نمود کی خواہش بھی جیسا کہ میں نے ابتدا میں کہا ہے کہ جامی نے اپنی غزل کے نام سے محبوب کے ذکر اور اس سے بات چیت کیلئے ایک بالکل علیحدہ زبان مرتب کی ہے جو ہنوز باک تک تسلیم کی جا چکی ہے۔ جامی کے منفرد اور شیریں لب و لہجہ نے ان کی قادر الکلامی اور کہنہ مشقی کے سبب ان کے سخن میں، انسانیت دوستی زندگی کی صحت مند روایتوں سے پیار، فکر کی گہرائی اور شعور کی گیرائی جیسے پہلو ملتے ہیں یہی نہ چند اجزائے سخن ہیں جن کے باعث ان کا ہر شعر زبانِ زدِ خاص و عام کی سند پا لیتا ہے۔ جامی کے حریفوں کو شاید میری یہ حقیقت بیانی کھلے۔ لیکن کیا کیا جائے۔ سہ

دربارِ شعر میں جامی قبول کر نہ سکا ∴ "کبھی" مذاقِ روایت کی حکمرانی کو

(ضرورتِ شعری کی طرح اس شعر میں میں نے ضرورتِ مضمون کی آڑ میں تھوڑا سا تصرف کیا ہے
اصل شعر کے دوسرے مصرعے میں "مرا" کی جگہ "کبھی" کر لیا گیا ہے۔)

خیر۔ آیئے چلنے سے پہلے جامی اور ان کے محبوب کی بات چیت بھی چھپ کر سن لیں

تری نگاہ مداوا نہ بن سکی جن کا ∴ تری تلاش میں ایسے بھی زخم کھائے ہیں
پڑا ہو عکس جو رخسارِ شعلہ رو کا! ∴ تو آئینے تری یادوں کے جگمگائے ہیں

جلاؤ غم کے دیئے پیار کی نگاہوں میں ∴ کہ تیرگی ہے بہت زندگی کی راہوں میں
ترے خیال کے مہتاب ساتھ رہتے ہیں ∴ شبِ فراق کی تنہا اداس راہوں میں
وہ رات ہے غمِ ایام کی حدوں سے پرے ∴ جو رات ہے لب و رخسار کی پناہوں میں
تری نظر کا سہارا، نہ آرزو کا فریب ∴ بہت دنوں سے اکیلا ہوں غم کی بانہوں میں

دیکھو تو صاف کر کے ذرا گردِ روزگار ∴ دل کے ورق پہ نام ہے کس کا لکھا ہوا
جب تک چلا نہ تھا تری زلفوں کا تذکرہ ∴ راہوں کے پیچ و خم میں کوئی دلکشی نہ تھی
ہر شب کسی پگھلے ہوئے سورج جیسے بنا کر ∴ پہنائے تری یاد کے ہاتھوں میں یہ کنگن
تمہاری یاد کے نشتر بدست لمحوں کو، ∴ بڑا خلوص مرے سینۂ فگار سے ہے
ضرور کوئی تعلق مرے اندھیروں کا ∴ تمہارے شہر کی اک صبحِ زرنگار سے ہے

کچھ دیر تیرے پیار کے آنچل کی چھاؤں میں
ٹھہرا لیا ہے گردشِ لیل و نہار کو...

اچانک آج اندھیروں میں روشنی سی ہوئی ∴ ضرور کوئی تمہارا پیام آیا ہے
صحرائے آرزو کی مسافت طویل تھی ∴ پہنچے ترے قریب تو بڑھنے لگی تھکن
ایک اک غم سے گلے ملتے ہیں تیری خاطر ∴ ایک اک درد سے پیمانِ وفا کرتے ہیں
نئے غموں سے تعارف کرا دیا میرا ∴ تمہاری یاد نے احسان ہی تو کئے

اداس رات ہے اس سیم تن کی بات کرو :. جبینِ فکر پہ کوئی کرن تو لہرائے
کوئی تیرے لبِ شیریں کی تمنا کر کے :. آج تک تلخیٔ ایام سے شرماتا ہے
آرزوؤں کی امیدوں کی جوانی لے کر :. دل کی راہوں میں کوئی شعلہ بدن آتا ہے

پھولوں کے دیے، سانولی شاموں کے دھندلکے
مکتوب چلے آتے ہیں اس جانِ غزل کے

تیری آنکھوں کی مست جھیلوں میں :. ڈوب جاتے ہیں غم کناروں کے
اندھیروں میں تمہاری یاد کا سورج نکلتا ہے :. تو جیسے جاگ اٹھتا ہے تخیل کا صنم خانہ

فرصت نہیں بخلوتِ گیسوئے عنبریں
کہدو غمِ حیات سے وہ پھر کبھی ملے !

ہونٹوں کی مے، نظر کے تقاضے، بدن کی آنچ :. اب کیا مزہ رہا کہ وہی رات بھی ملے

گلے میں کرنوں کا ہار پہنے، یہ کون آیا، یہ کون اترا ؟
پگھل گیا درد کا اندھیرا چمک اٹھے آرزو کے زینے
نہ جانے کتنے جواں ارادوں کا آئینہ بن گئے ہیں جامی
دیارِ لوح و قلم میں الفاظ کے یہ ترشے ہوئے نگینے !

بہت نزدیک آجاتے ہو تم جب فن شاعری کا :. سحر کی ایک دوشیزہ کرن لیتی ہے انگڑائی
تمہارے بعد جیسے جاگتا ہے شب کا سناٹا :. در و دیوار کو دیتا ہے کوئی اذنِ گویائی
پاسِ ناموسِ وفا، ذوقِ جنوں، فکرِ سخن :. کتنے آئینوں کو تیرے خواب جگاتے ہیں
یہ کس کی آنچ ہے کس کے بدن کی خوشبو ہے :. ترا خیال مرے ساتھ ہے کہ خود تو ہے

جامی اور ان کے محبوب کے درمیان راز و نیاز کی زبان آپ نے سن لی۔ اب اس زبان کا تجزیہ کیجئے تو ظاہر ہے کہ کوئی غیر ادبی لفظ اس میں نہ ملے۔ وہی مانوس، ہلکے پھلکے، نرم، بلکہ گداز لفظ ہیں جنھیں ہم اپنے محل موقع پر روزانہ بولتے اور پڑھتے ہیں۔ جامی کا کمال فن یہی ہے کہ انھوں نے نرم لفظوں سے آب رواں ترکیبیں بنالیں اور ان ترکیبوں کو شعروں میں موقع بموقع اس طرح خوبصورتی سے استعمال کیا ہے کہ خود بخود ایک مخصوص رمزیت اور نئی اشاریت وجود میں آگئی اور اگر

ان کی یہ اپج اور تخلیق کاری کچھ اور عرصہ جاری رہے تو اردو شاعری کی زبان میں ایک نیا انڈکس INDEX شامل ہو جائے گا

ہندا وہ بیرون ہند میں ایک مسلم الثبوت نظم گو کی حیثیت سے جامی کو بہت پہلے ہی تسلیم کیا جا چکا ہے اس لئے میں نے اپنے مضمون میں ان کی منظومات کو نہیں چھیڑا تاہم میں نظم کے ان مستقل مضامین کو جنہیں جامی نے اپنی فنکارانہ قابلیت سے غزل میں جگہ دی ہے۔ نظرانداز نہیں کر سکتا۔ دراصل موضوعات کے اسی رنگا رنگ امتزاج کی بدولت جامی کی غزل غیر معمولی قد آور ہو گئی ہے جامی عصر حاضر کے شعری تقاضوں پر نظر نہیں رکھتے، بلکہ عصری تقاضوں کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں۔ زمانے کے شعری تقاضوں پر نظر رکھ کر شعر کہنا تو مردے کے برابر کفن پھاڑنے کا بندھا ٹکا کاروبار ہے جامی کا کمال تو یہ ہے کہ وہ سماج، ملک تہذیب اور حیات و کائنات کا کتنا ہی قدآور مسئلہ کیوں نہ ہو اپنے شعر ایسے لمبے کپڑے میں لپیٹ دیتے ہیں۔ پھر لپیٹنے میں نزاکت اسقدر کہ مسئلہ کا دم نہ گھٹے اور احتیاط اسقدر کہ اوپر سے کسی کو نظر نہ آئے کہ اندر کیا بندھا ہوا ہے۔

آئیے ایسی بھی چند ریشمی گٹھریوں کی جھڑتی لیں۔

حیات ایک مفکر کی طرح سوچ میں ہے
دیار شوق کی مشر بار رکا ہوں میں

ضرور کوئی بہاروں کا قافلہ ہوگا ۔۔
غبار سا جو اڑا ہے خزاں کی راہوں میں

کس دشت بیکراں میں اجالے بھٹک گئے
منزل کے پاس تو ہے اندھیرا بڑھا ہوا

راہوں کے دلفریب مناظر کو دیکھ کر
خود کاروان وقت ہے جیسے رکا ہوا

پہچان بھی سکی نہ مری زندگی مجھے ۔۔
اتنی رواروی میں کہیں سامنا ہوا

اس طرح زندگی میں ہر ایک حادثہ ملا
جیسے سفر میں کوئی نیا ہم سفر ملے

دار و رسن کی راہ سے گزرے ہیں بار بار
اس اک امید پر کہ تری رہ گزر ملے

اپنوں کے دلنواز نگاہوں کے زخم بھی
جامی یہاں بہ قیمت عرض ہنر ملے

زخموں کے آس پاس ہیں کچھ پھول سے ابھی
گیتوں کے ساتھ ساتھ کوئی چاندنی سی ہے

مرے لئے ہیں اندھیروں کی پھانسیاں لیکن ۔:۔ نئی سحر کے لئے آفتاب دیتا ہوں

یہ شعر قابلِ توجہ ہے۔

آوارگانِ شوق نے کتنا تھکا دیا ۔:۔ اس دشتِ بیکراں میں غمِ رہگزار کو

اے دل غموں کی انگلیں شہرِ حیات میں ۔:۔ دنیا ذرا فروغ اسی کاروبار کو

مایوس تیرگی سے نہ ہو اے غمِ وطن ۔:۔ لے تجھ کو دے رہا ہوں چراغِ شعورِ فن

پگھلا دیئے ہیں تلخ حقائق کی آگ نے ۔:۔ خوابوں کی چاندنی سے بنائے ہوئے بدن

اس زندگی کے اور بھی کچھ نام ہیں سنئے ۔:۔ کب تک شبِ فراق کا افسانۂ کہن

حالات خود ہی پاؤں کی زنجیر بن گئے ۔:۔ ورنہ کچھ اتنی دور نہ تھی تیری انجمن

دوستو ہر طرف اندھیرا ہے ۔:۔ میری گیتوں کی مشعلیں لاؤ!

منزلیں خود تلاش کر لیں گی ۔:۔ بیکراں دشت میں بھٹک جاؤ

زندگی تلخ ہی سہی جامی

زندگی سے قریب ہو جاؤ

جیسے بکھرے ہوئے کانٹوں میں کوئی لے آئے ۔ آج اسطرح بہاروں کے قدم کٹے ہیں

نہ در و بام ستم ہیں نہ صلیبوں کے چراغ ۔ دل دیوانہ ترے شہر میں گھبراتا ہے

وقت کی دھوپ میں جیسے کوئی سایہ جامی ۔ میری سوچوں کے در و بام پہ لہراتا ہے

سحر کی آرزو کے پاس کچھ جلتی چتائیں ہیں ۔:۔ بہاروں کے تصور میں ہے اک بے خواب ویرانہ

کچھ دور آؤ موت کے ہمراہ بھی چلیں ۔:۔ ممکن ہے راستہ میں کہیں زندگی ملے

کوئی کہے تو وقت کے مقتل میں کیا کہے ۔:۔ کس کے لہو سے ترے اجالوں کی آیتیں

روشن ہے آرزو کی صلیبوں کا راستہ ۔ لرزاں ہے سازِ غم پہ کوئی شعلۂ یقیں

یہ شعر سنیئے ۔

دیئے لیے ہوا یہ کہہ کر نسیم بالفزا گزری ۔ چلو ان رہگزاروں سے جہاں پھر کچھ گلزار ملتے ہیں

عزیزانِ گرامی کی طرح پھولوں کی بستی میں ۔ بڑے ہی پرتپاک انداز میں اب خار ملتے ہیں

ذرا ملنا کسی دن میکدے کی راہ میں مجھ سے ؛ مجھے کچھ مشورہ اے گردشِ ایام دینا ہے

اس شعر پہ توجہ چاہتا ہوں۔

ابھی قرأت پہ ٹھہرو سحر آجائے تو اُس کو ؛ اجالوں میں شمارِ زخمِ دل کا کام دینا ہے

زمیں کے دلکش صنم کدوں سے فلک کے تاروں کی انجمن تک
اجل کو مسحور کر دیا ہے کہاں کہاں حسنِ زندگی نے!

مری امنگوں کے سامنے ہے شعورِ فن کا نیا سویرا
مگر اندھیروں کے ذہن میں ہیں وہی روایات کے دفینے

مرے معیارِ فن کی روشنی کو عصرِ حاضر میں ؛ نہ جانے اور کتنی ظلمتوں کا زہر پینا ہے

کچھ دیئے اور جلاؤں گا سرِ ابرِ بہار ؛ میں نے کچھ سوچ کے رکھا ہے قدم کانٹوں پر

غزل کو تجربات زندگی کی دھوپ میں جا کر
نئے اسلوب ملتے ہیں نئے معیار ملتے ہیں

("بزمِ جیون" حیدرآباد میں پڑھا گیا)

سیّد حرمت الاکرام

ثریّا محمود ندرت

اُردو کے مشہور شاعر سید حرمت الاکرام مرزا پور (یوپی) کے رہنے والے ہیں۔ وہ جولائی ۱۹۵۲ء میں کلکتہ آئے ابتدا میں تقریباً ایک سال تک روزنامہ ہند میں سب ایڈیٹر کے عہدہ پر فائز رہے بعد میں اس سے علیحدہ ہوکر روزنامہ آزاد ہند سے وابستہ ہو گئے اور اب مستقل طور پر اسی سے منسلک ہیں۔

دُبلا پتلا جسم، گندمی رنگ۔ گہری اور سوچ میں ڈوبی ہوئی اداس آنکھیں، چوڑی پیشانی اور پیشانی پر بکھرے ہوئے سیاہ بال جنھیں سنوارنے میں ان کی انگلیاں اکثر ناکام رہتی ہیں۔ قمیص، پاجامہ اور شیروانی ان کا مخصوص لباس ہے بعض اوقات کرتا بھی پہن لیتے ہیں۔

ان کی شاعری کی طرح ان کا اپنا لب و لہجہ بھی نرم، متین اور کسی حد تک پر سوز ہے۔ جو میرے نزدیک اس بات کا ثبوت ہے کہ انھوں نے زندگی میں تلخیوں کا مزہ زیادہ چکھا ہے اور انھیں ہر قدم پر زمانہ کے سرد و گرم اور نشیب و فراز سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ آلام اور افکار، مصیبت اور پریشانی میں گھبرانا ان کا شیوہ نہیں بلکہ ہر غم و اندوہ کو خندہ پیشانی سے سہہ جانا ان کی عادت ہے۔ بڑی سے بڑی مصیبت بھی ان کے پائے استقلال کو جنبش نہیں دے سکتی۔ ان کا خیال ہے کہ دل کے زخموں کیلئے وقت ہی سب سے بڑا مرہم ہے۔ اور جس طرح نشاط و مسرت کا زمانہ عارضی ہوتا ہے اسی طرح رنج و الم کے لمحات بھی چند روزہ ہوتے ہیں۔

حرمت الاکرام صاحب کئی سال سے قلب اور اعصاب کے عارضہ میں مبتلا ہیں۔ کلکتہ کی آب و ہوا ان کی صحت کے ناموافق ہے لیکن میرا خیال ہے کہ کلکتہ کی آب و ہوا سے بڑھ کر چائے کی زیادتی ان کی صحت کیلئے نقصان رساں ہے۔ اس کے باوجود اسے ترک کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ کیونکہ چائے ان کی زندگی کا جزو لازم بن کر رہ گئی ہے۔ چائے کے علاوہ پان اور سگریٹ کی بھی عادت ہے آجکل مستقل طور پر مرزا پور میں مقیم ہیں۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ کلکتہ میں ان کا جی نہیں لگتا۔ کچھ یہاں کی ہنگامہ خیز اور مشینی زندگی کا ناخوشگوار اثر اور کچھ پردیس کا ماحول وہ بعض اوقات کہا کرتے تھے۔

کہ "یہاں گھر کے اندر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی چورنگی روڈ پر ہے۔" مرزا پور کی پرسکون اور خاموش زندگی کے تصورات بھی ان کے ساتھ تھے۔

ان کا نام ترقی پسند شعرا کی فہرست میں آتا ہے یوں ان کے نقطۂ نگاہ سے ترقی پسندی کوئی فیشن نہیں بلکہ فکر و عمل کی بیداری کا نام ہے۔ جو شاعر کو خلاؤں میں بھٹکنے کے بجائے زندگی کے حوادث و حقائق سے آنکھ ملانے کا حوصلہ دیتی ہے۔ انھیں فنی اعتبار سے نظم، غزل، رباعی، قطعہ سب پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ لیکن دراصل ان کی جولانگاہ فکر نظم ہے۔ انھوں نے اپنی شعر گوئی کی اساس گرد و پیش کے حالات و واقعات پر استوار کی ہے۔ زندگی کو انھوں نے نہایت خلوصِ دل اور خلوصِ عمل کے ساتھ برتا ہے اور اس کے بلند و پست کا ذہن و قلب کی کھلی ہوئی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے۔ پروفیسر ارشد کاکوری مرحوم "نواجاؤں کے گیت" پر اپنے مقالہ میں لکھا ہے۔

> "اب جوانی نہ پہلے کی طرح "لطیف نیند" کا نام ہے نہ "حسین خواب" کا۔ حرمت الاکرام کو بھی بیدار رہ کر جینا پڑا۔ ظاہر ہے کہ چشم و دل کی بیداری بڑا گراں سودا ہے اور صاحب احساس و اہل نظر کو اس کی جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے وہ خونِ جگر کی قیمت ہے حرمت الاکرام کا کلام زندگی سے اسی قسم کا سودا ہے۔"

وہ اپنے تجربات محسوسات اور جذبات کو بڑی فنکارانہ مہارت دلپذیر صناعی اور شستگی و شگفتگی کے ساتھ اشعار کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ جو ان کی شاعرانہ انفرادیت کو اجاگر کرتا ہے۔ غزلوں اور نظموں کے بارے میں خود ان کی اپنی رائے یہ ہے "مجھے نظم گوئی زیادہ عزیز ہے لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ غزل گوئی کچھ کم عزیز نہیں۔ میں اپنے اس خیال کی توجیہ اس طرح کر سکتا ہوں کہ نظم کا قالب میرے احساسات و جذبات کے اظہار کیلئے زیادہ موزوں ہے۔ لیکن غزل اردو کا ایک قیمتی سرمایہ ہے اور اس کو نیا آب و رنگ دینے نیز نئے امکانات سے آشنا کرنے میں اس دور کے چند دوسرے شعرا کے ساتھ میں نے بھی اپنا خون جگر صرف کیا ہے۔" ان کے کلام میں رومانی، سیاسی اور سماجی رنگ آمیزیوں کے علاوہ سنجیدگیٔ فکر اور رعنائی بیان کی دلآویزیاں بھی پائی جاتی ہیں ان کے انداز بیان میں بڑی تازگی فکر میں گہرائی، اور تشبیہات و استعارات میں بڑی دلکشی ملتی ہے۔ کلام کا معنوی حسن اور تہذیبِ فکر ان کے نزدیک اہم ترین چیزیں ہیں۔ معنی آفرینی، خیال کی لطافت اور زندگی کی نئی قدروں اور بدلتے ہوئے حالات کے عکس نے ان کی شاعری میں بڑی اثر انگیزی اور نشتریت

جامعیت پیدا کردی ہے۔ ان کی شاعری بے مقصد نہیں بلکہ وہ اپنے قلم کے ذریعہ تعمیری اور صالح ادب کی تخلیق پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ زود گوئی ان کا خاص وصف ہے۔ لیکن ان کے نزدیک یہ وصف باعث فخر نہیں۔ وہ جتنے اچھے شعر کہتے ہیں اتنی ہی اچھی نثر لکھتے ہیں۔ اور بڑی اچھی ناقدانہ بصیرت رکھتے ہیں۔

اپریل ۱۹۵۶ء میں ان کی پچیس منتخب نظموں کا مجموعہ "جالوں کے گیت" کے نام سے منظر عام پر آیا جسے خود انھوں نے مرتب کیا ہے۔ اس کی اشاعت کے چند مہینوں کے بعد میں ان سے روشناس ہوئی۔ وہ غالباً اگست ۱۹۵۶ء کا زمانہ تھا۔ جب میں جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحان "ابتدائی" کی تیاری کر رہی تھی۔

اس سے قبل میں ان سے غائبانہ طور پر واقف تھی ایک بار کسی رسالہ میں ان کی نظم میری نظروں سے گزری اور حسب عادت میں نے اس کے دو اشعار اپنے پسندیدہ شعروں کی بیاض میں نوٹ کر لئے اشعار یہ ہیں

آم کی شاخ پہ کوئل کی یہ کوکیں پیہم — کون سمجھے کہ یہ نغمہ ہے کہ نالہ اے دوست
دوسرا مجھ کو نہ سمجھے تو کوئی بات نہ تھی — شکوہ یہ ہے کہ مجھے تو بھی نہ سمجھا اے دوست

جب میں نے ان سے پڑھنا شروع کیا تو اپنی نثری اور شعری تخلیقات بھی انھیں دکھلانے لگی اس طرح غزل گوئی کا شوق بڑھتا گیا اور میں افسانوں کے ساتھ غزلیں بھی لکھنے لگی انھوں نے اپنے بڑھتے ہوئے مشاغل اور مصروفیات کے باوجود نہ صرف مجھے درسی کتابیں پڑھائیں۔ بلکہ شعر و ادب کی راہوں میں انتہائی خلوص و انہماک کے ساتھ میری رہنمائی کی۔ ان کی حوصلہ افزائیوں نے میری صلاحیتوں کو پروان چڑھایا اور رفتہ رفتہ میری تحریریں رسائل و جرائد میں شائع ہونے لگیں۔ میں کہہ سکتی ہوں کہ میں نے جو کچھ بھی سیکھا اور پڑھا وہ ان کی عنایتوں اور نوازشوں کی دین ہے۔ انھیں کی بدولت میں ادبی دنیا سے روشناس ہوئی۔ اور مجھے یہ کہتے ہوئے دلی مسرت ہوتی ہے کہ جناب حرمت الاکرام نے میری رہنمائی کی ہے۔

انھیں دنوں مجھے "جالوں کے گیت" اور ان کی دوسری تخلیقات کے مطالعہ کا موقع ملا۔ ان کی نظموں کے مطالعہ سے انسان بآسانی ان کے دلی جذبات کا اندازہ کر سکتا ہے۔ انھوں نے نیبولوں کے ساتھ کانٹے

بھی جیتے ہیں اور مسرتوں کے ساتھ غموں کی دلداری بھی کی ہے۔ تیرہ و تاریک فضاؤں میں مسکراہٹوں کے چراغ بھی جلائے ہیں اور حالات کے بخشے ہوئے زخموں سے دل کی وادی بھی سجائی ہے ضرورت ہے کہ ان کا مکمل مجموعہ کلام جلد ہی منظر عام پر آجائے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے کلام کا سخت انتخاب کرنے پر بھی اس کو کتابی شکل دینے کیلئے ۵۰۰ صفحات سے کم کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس کام کی انجام دہی میں خود ان کی بے توجہی کو بڑا دخل ہے۔ انھیں دنیاداری اور زمانہ سازی نہیں آتی اور طبیعت میں استغنا بھی ہے ظاہر ہے کہ اس دور میں یہ چیزیں کتنی نقصان رساں ہیں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ انھوں نے اپنے کو سود و زیاں کے احساس سے بالکل بیگانہ کر رکھا ہے۔

مشاعروں کے معاملہ میں ان کی بے نیازی حد سے تجاوز کی ہوئی ہے۔ وہ فی زمانہ ادب کو عوام تک پہنچانے میں جہاں مشاعروں کی افادیت کے قائل ہیں وہیں ان کا خیال یہ بھی ہے کہ مشاعرے اپنے گرتے ہوئے معیار، ماحول کے اعتبار سے ادب کی بنیادی قدروں کو نقصان پہنچا رہے ہیں اور زبان و فن پر بڑی گہری ضرب پڑ رہی ہے۔ مشاعروں کیلئے ترنم کی جادوگری سے قطع نظر ایک خاص رنگ کے کلام کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کا حرمت الاکرام صاحب کے ذہن و قلم سے کوئی ربط نہیں ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ مشاعروں میں شریک ہو کر میں اپنا اور دوسروں کا وقت کیوں ضائع کروں۔ ہنگامہ آرائی، غلو اور ہنگامہ خیزی انھیں یوں بھی پسند نہیں، خاص مراسم اور خاص اخلاقی دباؤ کے تحت مخصوص نشستوں میں شریک ہو جاتے ہیں لیکن وہ بھی شاذ و نادر

اخلاق، وضعداری، تہذیب، شرافت ان کی طبیعت کے خاص اجزائے ترکیبی ہیں کسی کی خاطر سے کوئی نقصان یا تکلیف اٹھا لینا ان کے لئے کوئی بات نہیں اور اس طرح کہ دوسرے پر اظہار نہ ہو۔ ہمہ وقت کچھ سوچتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور سوچنا ان کی طبیعت ثانیہ بن چکا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں۔

گوشۂ فراغت بھی مرکزِ اذیت بھی — طرفہ کارگر کتنی سوچنے کی عادت بھی۔

ان کے اسلوب سخن سے بھی ان پر روشنی پڑتی ہے۔ کہ فکر و فلسفہ ان کی زندگی کا محور ہے۔ وہ ایک فلسفی شاعر ہیں اور زندگی کے ہر مسئلہ اور واقعہ پر اپنے مخصوص طرز فکر کے تحت نظر ڈالتے ہیں ان کے پاس اپنی زندگی کے لئے ایک نظریہ بھی ہے۔ اور لائحہ عمل بھی۔ فطرتاً کم سخن ہیں۔ غیر ضروری باتیں نہیں

کرتے ۔ پروفیسر پرویز شاہدی (صدر اردو کلکتہ یونیورسٹی) ان کے متعلق لکھتے ہیں

"منکسر، حلیم، متین، تصنع اور تکلف سے بالکل مبرا ۔ ملنے جلنے کا انداز بہت مخلصانہ علمی اور ادبی گفتگو میں پورے انہماک سے حصہ لیں گے لیکن کبھی یہ نہ محسوس ہونے دیں گے کہ علم کی نمائش کر رہے ہیں۔"

دراصل نمائش پسندی اور خودنمائی کا ان کی فطرت سے کوئی رابطہ نہیں ہے ۔ وہ اپنی برائی یا بڑی کا اظہار کرنے پر قدرت نہیں رکھتے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ملنے جلنے والوں میں بڑے مقبول اور ہردلعزیز ہیں ۔ کلکتہ میں بھی ان کے دوستوں اور قدردانوں کا حلقہ کافی وسیع ہے ۔

ان کی رہنمائی میں شعروادب کے مراحل طے کرنیوالوں کی تعداد کافی ہے ۔ جو ان کی شاعرانہ عظمت اور پختہ مشقی کی دلیل ہے ۔ اور اپنی مصروفیتوں اور دوسری ذمہ داریوں کے باوجود اس کام کو بڑی خاموشی اور خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں جس سے ان کی فطری ایثار پسندی کا پتہ چلتا ہے ۔ عادتاً فضول خرچ ہیں اور اپنی اس کمزوری کا اعتراف کرتے ہیں چائے پینا اور پلانا ان کا دلچسپ مشغلہ ہے کلکتہ میں ان کے قیام کے دوران "امجدیہ کی شام شاعروں اور ادیبوں کے ایک حلقہ کیلئے بڑی کشش کا باعث تھی اور معلوم ہوا ہے کہ ان کے چلے جانے سے یہ رونق ختم ہوگئی جس کی شکایت ان کے ہم نشینوں کو اکثر رہتی ہے ۔

حرمت الاکرام صاحب کو شہرت بھی حاصل ہے اور مقبولیت بھی ۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اردو ادب نے ابھی انھیں اچھی طرح نہیں پہچانا ۔ اردو شاعری میں جو فکری اور فنی زوال نہایت تیزی سے راہ پا رہا ہے ۔ اس سے اپنے کو بچانے اور اس کے خلاف صف آرا ہونے والے چند شعراء میں ان کا شاعرانہ وجود بعید نمایاں ہے ۔

یہی نہیں ہوئی ہیں نصیب صبحِ آرزو کئی چراغ بجھ گئے طلوعِ آفتاب تک

فیضی نظامپوری

کامل چاندپوری — ایک تعارف

پروفیسر عبدالحی رضا

وطن [illegible] چاندپور ضلع بجنور ہے۔ گرچہ ان کے آباواجداد ابتدا میں قصبہ [illegible] بستے تھے۔ یہ قصبہ چاندپور سے دکھن ۸ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ بعد میں اعظم پور ترک کر کے یہ خاندان چاندپور آکر بسا۔ کامل کے دادا کا نام نبی بخش تھا۔ ان کے چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ کامل کے والد اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ منشی علیم اللہ نام تھا۔ مراد آباد ملازمت کرتے تھے۔ منشی علیم اللہ نے تین شادیاں کیں۔ تیسری بیوی سے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہوئی جن میں عزیز اللہ سب سے بڑے اور سمیع اللہ سب سے چھوٹے ہیں۔ یہی سمیع اللہ ان دنوں کامل چاندپوری کے نام سے مشہور ہیں ——۔

کامل چاندپوری ۱۹۴۲ء کے سیاسی ہنگاموں کے زمانے میں چاندپور میں پیدا ہوئے اور ابھی حیات مستعار کے صرف آٹھ ہی ماہ گذار پائے تھے کہ ان کے والد رحلت فرما گئے۔ منشی محمد اسمٰعیل جو ان کے سب سے بڑے سوتیلے بھائی تھے۔ خاندان کی کفالت کا بار اٹھایا۔ کامل نے چاندپور کے پرائمری اسکول میں اردو زبان میں تعلیم کی ابتدا کی مگر معاشی حالات کی ناسازگاری نے تعلیمی سلسلہ کو جلد منقطع کرا دیا۔ اور تلاش رزق میں سرگردانی اور حیرانی کا سلسلہ شروع ہوا۔ بچپن ہی سے انھیں موسیقی سے لگاؤ تھا۔ اگرچہ اس فن میں نیازمندی رہی ہے۔ مگر ان کی آواز کی شیرینی و دلکشی پر ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔ عہد معصومیت میں غزلیں ترنم کے ساتھ پڑھا کرتے اور عام چلن کے مطابق فلمی گانا [illegible]

قوالی کی دھن سے بھی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ عمر کے چودھویں سال میں انھوں نے امانت کی اندر سبھا کو حفظ کر لیا تھا اور انتہائی خوش گلوئی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ اپنے محلہ کے اصحاب ذوق کی فرمائش پر خصوصاً اندر سبھا سنایا کرتے تھے۔ غرض یہ کہ خوش الحانی قدرت کا ایک عطیہ تھا جو کامل کو عہد طفولیت ہی میں حاصل ہو گیا تھا۔ مگر لڑکپن ہی سے وہ معاشی جنجال میں پھنس چکے تھے اسی سلسلے میں سنہ ۱۹۳۹ء میں لاہور گئے پھر دہلی آئے اور وہاں سے پونا پہنچے اور سنہ ۱۹۴۰ء میں بمبئی آئے یہاں ملازمت ملی۔ اسی سلسلے میں بھوپال بھیج دیئے گئے۔ مارچ سنہ ۱۹۴۳ء میں دوسری بار بمبئی کی پرکشش اور جاذب نظر سرزمین میں وارد ہوئے اور مستقل طور پر قیام کی کوشش کرنے لگے۔ طبیعت میں چونکہ انتہا درجہ کی خاکساری ہے اس لئے پیشہ میں کوئی عیب نہیں سمجھتے۔ فن خیاطی میں کامل تو نہیں البتہ مہارت ضرور رکھتے ہیں۔ اسی فن کے سہارے انھیں بمبئی میں پناہ ملی۔ بمبئی کی یہ خاص بات ہے کہ وہ ہنرمندوں کو سینے سے لگاتی ہے۔ اسی لئے اس شہر میں ہنرمند بے کار نہیں رہتا۔ یہاں ہر طرح کا کام ملتا ہے اور کام کرو اور روٹی کھاؤ پر یہاں عمل ہوتا ہے۔ بہرحال معاشی پریشانی سے تھوڑی آسودگی حاصل ہوئی تو پھر فطری رجحانات اور دل کے تقاضوں سے مجبور ہو کر شعری محفلوں میں شریک ہونے لگے۔ اب تک کامل اور شعر گوئی دو علحدہ چیزیں تھیں۔ مگر کچھ تو پہلے ہی سے ان میں جنون کے آثار تھے اور کچھ ماحول اور فضا نے جنون انگیزیوں کا سامان بہم پہونچایا۔ چنانچہ اس شہر کے گرماگرم مشاعروں کی شرکت نے جنون شعر گوئی کو بیدار کر دیا۔ اس وقت اس شہر میں مشاعرے بھی بہت ہوتے تھے اور کامل کا شوق شرکت مشاعرہ بھی اسی درجہ تھا مشاعرے کی شرکت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ کامل کو شعر فہمی اور سخن سنجی کی استعداد تھی یا شعر و نغمہ سے ایک فطری لگاؤ تھا جو انھیں کشاں کشاں مشاعرے کی طرف لے جایا کرتا تھا۔ ہمارے مشاعروں کا ایک افادی پہلو یہ بھی رہا ہے کہ اس نے شعر و شاعری سے تہیدست صاحبان میں ذوق پیدا کیا ہے اور شعری حس رکھنے والوں میں شعر گوئی کی صلاحیت پیدا کر کے اسے پروان چڑھایا ہے کامل کی شعر گوئی کی بنیاد بھی مشاعرے کا مرہون منت ہے — ۔

اسی زمانے میں ایک مشاعرے میں جگر مرادآبادی نے بھی شرکت کی تھی، کامل اس مشاعرے میں "میرا [illegible] جلوہ" بنے بیٹھے تھے، کامل کی غزل گوئی کی ابتدا جگر کی غزل کی تقلید سے ہوئی۔ اس طرح شعر کہنے کی [illegible] ہمارے یہاں بہت کثرت سے رہی ہے۔ فوری طور پر کسی شاعر کے کلام سے اثر

قدر مرعوب یا متاثر ہو کر بیتوں نے غزلیں کہی ہیں۔ یہ تقلیدی رنگ ہوتا ہے اور جہاں امتداد زمانہ سے جذبات کافور ہو جاتے ہیں وہیں شعر گوئی کا جذبہ بھی سرد ہو جاتا ہے۔ مگر تقلید کے ساتھ کچھ فطری جذبۂ شعر گوئی کی بھی کار فرمائی ہو تو پھر تقلیدی جذبہ جب کافور ہوتا ہے تو اس وقت شاعر کے اپنے فطری تقاضے اور جذبۂ شعری ابھرنے لگتے ہیں۔ اور یہیں سے رنگ سخن اپنی تمام کرشمہ سازیوں کے ساتھ ابھرتا ہے۔ پھر مشاہدے کی عمق۔ جذبے کی صداقت، فکری صلاحیتوں کی بالیدگی۔ اور قلب کی دردمندیاں شاعر کی طبیعت میں ابال پیدا کرتی ہیں اور پھر ایک مترنم آبشارِ شعر و نغمہ پھوٹ نکلتا ہے ـــــ۔

عاملؔ کی غزل گوئی کی ابتدا تقلید سے ہوئی۔ مگر اسے فطری ذوق سخن گوئی نے سہارا دیا۔ ابتدا ہی سے انھیں دو موضوعات بہت عزیز تھے، جن میں ایک موضوع تو سبھی کو عزیز ہوتا ہے مگر دوسرا موضوع سب کے حصہ میں نہیں آتا۔ یعنی عاملؔ کو عشق و محبت کے موضوع سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ ایک تو سن وسال کا تقاضا دوسرے تجربات نے اور شدت پیدا کر دی تھی۔ دوسرا موضوع ان کے تجربات کا نچوڑ اور معاشی پریشانیوں کا نتیجہ تھا۔ عاملؔ کی معاشی پریشانیوں نے انھیں مایوسی کی حد تک پہونچا دیا تھا۔ مگر قنوطیت اور بغاوت کی سرحدوں تک نہیں پہونچا سکی تھی۔ وہ اپنی معاشی حالت کی درستی میں جان و دل سے لگے ہوئے تھے اور لگے ہوئے ہیں۔ مگر اس دور میں جہد مسلسل اور کامیابیوں پر بھی تیقن کی راہ متعین نہیں ہو پاتی۔ عاملؔ بھی ساری محنتوں اور جانفشانیوں کے باوجود اس دور میں سوچتے تھے کہ ان کی ساری محنتیں بغیر کسی منزل کے تعین کے صرف ہو رہی ہیں۔ مگر جوانی اور صحت مندی کے ساتھ معاملہ کی سختی کے باوجود تاب لانے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے اور شوقِ منزل میں یا ذوقِ طلب میں آگے بڑھے جا رہے تھے۔ جگرؔ کے رنگ میں جو اشعار انھوں نے کہے ہیں وہ فنی حیثیت سے قابل توجہ نہ ہوں مگر اس حیثیت سے ضرور توجہ کے قابل ہیں کہ ان میں عاملؔ کے ذہن اور قلب کا عکس ملتا ہے ـــــ۔

وہ شاید بلائیں اشارے سے مجھ کو ! | انھیں لوٹ کر دیکھتا جا رہا ہوں
نہ ہے قصدِ منزل نہ ہے کوئی جادہ | مگر کچھ کشش ہے کھنچا جا رہا ہوں

ابتدا میں صورتِ حال یہ تھی کہ کسی مشاعرہ میں کسی شاعر کا مصرع اپنی تمام نغمگی کے ساتھ ایسا گھر آ تا تھا اور پیدا کرتا تھا۔ کہ شعر کہنے کا بے پناہ جذبہ ان کے اندر بے تابی اور بے چینی کی کیفیت پیدا کر دیتا تھا اور جب تک چند اشعار یا مکمل غزل کہہ نہ لیتے اس وقت تک ذہن اس تخلیقی کرب سے آزاد نہیں ہوتا

[illegible]ں یہ کیفیت ذہنی سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شعر کہا نہیں جاتا بلکہ ایک خاص کیفیت میں شاعر [illegible] ہے جنم دیتا ہے اور یہ اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ شاعر شعر گوئی کے فطری جذبہ سے مالا مال ہو [illegible] جذبہ کسی محرک سے بیدار ہوتا ہے فن کار اپنی ریاضت اور محنت سے ان تاثرات کو شعر کا قالب عطا کرتا ہے۔ بہرحال ابتدائی صورتِ حال تو یہی مگر آہستہ آہستہ اس میں تبدیلی ہوئی اور اب یہ کیفیت ہے [illegible] مصرع خود بخود ترنم اور موسیقی کے ساتھ ذہن میں آجاتا ہے اور اسی موڈ میں غزل ڈھلتی ہے۔ کامل کوئی غزل یا چند شعر [illegible] نہیں سکتے جب تک کوئی مصرع بھرپور نغمگیت کے ساتھ ان کے ذہن [illegible] نہ پیدا کر دے [illegible] طبیعت کے خلاف ہے کہ بغیر کسی مترنم مصرع کے ورود کے وہ چند شعر بھی کہہ سکیں حقیقت [illegible] ہے کہ ان کا مزاج ترنم اور بحر کے وزن سے ایک فطری مناسبت رکھتا ہے۔ ان کے مزاج کا ترنم اور اشعار اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ کسی ایک کا تصور بغیر دوسرے کے مکمل شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ کامل کے مزاج میں موسیقیت اس قدر رچی ہوئی ہے کہ اپنے اشعار ہمیشہ ترنم کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ ترنم ان کے مزاج شعری کا جزوِ اول کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے عروض کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ مگر ہر مصرع عروض کی تمام پابندیوں کے ساتھ نکلتا ہے۔ اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مزاج شعری خود اتنا سنجیدہ اور غیر شعوری طور پر مزاج عروض کے ان تمام نکات سے اس قدر آگاہ ہے کہ مصرع خود بخود نپا تلا نکلتا ہے [illegible] اسی لیے اکثر یہ ہوتا ہے کہ بعض مصرع ترنم کے ساتھ نوکِ زبان پر آتا ہے اور جب تک خیال اور ترنم میں ہم آہنگی رہتی ہے اس وقت تک شعر ڈھلتے رہتے ہیں اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ دو تین شعر کے بعد خیال اور موسیقیت کی ہم آہنگی ختم ہو جاتی ہے تو کامل بھی خاموش ہو کر ادھوری غزل اس وقت تک کیلئے چھوڑ دیتے ہیں جب تک پھر وہی موڈ ان پر طاری نہ ہو جائے اور اس طرح کبھی کبھی مہینے اور سال گذر جاتے ہیں اور غزل ادھوری پڑی رہتی ہے۔ اس صورتِ حال کی تصویر یوں پیش کی جا سکتی ہے۔ ان کے شاعرانہ وجود کی پہلی منزل تو وہ ہے جہاں وہ مشاہدات و تجربات سے گہرا تاثر حاصل کرتے ہیں پھر یہی تاثرات قلبی کیفیات میں بدل کر ایک مترنم مصرع، شعر اور غزل کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ کامل شعر کہتے وقت کیفیت اور موسیقیت کی جس شدت اور گہرائی میں ڈوب جاتے ہیں افسوس ہے کہ اس عالم میں کبھی مشاعروں میں ان کا آنا نہیں ہوتا در حقیقت تو یہ ہے کہ مشاعروں میں کوئی شاعر اس کیفیت میں نہیں پڑھتا جس کیفیت میں اس نے اشعار کہے تھے ورنہ سامعین کا اس دو آتشہ سے نہ جانے کیا حال ہو۔

خاص تقلید کی تنگنائے سے جلد باہر نکل آئے۔ ان کی غور وفکر کی صلاحیت اور عشق و معاش کے تجربات اور ان کی محرومیوں نے ان کی شعری صلاحیتوں کو ابھارا۔ یہ وہ دور ہے جب کامل معاملات عشق اور ناکامی عشق کے تجربات سے کافی مالا مال ہو چکے تھے۔ قلب میں رقت، سوز اور گداختگی کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی اور بقول جگر ؎

ہستی شاعر اللہ اللہ   عشق کی منزل حسن کا مسکن

بن چکے تھے۔ اب ان کی آواز میں انفرادی تجربات نے اجتماعی رنگ پیدا کر لیا تھا وہ اپنے تجربے کی روشنی میں جو کچھ کہتے وہ ہزاروں دلوں کا ترجمانی ہوتی اور اسی لئے ہزاروں کو متاثر کرتی۔ فنکار جب انفرادیت سے اجتماعیت اور ہمہ گیریت کی طرف آجاتا ہے تو لوگوں کی نگاہیں اس کی جانب اٹھنے لگتی ہیں۔ کامل کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ انھوں نے جب محبت کا راگ چھیڑا اور جب تلاش معاش کی الجھنوں کا ذکر کیا تو سننے والوں نے اس میں اپنی تصویر دیکھی ـــــ۔

ایک بڑا دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سمیع اللہ سے کامل کس طرح ہو گئے۔ ممکن ہے کہ دوسرے شاعروں کے یہاں نام اور تخلص کے درمیان کوئی لطیف حادثہ رونما ہوا ہو یا تخلص اختیار کرنے کا کوئی پس منظر نہ ہو۔ مگر سمیع اللہ اور کامل کے درمیان ایک ... لطیف کا وجود ہے جس نے سمیع اللہ کو کامل بنا دیا۔ ورنہ اس بات کا امکان اور قوی امکان تھا کہ یہ سمیع اللہ صرف سمیع اللہ ہی رہتے۔ اس موقع پر حسرت کا یہ شعر پڑھنا ناموزوں نہ ہوگا کہ ؎

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد   جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

کامل کے سلسلے میں بھی اس قدر شدت کے ساتھ نہیں سوچا جا سکتا ہے جس قدر شدت کے ساتھ حسرت نے حسن کی کرشمہ سازیوں کا ذکر کیا ہے۔ یہاں صرف نام اور تخلص کا حادثہ ہے جنون وخرد کا تضاد نہیں کامل ان کی محبوبہ دلنواز کا عطا کردہ نام ہے جسے تخلص کا پردہ بنا کر کامل نے کسی کی یاد کو لازوال بنا دیا ہے اور من و تو کا پردہ ہٹا کر وہ اور ان کی محبوبہ ایک ہو کر شعر و نغمہ کی صورت اختیار کرتے رہتے ہیں ـــــ۔

اس سے قبل اس بات کا اظہار کیا گیا ہے کہ کامل ۱۹۳۳ء میں دوسری بار بمبئی آئے چند ماہ یہاں رہے اور پھر چاندپور چلے گئے۔ تیسری بار ۱۹۴۵ء میں آئے اور پھر چلے گئے مستقل طور سے انھوں نے ۱۹۵۷ء سے بمبئی میں رہنا شروع کیا۔ گرچہ ۱۹۴۹ء ہی میں وہ ازدواجی زندگی سے منسلک ہوئے اور شریک حیات

محبوبۂ دلنواز کی صورت میں ان کے سامنے آئی محبت کسی سے ہو اور شادی کسی اور سے، تو یہ ازدواجی زندگی اکثر ناکام ہو جاتا ہے یا کافی مدت تک ایک کشاکش رہتی ہے۔ کامل ایسی قسم کے دور ابتلا اور آزمائش سے گذرے، مگر انھوں نے اپنی محبت اور عشق کی تمام قوتوں سے اپنی رفیقۂ حیات کا استقبال کیا اور اسے اپنی محبت کے تحفے سے نوازا۔ چند اشعار جو شادی ہونے سے قبل کامل نے کہے تھے یہاں پیش کئے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ ان کی شریکِ حیات محبوبہ کے روپ میں ان کے سامنے آئی ہے اور کامل ایک شوہر سے زیادہ عاشق کے روپ میں اس کی سرکار میں پہونچے ہیں —

اے رونقِ محفل دور نہیں وہ دن تجھے اپنا دیکھیں گے — ناکام تمنا کو کب تک ناکام تمنا دیکھیں گے

ایسا بھی کوئی دن آئیگا ہم ان کو سراپا دیکھیں گے — اور حسن کے رنگین جلووں کو شرمندۂ ایفا دیکھیں گے

ہے ان کے کرم کا یہ عالم جلووں کی نوازش ہے پیہم — یونہی جو رہی تقدیر بہم ہر روز تماشہ دیکھیں گے

وہ سامنے آئے بھی لیکن نظریں نہ اٹھیں لب ہل نہ سکے
مدت سے تمنا تھی کامل ہم حسن کو تنہا دیکھیں گے

کامل نے بہت دنوں تک اپنا کلام کسی کے سامنے بغرض اصلاح نہیں پیش کیا۔ البتہ ۱۹۵۲ء سے شکیل بدایونی سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ شکیل نے اصلاح دینے کے علاوہ انھیں بیرونِ بمبئی کے مشاعروں میں بھی شرکت کے لئے بھیجا۔ مگر یہ سلسلہ بھی زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکا کیونکہ یہ بمبئی شہر بھی بعض عجیب وغریب خاصیتوں کا حامل ہے۔ یہاں مصروفیات کی اس قدر ریل پیل رہتی ہے اور زندگی کا دھارا اس قدر تیز رو ہے کہ استاد اور شاگرد کے درمیان وہ تعلقات پیدا نہیں ہو سکتے جو آج سے نصف صدی پہلے یا اس سے بھی قبل ہوا کرتے تھے۔ نہ تو استاد اس قدر فارغ ہو کر بیٹھتے ہیں اور نہ شاگردوں کو پٹہ مار کر بیٹھنے کی فرصت ہوتی ہے۔ بس ہر وقت بھاگ دوڑ کا سماں رہتا ہے اور اسی میں کچھ کام کی باتیں ہو جاتی ہیں —۔

۱۹۵۷ء سے جب مستقل طور سے بمبئی میں انھوں نے رہنا شروع کیا اور ذریعہ معاش کی مستقل صورت پیدا ہو گئی اور انھیں قدرے سکون حاصل ہوا تو غزل گوئی کا ذوق جو ان میں پہلے سے موجود تھا ابھرا اور ان کی شعری صلاحیتیں ارتقا پذیر ہوئیں۔ کامل کی شعر وشاعری کا دوسرا دور دراصل ۱۹۵۸ء سے شروع ہوتا ہے اور بڑی شدت وقوت کے ساتھ سامنے آتا ہے وہ سیاسی اور مذہبی تحریکات سے

ہمیشہ مطلوب ہے یہاں تک کہ کسی قسم کا تاثر بھی انھوں نے قبول نہیں کیا۔ ان کی غزلوں کا رنگ خالص داخلیت کا رنگ ہے۔ ان کی تمام خارجی پریشانیاں، قلب کی گہرائیوں میں سما جاتی ہیں اور پھر وہاں سے شعر و نغمہ کی صورت میں نمودار ہوتی ہیں اسی لئے ان کی غزلیں تمام تر واردات قلبی کا رنگ پیش کرتی ہیں اور جو دراصل غم جاناں اور غم دوراں کا لطیف امتزاج ہوتی ہیں۔ اس سے قبل بھی اس بات کا اظہار کیا جا چکا ہے کہ کامل زمانے کے ہاتھوں کافی پریشان رہے ہیں اور اس نے اس میں یاسیت۔ سوگواریت اور تقدیر پرستی کا رنگ بھی پیدا کر دیا تھا مگر یہ ایک کیفیت تھی جو پیدا ہوئی اور ختم ہو گئی۔ مستقل روگ کی صورت اختیار نہیں کر سکی غم دوراں کے ہاتھوں نڈھال ہو کر کامل اسطرح کی باتیں کرنے لگے ہیں ۔

تجھ کو لے جاؤں نہ اے دلِ ناکام کہاں   زندگی جبر مسلسل ہے تو آرام کہاں

مجھکو خوشی نہ مل سکی کیوں تری کائنات میں   کیا میری زندگی نہ تھی تیرے مشاہدات میں
بخت میں روز اولیں لکھدیا رنج دائمی   مجھ سے بھی پوچھ کچھ نہ کی تیرے معاملات میں

اس آخری شعر سے کامل کی خودی کی بیداری کا اندازہ ہوتا ہے وہ اپنے معاملات کی انفرادیت اور اہمیت کے قائل ہیں۔ شکوے میں جرأت بھی ہے اور انانیت کا رنگ بھی۔ لیکن تمام انانیت اور خودداری کے باوجود مجبوری کا احساس ہو ہی جاتا ہے۔ کامل نے بھی اپنی مجبوری محسوس کی ہے یعنی ان کی خودداری کی آواز کے پس پردہ مجبوری کا احساس بھی ملتا ہے۔

کامل کی جمال پرستی۔ بڑی گہری، سنجیدہ اور صحت مند ہے۔ ان کا یہ جمالیاتی ذوق اپنی بنیاد میں اسی نغمہ اور ترنم کا مرہون منت ہے جو جان کامل ہے۔ کامل کو ہر حسین شے متوجہ اور متاثر کرتی ہے ان میں سنگیت کا رس بھی ہے پھولوں کا حسن بھی ہے مناظر قدرت کے دلکش نظارے بھی ہیں۔ جنس لطیف کی رعنائیوں سے وہ بڑی صحت مند حد تک متاثر ہوتے ہیں اور ڈوب کر تاثر قبول کرتے ہیں۔ وہ حسن کو قلب کی اتھاہ گہرائیوں میں سمو لیتے ہیں۔ یہ دراصل کامل کی شخصیت کی سنجیدگی

اور صحت مند نظریہ حیات کا ثبوت ہے جس طرح موسیقی سے زندگی کے ابتدائی دور ہی سے انھیں دلچسپی تھی۔ اسی طرح حسن و جمال کی جاذبیت اور کشش کا غیر جنسی احساس بھی اسی دور میں پیدا ہو گیا تھا۔ دور شباب میں سنگیت نے غزل کا روپ دھار لیا اور جمال پرستی محبوبہ دلنواز کا صورت لیے کر اشعار میں نمودار ہوئی۔ ساحل نے ایک نظم "بچپن کے حسین لمحے" بھی لکھی۔ نیا زاویہ نگاہ پیدا کیا ہے انھیں بچپن کے حسین لمحات میں کھیل کود اور بے فکری کے لمحات یاد نہیں آتے بلکہ وہاں بھی انھیں حسن پرستی کا شعور کارفرما نظر آتا ہے ؎

بچپن کے حسین لمحے

وہ ہاتھوں میں مہندی رچانا کسی کا ۔ وہ مہندی رچا کر دکھانا کسی کا

کبھی دیکھ کر مسکرانا کسی کا ۔ چڑا کر کبھی بھاگ جانا کسی کا

کبھی دور ہی سے وہ انجان بن کر ۔ مجھے دیکھنا اور نہ آنا کسی کا

کبھی ڈھونڈھنا مضطرب ہو کے مجھکو ۔ وہ چھپنا مرا اور نہ پانا کسی کا

کبھی کھیلنے کے لئے ساتھ میرے

وہ آنے سے حیلہ بہانا کسی کا

ساحل جذبہ کی صداقت کے قائل ہیں، صرف وہی بات کہتے ہیں جسے محسوس کرتے ہیں۔ ان کے یہاں تنوع ہے یعنی محبوب کا غم بھی ہے اور خوشی کی تمنا بھی، گردش دوراں کی شکایت بھی ہے۔ اور وطن کی یاد بھی۔ عزم و استقلال کی باتیں بھی ہیں۔ اخلاقی پہلو بھی ہے اور غم کا عرفان بھی محرومی قسمت، جنون، فریب آرزو۔ زلف پریشاں، انسان۔ تقدیر، خستگی اور پریشانی، شب فراق، حسن۔ دل۔ مادیت۔ وسعت قلبی۔ بے چارگی۔ ساقی۔ زنداں، قفس۔ صیاد۔ آمد بہار۔ مے نوشی۔ معاشی پریشانی۔ جبریت۔ دنیا، غرض جلوۂ صد رنگ ہے۔

شاعری دراصل شاعر کے مختلف کیفیات قلبی و ذہنی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اور مختلف تجربات و مشاہدات کی عکاسی۔ کبھی متضاد جذبات بھی پیدا ہوتے ہیں مگر وہ ہر کیفیت میں شعر کہتا ہے۔ اس حالت کی تصویر اس طرح ملتی ہے کہ ؎

کبھی غنچہ غنچہ پہ جاں فدا ۔ کبھی گلستاں سے غرض نہیں

مجروح کے اس شعر میں اس کیفیت کو دیکھئے ؎

کبھی نظر بھی اٹھائی نہ سوئے بادۂ ناب ۔۔۔ کبھی چڑھا گئے پگھلا کے آبگینوں کو

درامل یہ ہے کہ غزل کا شاعر کسی بات کو عقلی دلائل کے ساتھ ہمارے سامنے پیش نہیں کرتا بلکہ محسوسات جو مختلف حالتوں اور وقتوں میں مختلف رنگوں میں اس کے یہاں پیدا ہوتے ہیں اور مختلف موڈ کرتے ہیں انہیں کو وہ شعری جامہ پہناتا ہے۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے۔ کہ شاعر جس موڈ میں ہوتا ہے رنگ میں تاثر قبول کرتا ہے۔ اس دنیائے رنگ و بو میں جذبات کی کیفیتوں کو متبدل نہ ہونے دینا معجزہ ہے۔ ان خیالات کے پیش نظر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ غزل گو کن کن حالتوں میں کس انداز متاثر ہوتا ہے اور کس رنگ میں یا کس انداز میں وہ اپنی باتیں پیش کرتا ہے ۔۔۔۔۔

ساحل کو ابتدا میں عشق، روزگار اور غریب الوطنی نے آگھیرا اور تینوں سے ان کو غم کے سوا کچھ نہ ملا انھوں نے غم کو بھی مخاطب کیا۔ غم کی بنیاد پہ ساحل نے دل کو بھی مخاطب کیا کیونکہ وہی مرکز تھا تمام ان کی پامالی کا۔ عشق میں مجبوری و ناکامی، سوز و گداز کے ساتھ محبوب کی یاد بھی ہزاروں انداز سے پیش ہیں۔ روزگار کی تلاش میں سرگردانی اور پریشانیوں سے سابقہ پڑا اور غریب الوطنی کی کیفیات! غریب الوطن سے پوچھئے۔ مجبوری محبوب نے ساحل کو غم سے محبت کرنا سکھایا۔ ان کا غم ایک روگ نہیں ایک صحت مند جذبہ ہے یہی وجہ ہے کہ وہ قنوطیت کی بجائے رجائیت کی طرف مائل ہوتے ان کو غم کا بڑا گہرا عرفان حاصل ہوا ہے۔ غم سے ان کو پیار ہے۔ یہ ان کے لئے بڑی عزیز شے ہے ان کی زندگی ہے۔ اسی غم سے ان میں ابھرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی ہے۔ اسی غم نے ان کے قلب و ذہن میں ایک روشنی پیدا کر دی ہے بلکہ اسی غم نے ساحل کو ساحل بنا دیا ہے غم کے صحت مند تصور حالی بھی قائل تھے۔ انھوں نے کہا ہے کہ ؎

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے ۔۔۔ ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

ساحل غم کی قوت سے آگاہ ہیں۔ وہ اس انداز سے اس کا اظہار کرتے ہیں ؎

غم اگر سہہ لیا آدمی نے ۔۔۔ آ گئے زندگی کے قرینے

رخ جو بدلا تری بے رخی نے ۔۔۔ غم کو آواز دی زندگی نے

ستم، عشق، روزگار اور غریب الوطنی کا آورد ہ ہے ؎

بھلا ہوا اس کشمکش کا کامل کیا ہے آگاہ راز جس نے کہ وہ لقیدِ حیات کب ہے جو مبتلائے الم نہیں ہے

ہو کس زباں سے ترا شکریہ اے دوست مجھے وہ دردِ عنایت کیا جو عام نہیں

ترے غم سے وہ تازگی مل گئی ہے کہ جیسے نئی زندگی مل گئی ہے

ہر لفظ کتابِ ہستی کا پُر درد فسانہ ہے گویا جس میں نہ ہو غم کی تصویریں، تقدیر کا کوئی باب نہیں

غم ہی غم چاہئے راحت مجھے درکار نہیں میں تری چشمِ عنایت کا طلب گار نہیں

ترے نثار مجھے اضطرابِ پیہم دے کبھی کبھی کے جو غم ہیں گراں سے گذرے ہیں

کامل کا غم اپنے اندر مختلف shades رکھتا ہے۔ مگر وہ غم جسے یہ قوت اور عین زندگی سمجھتے ہیں سب سے اعلیٰ ہے اور یہ دراصل غمِ محبوب ہے ویسے ان کی شاعری میں غمِ روزگار بھی ہے۔ آرزوؤں کی پائمالی کا بھی غم ہے اور اس میں تنوع بھی ہے اور تضاد بھی۔ ہماری غزل میں جبکہ ہماری عشقیہ زندگی کی ایک ٹریجڈی رہی ہے کہ محبوب کے ساتھ غم بھی آتا ہے اور جب محبوب رخصت ہو جاتا ہے تو غم چھوڑ جاتا ہے۔ کامل کو بھی محبوب ملا اور غم دے گیا ؎

تری توجہ کا حاصل کبھی کبھی میں نے غموں کو جھیل لیا ہے خوشی خوشی میں نے

منزل کی صعوبت ہجر کا غم اور اس پہ ستم بالائے ستم
ہم آئے تھے کامل جن کیلئے وہ ہم سے ہی پردہ کر بیٹھے

کبھی آئے تو ہوتے پرسشِ غم کے بہانے سے سمجھتا ہیں محبت اور محکم ہوتی جاتی ہے

آ گئی ہے یاد ان کی شام سے رات گذرے گی بڑے آرام سے

مری بلا سے زمانہ خوشی نہ دے کامل تمہارا غم ہے سلامت تو مجھ کو غم کیا ہے

اردو غزل میں عاشقوں کا یہ شیوہ رہا ہے اور محبوبوں کی جفاؤں کا وہ عالم عشق بقول جگر ؎
"اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے" مگر یہ آگ کا دریا عاشقوں ہی کے حصہ میں آتا ہے
اور یہ محبوب ہی کا پیدا کردہ ہوتا ہے، محبوب کیلئے صرف محبوب ہونا ہی کافی ہے۔ اس کی چاہت
اور طمانیتِ قلب کے ہزاروں سامان عشاق فراہم کرتے ہیں۔ کامل کو بھی ایسا ہی محبوب ملا جس نے
غموں کو خوشی خوشی جھیلنے کا قرینہ سکھایا۔ انھیں غم محبوب کے علاوہ اور کسی شے کی حاجت نہیں۔

ان کے یہاں غمِ روزگار اور گردشِ زمانہ ایک دوسرے کے پابند ہیں۔ مشرقی ممالک اپنی
بے روزگاری اور اقتصادی پریشانیوں کی آماجگاہ ہے۔ اس نے ہزاروں اور لاکھوں انسانوں
کی زندگی میں تلخیوں کا اضافہ کیا ہے۔ یہاں محنت اور جفاکشی کا پورا صلہ بھی نہیں ملتا۔ ایسے
افراد جو شعری صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں وہ تلاشِ رزق کی تلخیوں کا اظہار کر لیتے ہیں۔ مگر
ایسی لاکھوں تلخ حقیقتیں ہیں جو سینوں میں دب کر رہ جاتی ہیں۔ فن کار کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے
تلخ تجربات کو عوام کی تلخیوں میں ملا کر پیش کرے جس سے ہمہ گیریت کا رنگ پیدا ہوتا ہے
گردشِ روزگار اور غمِ معاش سے کامل مغلوب نہیں ہوئے البتہ گلہ ہے گلہ ہے یاسیت پیدا
ہوتی ہے مگر ناپائیدار گردشِ دوراں کے مظالم کو کامل نے احسان جانا ہے جس کی وجہ سے
احساس کی تلخی شدید ہو گئی ہے۔

بڑا اچھا کیا خود ہی سہارا دے دیا تو نے ۔۔۔ نہیں تجھ کو تلاش اے گردشِ دوراں کہاں کرتے

چھوڑا نہ مرا ساتھ کبھی بھول کے تو نے ۔۔۔ اے گردشِ دوراں ترے احسان بہت ہیں

چھوڑ گئے ہیں ایک اک کر کے ہمدمِ دیرینہ کامل ۔۔۔ لیکن ایک رفیقِ تنہا گردشِ دوراں باقی ہے

نگاہِ گردشِ دوراں کے صدقے ۔۔۔ جو لاکھوں میں مجھے پہچانتی ہے

دور تک روشنی کا نام نہیں ۔۔۔ لائی اے گردشِ حیات کہاں

ہو جاتے

تری نوازش انھیں مبارک جنھیں کوئی اور غم نہیں ہے ‏ نہ چھیڑ اے گردشِ زمانہ مرے کلیجے میں دم نہیں ہے

اک دشوار ہوئی جاتی ہے اب راہِ حیات ‏ پھر مجھے گھور رہا ہے غمِ دوراں اے دوست

گردشِ دوراں کی پے بہ پے یورشیں یاسیت یا تقدیر یا جبرِ مشیت کے خیال کو پختہ کرتی ہے اور انسان کے ہاتھ سے قوتِ عمل کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔ مگر کامل کے یہاں ایسے خیالات ملتے ہیں جو گردشِ زمانے کے ہاتھوں پیہم پستے رہنے کا ایک لازمی ردِ عمل ہیں ——— ۔

نہ آسکیں مری دنیا میں چاندنی راتیں ‏ نہ مٹ سکے مری تقدیر کے یہ خانے

میں کہاں چشمِ التفات کہاں ‏ میری تقدیر میں یہ بات کہاں

اک گھڑی تیرے شبستاں میں گذرتی اے کاش ‏ یوں بھی اک دن مری تقدیر سنورتی اے کاش

کامل نے صیاد قفس اور آشیانے کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے مگر اسی انداز میں جس کی طرف غالب نے اشارہ کیا ہے کہ

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام ‏ بنتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

کامل کے یہاں صیاد دراصل ایک ایسا تصور ہے۔ ایک ایسے ماحول اور ایسی فضا یا ایسے غاصبانہ اور ظالمانہ طریق زندگی کا نام ہے جس نے کامل کو غریب الوطن بنایا اور خورد و نوش کے حصول کیلئے شہر شہر کی خاک چھنوائی۔ صیاد یہاں نہ کوئی کردار ہے نہ روئے سخن کسی کی جانب ہے بلکہ غیر مساویانہ تقسیم دولت نے جو جبر و تشدد کی فضا قائم کی ہے وہ صیاد کے روپ میں کامل کے یہاں آتا ہے ——— ۔

قفس میں قید ہوں ناقابلِ پرواز بے پر ہوں ‏ مگر صیاد کی اب بھی نگہبانی نہیں جاتی

یہ معاشی پریشانی کی تصویر ہے۔ مراد یہ ہے کہ انتہائی زبوں حالی ہے مگر صیاد یعنی معاشی نظام حیات اور زیادہ زبوں حالی کے درپے ہے۔ یہ معاشی تہید ستی تصور ہے جو کامل کے ذہن میں شعوری یا لاشعوری طور پہ بار بار نئے زاویے سے ا

کرآتا ہے ساحل اس تصور سے ایک منٹ کیلئے نجات حاصل نہیں کرسکتے تھے معاشی پریشانی ان کے تحت الشعور میں اس قدر رچ بس گئی ہے کہ اس سے فرار گویا حقیقت سے انکار کرنا ہے اور ساحل حقیقت سے انکار کرنا نہیں چاہتے ۔۔۔۔

قفس میں بیٹھ کے روتے تھے آشیانے کو ۔۔۔ چمن میں آئے تو پھرتے ہیں دانے دانے کو

ساحل محبت اور عشق کی سنگینیت کے قائل ہیں۔ محبت کے لطیف اور اعلیٰ جذبہ پر جنسیت کا پلیتھن نہیں پڑا ہے۔ اسی لئے پاکیزگی کا رنگ ملتا ہے محبت کا جذبہ ان کی زندگی میں روشنی پیدا کرتا ہے۔ وہ صمیم قلب سے محبت کرنے کے قائل ہیں۔ ان کی محبت میں بڑی ثابت قدمی اور توانائی ہے۔ وہ محبت کی قدر کرتے ہیں اس راہ محبت کی تیاری کرتے ہیں اور جگر کے ہم خیال ہیں کہ "آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے"۔۔۔

ترا شکریہ اے نگاہِ محبت ۔۔۔ اندھیرے میں اک روشنی مل گئی ہے

دشوار سہی لاکھ محبت کے مراحل ۔۔۔ ہم باندھے ہوئے رخت سفر ہیں کہ نہیں ہیں

عشق کی راہ آسان نہیں ہے اس میں ہر غم اٹھانا پڑے گا

اس میں دل بھی لٹانا پڑے گا اور گھر بھی جلانا پڑے گا

محبت میں ابھرنا ڈوب کر ممکن نہیں ساحل ۔۔۔ یہ وہ دریا ہے جسمیں ڈوب جاتے ہیں سہارے بھی

ساحل وطن کے اعتبار سے صرف اس جگہ کو پیش کرتے ہیں جہاں پیدا ہوئے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ بنیادی اور فطری جذبہ وطنیت یہیں سے پیدا ہوتا ہے۔ سیاسی وطن کچھ اور ہوتا ہے۔ مگر ابتدا میں وطن صرف جائے مولد ہی کو کہتے ہیں۔ اسی کی یاد غریب الوطنی میں انھیں ستاتی ہے۔ ساحل کو تلاشِ معاش میں وطن چھوڑنا پڑا۔ وطن سے دور اور پردیسیت کی پریشانیوں میں مبتلا ہو کر وہ وطن کو مختلف انداز سے یاد کرتے ہیں۔ انھیں وطن سے بے پناہ الفت ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر خورد و نوش کا سامان وطن ہی میں ہوجاتا

تو وہ اس قدر دور آکر کیوں پڑے رہیں ؂

وطن سے جاکے نہ لوٹیں ہم عمر بھر کامل ۔۔۔ اگر قرار میسر ہو آب ودانے کو

اجل تیرا برا ہو تجھکو بھی غربت میں آنا تھا ۔۔۔ وطن کی خاک میں ملتے تو خود کو جاوداں کرتے

نکالوں آنکھوں سے رک جاؤ قافلے والو ۔۔۔ ملے گی پھر مجھے خاکِ وطن کسے معلوم

زمانہ ہو گیا غربت میں اب چلو کامل ۔۔۔ بھلا نہ بیٹھے ہوں اہلِ وطن کسے معلوم

یہ اشعار بڑے حقیقی جذبے کے حامل ہیں۔ غریب الوطنی کی موت ایسی ہی ہوتی ہے۔ وطن کی موت میں اس بات کا اطمینان رہتا ہے کہ بعد دفن بھی عزیز و اقارب قبر کی زیارت کو آتے رہینگے اور پشتہا پشت تک قبروں کے نام و نشان باقی رکھے جائیں گے ؂۔

کامل نے معاملاتِ دل کی طرف بھی کافی توجہ کی ہے اور مختلف پہلوؤں سے ہمارے سامنے اسے پیش کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آج کا دور ذہن کا دور ہے لیکن اس طرح بھی نہیں کہ دل کی اداکاری ختم ہو گئی ہو۔ آج بھی دل کے کارناموں سے دنیا خالی نہیں ہے آرزوئیں آج بھی ہیں تمنائیں آج بھی مچلتی ہیں۔ ارمانوں کا آج بھی خون ہوتا ہے۔ آج بھی محبت کی جاتی ہے۔ آج بھی ناکامی اور کامیابی سے دل ملول اور شادماں ہوتا ہے۔ آج بھی ہماری زندگی میں دل کی حکومت ہے آج بھی جذبات کی دنیا ہے اور حقیقت یہ۔ دنیا کی کل جذبات ہی سے چل رہی ہے یہاں کامل کا دل اور جلوۂ ہزار رنگ ملاحظہ کیجئے ؂۔

کوئی عشق سے گلہ ہے نہ کچھ حسن سے شکایت ۔۔۔ مجھے دے دیا ہے دھوکا دلِ صبر آزما نے

ہم ان کا تماشا کیا کرتے اپنا ہی تماشا کر بیٹھے ۔۔۔ دل پر بھی ہمیں قابو نہ رہا اور خود کو بھی رسوا کر بیٹھے

تجھکو لے جاؤں بتلائے دلِ ناکام کہاں ۔۔۔ زندگی جبر مسلسل ہو تو آرام کہاں

مجھے دل کا گماں ہوتا ہے کامل ۔۔۔ گر آوازِ شکستِ جام آئے

اے دل پائمال سہنے دے   اب تو ان کا خیال رہنے دے

ہر اک شے سے بیگانہ تھا، دل کیا تھا اک ویرانہ تھا
تم جب سے نظر میں آئے ہو کچھ اور ہی دل کا عالم ہے

ہوں عجیب کشمکش میں دلِ بدگماں کے ہاتھوں   ابھی ان پہ معترض تھا ابھی مجھ پہ نکتہ چیں ہے

یوں تو سینے کو زمانے کا الم ملتا گیا   دل کی مرضی جب ہوئی جب تیرا غم ملتا گیا

ہر روز بنے گا تماشا سرِ محفل   یہ دل ہے تو رسوائی کے ساماں بہت ہیں

پھر آتا ہے ذرا سی بات پر یہ دل کی فطرت ہے   بھلا ہم کس طرح اس غمزدہ کو شادماں کرتے

کامل نے اپنے کلام کے ذریعے اپنی اور اپنے محبوب کی بڑی واضح تصویر پیش کی ہے۔ محبوب کے بعض نفسیاتِ ذہنی اور قلبی کا بڑی جسارت کے ساتھ جائزہ لیا ہے اور اپنی کیفیت کو بھی بڑی جرأت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کامل کو اپنے عشق پر کافی اعتماد ہے اور وہ اپنے کلام میں اس اعتماد کا اظہار کرتے رہتے ہیں ــــ ۔

وہ لاکھ مجھ سے برہم ہوتے دل کو یہ یقیں ہے   کہ مرے بغیر دیکھے تمہیں چین بھی نہیں ہے

آج ان کی بھی آستیں نم ہے   ہائے دل کی لگی کو آگ لگے

ہائے کیا سلیقہ ہے ہائے کیا قرینہ ہے   جس پہ اک نظر ڈالی دل خوشی سے ہار آیا

سنتا ہوں کہ وہ مجھ پہ مہرباں بہت ہیں   یہ سچ ہے تو بربادی کے امکاں بہت ہیں

وہ کہتو سے ہیں کہ نباہیں گے محبت　　کس طرح یقیں آئے کہ ناداں بہت ہیں

وہ لاکھ احتیاطِ محبت کے باوجود　　جب میرا نام آیا تو شرما کے رہ گئے

جو گذرتی ہے مرے دل پہ تری فرقت میں　　یہ قیامت ترے دل پہ بھی گذرتی اے کاش

یہ کیا ہوا کہ تم نے ہو مسکرانے کو　　تمہیں تو کھیل سمجھتے تھے دل لگانے کو

کچھ اس ادا سے وہ میرا سلام لیتے ہیں　　کہ جیسے مجھ سے کوئی انتقام لیتے ہیں

ترو جفا کے تصدق ترے ستم کے نثار　　کہ اب کرم کی توقع ہی چھوڑ دی میں نے

کامل اپنی شخصیت اپنے ارادے اور اپنی خواہشات کی مختلف تصویریں اپنے اشعار میں پیش کرتے رہتے ہیں۔ انھیں کبھی خاروں سے الفت ہے۔ کبھی ان پر عالم بے خودی طاری رہتی ہے۔ کبھی رہ محبت میں اپنے آپ کو بالکل بیا سمجھتے ہیں کہیں غم عاشقی سے دامن بچانا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ کبھی یاس وامید کے دریاں جیتے ہیں کبھی غم میں ڈوب کر فخر یہ انداز میں مسکراتے ہیں۔ کبھی ارمانوں کی میت دوشِ نازک پہ لئے پھرتے ہیں کبھی خوگرِ غم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور کبھی خوشی کی وجہ سے طبیعت کے بدمزہ ہونے کا اعلان کبھی انتظار محبوب میں عمر رواں سے چھوٹ جاتے ہیں۔ کبھی اپنی عالم بے خوابی کے گلہ مند ہوتے ہیں اور اس بات کے خواہشمند ہوتے ہیں کہ کوئی ظالم محبوب کی نیندیں بھی اڑا دے تاکہ اسے اندازہ ہو کہ عشاق راتیں جاگ کر کس طرح بسر کرتے ہیں۔ محبوب کا احترام بھی اور جذبۂ انتقام بھی غرض ایک دل اور ہزار افسانے ۔

ستمگری کا گلہ نہیں ہے نوازشوں پر نظر نہیں ہے　　میں آج کل کس مقام پر ہوں مجھے خود اسکی خبر نہیں ہے

پھول چھوڑے ہیں تمہارے لئے تم چن لینا　　ہم نے تو خار سجا رکھے ہیں گلدانوں میں

پرچوں پہ ترے آکے عجب وقت پڑا ہے!

شمس صفوان

کسی نے اپنے دوست سے کہا تھا کہ "یار میں بہت موٹا ہوتا جا رہا ہوں، چاہتا ہوں اپنے موٹاپے میں کچھ کمی کر لوں!" دوست نے مشورہ دیا۔ "رسالہ نکالو۔ خود بخود اتنے ہڑبڑیں جاؤ گے، زیادہ دن نہیں لگیں گے، موٹاپا تو موٹاپا صحت سے بھی چھٹکارا مل جائے گا۔" جی ہاں رسالہ بازی کا ایسی ہی یقینی دوا ہے!

دراصل بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں کتابیں بہت کم لکھی جاتی ہیں اور جو لکھی جاتی ہیں ان کے لئے بھی چھپنے کی نوبت مشکل سے آتی ہے۔ اور جو چھپ جاتی ہیں ان کے لئے پڑھنے والے مشکل سے ملتے ہیں۔ البتہ رسائل کی تعداد، ہمارے یہاں ہمیشہ زیادہ رہی ہے۔ کتابوں کی بہ نسبت رسائل پڑھے بھی زیادہ جاتے ہیں اگرچہ یہ رسائل زیادہ فروخت نہیں ہوتے ہم نے تعجب یہ ہوتا ہے کہ جس مال کی زیادہ نکاسی نہیں — وہ لوگوں کے گھروں میں کیسے پہنچ جاتا ہے۔

بات کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اردو پڑھے لکھوں میں ہر تیسرا فرد شاعر اور ہر چوتھا افسانہ نگار ہوتا ہے۔ چنانچہ جب کسی پڑھے لکھے کی شامت اعمال سے کوئی رسالہ عالم وجود میں آتا ہے۔ تو ہر اردو شاعر اور افسانہ نگار کے لئے یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس رسالے میں اپنی تخلیق شائع کروائے اور پھر ہر شمارے کی تازندگی اعزازی کاپی حاصل کرتا رہے۔ اطلاع کیلئے عرض ہے کہ دوسری زبانوں کے اکثر رسائل اپنے لکھنے والوں کو اعزازی کاپی نہیں بھیجتے اور حد تو یہ ہے کہ ٹائمز آف انڈیا اپنے ایڈیٹر کو بھی مفت کاپی نہیں بخشتا۔ دوسری زبانوں کے رسائل اور اخبارات ایسے نامور قلم کاروں کے

مضامین شائع کرتے ہیں جن کی تخلیقات کسی بھی صورت میں ایڈیٹر کو بہ نظر اصلاح دیکھنے پر مجبور نہیں کرتیں۔ ایسے جرائد نو سکھیوں کو مستند قلم کار بنانے کا ٹیڑھا کام بھی اپنے ذمے نہیں لیتے اردو حلقوں میں ایسے لوگوں کی تعداد بھی کافی ہوتی ہے جو پڑھے لکھے تو کم ہوتے ہیں لیکن ادیب یا شاعر کے قدردان زیادہ (وہ اپنے شاعر یا ادیب دوست کو ایڈیٹری کا بُرا وقت آنے سے قبل اکثر چائے پلاتے ہیں کبھی کبھی کھانا کھلاتے ہیں، سنیما دکھاتے ہیں اور بعض اوقات اس کمرے کا ایک دو ماہ کا کرایہ بھی خود ادا کرتے ہیں جس میں ان کا ادیب یا شاعر دوست رہتا ہے) غرض کہ وقت پیغامبری میں ساتھ دینے والے اپنے دوست کے ایڈیٹر ہونے پر "قرض حسنا" کی صورت میں اعزازی کاپی کے جائز خواہش مند بن جاتے ہیں — آدمی محض آدمی ہو یا ایڈیٹر، زندگی میں جان پہچان تو ہو ہی جاتی ہے۔ چنانچہ جیسے ہی رسالا جاری کرنے کا منصوبہ اس کے ذہن میں جنم لیتا ہے رسالے کا خالق اپنے با مذاق اردو دوست واقف کاروں، شناساؤں اور آمنے سامنے والوں کے ناموں کی ایک طویل فہرست بھی تیار کر لیتا ہے لیکن پہلے شمارے کی کاپی لے کر جب ان کے سامنے پہنچتا ہے۔ تو وہ کاپی لے کر دعائیں دیتے ہیں لیکن رسالے کا سالانہ چندہ نہیں بخشتے۔ زیادہ سے زیادہ چندے کا وعدہ اور رسالا پابندی سے بھیجنے کی ہدایت کر دیتے ہیں۔ نتیجے میں رسالا ان کے حضور میں ہمیشہ بھیجا جاتا ہے لیکن ان کا منی آرڈر رسالے کی جو کھٹ پر کبھی نہیں پہنچتا۔ اکثر یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ اپنے ایڈیٹر دوست کے سامنے بازار میں دوسرے ایڈیٹروں کے رسالے تو خریدتے ہیں لیکن اپنے دوست کا پرچہ کبھی نہیں خریدتے۔ اکثر اردو رسائل اس لئے شائع کئے جاتے ہیں کہ شائع کرنے والوں کو واہ، واہ کا ہوکا ہوتا ہے۔ اس لئے نامور قومی راہ نماؤں سرکاری عہدیداروں اور متبرک جیسی ہستی رکھنے والے عالموں کو سر مہ سفت کی طرح پیش کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے قومی کاموں سے اپنے پیشے کی ذمہ داریوں سے اور علم و ادب کی خدمت سے فرصت پاکر اگر ایڈیٹر یا رسالے کی زندگی میں ایک بار بھی تکلف سے فرما دیں کہ "جب نوجوان اردو کی خدمت کرتے ہیں تو مجھ کو خوشی ہوتی ہے!" تو سمجھئے کہ ایڈیٹر کی زندگی سپھل ہو جاتی ہے۔ اور وہ چند مزید فاقوں کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیتا ہے — پہلا شمارہ شائع ہونے پر دوسرے رسائل اور اخبارات (تبادلے پر یا قیمت دے کر) میں اپنے اشتہارات اس لئے شائع کرائے ——————

جاتے ہیں کہ ایجنسیاں قائم ہوں اور سالانا خریداری بڑھے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ نہ خاطر خواہ ایجنسیاں قائم ہوتی ہیں اور نہ سالانا خریداری میں اضافہ ہوتا ہے۔ بلکہ مفت نمونہ طلب کرنے والوں کے خطوط۔ کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ ارادہ، دہ قسمیں کھائی جاتی ہیں اور خریدار بننے کا یقین دلانے کیلئے ایسے ایسے ڈھنگ سے اللہ رسول کو درمیان میں لایا جاتا ہے کہ نمونہ بھیجنے والا ایڈیٹر کو اپنا ایمان خطرے میں نظر آنے لگ جاتا ہے پھر نمونہ منگانے والا ہونا یا کر ایسی تان کر سوتا ہے کہ ہزار جگائیے نہیں جاگتا اور پھر نمونہ منگانے والوں ، میں بھانت بھانت کے لوگ ہوتے ہیں ، چھپن پان والے سے نزہت جبین تک ، طالب رحمان طالب علم درجا سات سے محمد فاضل ہیڈ ماسٹر تک سب کو اس سلسلے میں باذوق دیکھا گیا ہے۔ غیر یہی نہیں بلکہ کئی کئی بار کئی کئی ناموں سے اور مختلف پتوں پر نمونا منگانے والے ہمارے ملک میں موجود ہیں۔

اردو رسائل کے ریڈر شپ بڑھانے والے کچھ اور مہربان بھی ہیں ، یہ مہربان عوامی لائبریریوں کے نام سے اپنے محلوں میں بھکڑ بازی کے لئے کلب قائم کئے رہتے ہیں ان کلبوں میں کیرم اور تاش کھیلا جاتا ہے ۔ اور کبھی کبھی اخبارات اور رسائل بھی پڑھے جاتے ہیں کیرم اور تاش کی خریداری پر پیسے خرچ کئے جاتے ہیں اور رسائل کی خریداری پر صرف چھ چھ نئے پیسے کا ایک ایک پوسٹ کارڈ ، یعنی رسائل کے مالکان یا مدیران کو اردو زبان کی ترقی کا واسطہ دیکر اور سفارت خانوں کو عالمی اتحاد کا چرکہ دیکر زندگی بھر کے لئے مفت رسالا اپنے کلب کے نام جاری کرالیا جاتا ہے ۔ اور کلب کے ممبران اپنا جیب خرچ اغوائی غوغائی امریکی فلمیں دیکھنے - شکیلا بانو بھوپالی کی قوالی سننے ، ہر ماہ نئی طرز کی چست پتلون سلوانے اور ریڈی میڈ ہوائی بش شرٹ خریدنے پر صرف کرتے رہتے ہیں ۔ ایڈیٹر انٹرنیشنل سسٹم کا مفلس ہوتا ہے گو طبیعت اس کی سکندری ہوتی ہے ، لیکن حالات اس کو غالب مرحوم بنائے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے دوسرے رسائل پڑھنا تو چاہتا ہے لیکن خریدنے کی ہمت نہیں رکھتا ۔ چنانچہ وہ ملک کے ہر رسالے سے اپنے رسالے کا تبادلہ چاہتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رفتار رفتا خریداروں کی فہرست سے کہیں زیادہ طویل تبادلے کی فہرست

ہو جاتی ہے۔

غرض یہ کہ یہ وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر آج کے اردو رسائل فروخت کم ہوتے ہیں پڑھے زیادہ جاتے ہیں۔ یہ آج ہی کے دنوں کا رونا نہیں ہے بلکہ "مست قلندر" "مخزن" اور "زمانہ" کے زمانے میں بھی مدیران اپنے رسائل کے پڑھنے والوں سے خریدار بننے اور بنانے کے سلسلے میں بڑی بڑی دردمندانہ اپیلیں کیا کرتے تھے اور پانچ خریدار فراہم کرنے پر ایک مفت خریداری کا لالچ دیا کرتے تھے۔ یعنی اردو دوستوں کی یہ اردو دشمنی بہت پرانی ہے۔

اردو رسائل پر یہ جو زحمتیں نازل ہوتی ہیں یہ سب تو ایک طرف اور نیوز پیپر ایجنسی اور ایڈورٹائیزرس کی بخشی ہوئی برکتیں دوسری طرف۔ ان برکتوں کا پلا بہت بھاری ہے۔ ابتدا میں تھوڑی اشاعت کی بنا پر اردو رسائل کو بڑے بڑے تجارتی اداروں کے اشتہارات نہیں مل پاتے۔ رسالے کے مالک کو چھوٹے چھوٹے دکان داروں کے در پر جانا پڑتا ہے۔ ایسے دکاندار پبلیسٹی پر یقین رکھتے ہیں اخبارات میں اشتہارات بھی دے دیتے تھے۔ لیکن جب کوئی پڑھا لکھا آدمی اشتہارات کے سلسلے ان کے سامنے پہنچ جاتا ہے تو یہ اس کو دیکھ کر ایسے بھڑکتے ہیں جیسے سرخ کپڑے کو دیکھ کر جنگلی بیل بھڑکتا ہے۔ یہ بے عزتی اور حقارت کے وہ ڈھنگ ہیں اس پر رسالے ہیں کہ ایک پڑھے لکھے انسان کی توہین کر کے اپنے پچھلے کئی جنم کا بدلا چکاتے ہیں۔ پچیس پھیروں کے بعد اگر اشتہار دیتے ہیں تو بہت ہی معمولی نرخ پر اور ادائیگی کے وقت رقم پوری نہیں دیتے۔ یہ ریس کے گھوڑوں میں تو فرق کرنا جانتے ہیں لیکن رسائل میں فرق سمجھنے کی ان کو تمیز نہیں ہوتی۔ (ہر کلیے میں استثنا موجود ہے) آج اردو زبان جس دور سے گزر رہی ہے ان حالات میں اردو رسائل کو مسلم سرمایہ داروں اور مسلم تاجروں سے مدد کی توقع ہو سکتی ہے کیونکہ یہی ملک کی واحد زبان ہے جو حکومت وقت یا اکثریتی فرقے کے سامنے مسلم فرقے کی ترجمان ہے۔ اور مسلم فرقے میں سب سے زیادہ تاجروں کو اپنے تحفظ کی ضرورت ہے۔ لیکن حیرت تو یہ ہے کہ مسلم انگریزوں کے دور میں اتنے خائف

اتنے سہم ہوتے نہ تھے جتنے آج ہیں، دراصل مسلم صنعت کار اور تاجر اردو زبان بہ الفاظِ دیگر اردو جرائد کی سرپرستی نہ فرماکر اپنے حال اور مستقبل کو غیر محفوظ بنا رہے ہیں۔

رسالے کے کاروبار میں نیوز پیپر ایجنٹ ایک بہت ہی دلچسپ شے ہے۔ چاہے تو رسالے کو ابتدا ہی میں سلا دے یا قیامت تک زندہ رکھے۔ یہ وی پی منگاتا نہیں منگاتا ہے تو چھڑاتا نہیں۔ پہلے مہینے کے بعد رقم اس لئے نہیں بھیجتا کہ وہ بہت طویل ہوتی ہے اور اس کو منی آرڈر بھیجنے ہوئے شرم آتی ہے۔ دس شماروں کے بعد اتنی کثیر رقم ہو جاتی ہے کہ اس کو ادا کرنے کی اس میں ہمت نہیں رہتی، چنانچہ اچھے دامن کو اسطرح چھڑایا جاتا ہے کہ رسالے میں کیڑے ڈالے جاتے ہیں کہ صاحب پہلا شمارہ تو آپنے بہت زوردار نکالا تھا اور یہ دسواں نمبر تو گوڑ کے رکھ دیا ہے۔"

اس لئے گیارہویں شمارے تک دامن تار تار ہو جاتا ہے۔ اور رسالے کا مالک خط پہ خط لکھتا ہے جواب نہیں آتا، چونکہ محترم ایجنٹ پہلے ہی سے اتنے شہرت یافتہ ہوتے ہیں کہ اپنے پرچے میں ان کا نام بھی چھاپا جائے تب بھی وہ نہیں شرماتے جس مالک اخبار کو چند دیانت دار ایجنٹ (ملک میں ابھی چند دیانت دار ایجنٹ باقی ہیں) مل جائیں اسے خوش قسمت جانئے۔ ایک وبا اردو دنیا میں اور چلی ہے کہ وہ چھوکرے کہ جن کی غزلیں اور کہانیاں رسائل میں سیدھے سیدھے نہیں چھپ پاتیں وہ اپنے پسندیدہ رسائل کی ایجنسی لے لیتے ہیں۔ غزلیں چھپتی ہیں، ہر شمارہ کی چند درجن کاپیاں مفت گھر بیٹھے ملتی ہیں۔ فروخت کی جاتی ہیں، اور حساب دوستاں در دل!

آپئے ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈالکر دیکھیں آج کے زیادہ تر اردو رسالوں کا یہ حال ہے کہ اگر ایک کا سرورق دوسرے پر لگا دیا جائے۔ تو پڑھنے والوں کو کسی تبدیلی کا پتہ نہیں چلے گا رسالے فلموں کی طرح فارمولے کے مارے ہوئے ہیں۔ چند تنقیدی، مضامین، غزلیں، نظمیں اور افسانوں کے مجموعے کا نام "ماہنامہ گل تر" رکھ دیجئے۔ یا ماہنامہ بلبل۔ حالانکہ ہر ملک میں زبان کو محض ایک میڈیم سمجھا جاتا ہے اپنی باتیں کرنے کا ایک آلہ اس لئے

اگر اپنے پڑھنے والوں کو یہ بتایا جائے کہ اقبال کی شاعری میں کس حد تک فلسفہ تھا اور حالی پہلے تنقید نگار تھے یا نہیں تو کوئی مفید بات نہ ہوگی۔ حالات کا تقاضا تو یہ ہے کہ ترقی یافتہ ہوئے ممالک کے جرائد کی طرح یہ بتایا جائے کہ ایٹم کیسے بنتا ہے؟ آج کی عورت کے مسائل کیا ہیں؟ کون سی جنسی پیچیدگی اور کس نفسیاتی الجھن کا کیا حل ہے؟ اور منہ کا مزا بدلنے کیلئے ایک دو غزلیں یا ایک آدھ افسانہ جیسے کھانے کے بعد سویٹ ڈش۔ آج کے رسائل میں اول تو اداریہ ہوتا نہیں، ہوتا ہے تو اپنی مصروفیت یا بیماری کا رونا ہوتا ہے۔ یا اگر کسی موضوع پر فاضل مدیر قلم اٹھاتے ہیں تو اس حد تک محدود اور ایسے تیور کے ساتھ کہ معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے پھر جنم لیا ہے۔ اور ایک نئی یونیورسٹی تعمیر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جب کہ آج کی زندگی کے سامنے زندہ رہنے کیلئے ہزاروں مسائل ہیں، جن پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ ایسے جرائد کی تعداد بھی ہمارے ملک میں کافی ہے جو محض نعروں پر زندہ ہیں۔ یا پرانی قبروں کے مجاور ہیں یا ارباب سیاست یا ارکان حکومت یا سیاسی پیٹیوں یا غیر ملکی سفارت خانوں کے دم پر جا رہی ہیں۔ کسی تحریک یا ازم یا کسی سیاسی عقیدے سے انکار نہیں لیکن ادب یا زبان کو کسی ایک نظریے کا پابند کر دینا بھی مفید نہیں۔ اچھا معیاری اور دیرپا ادب حلقۂ شام و سحر سے آزاد ہوتا ہے اسے وقتی جذبات میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ مدیر کو کسی نہ کسی نظریے کا حامل ضرور ہونا چاہیے لیکن وہ اپنے پڑھنے والوں پر یہ زور نہ دے کہ وہ بھی اس کے ہم خیال بنیں۔ اس کے علاوہ وہ لوگ جو قلم کی آبرو سے نا واقف ہیں یا ترجمے کی منزل سے ادارت کی منزل پر پہنچ گئے ہیں ان میں یہ رجحان بڑھ رہا ہے کہ اخبار و رسائل "انڈسٹری ہے" مشن نہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جو چیز ذہنی کاوش کے نتیجے میں باہر آتی ہے وہ فن ہوتا ہے یا مشن انڈسٹری نہیں ہو سکتی۔ اگر اخبار محض انڈسٹری ہوتا تو روس اور امریکا جیسی قوتوں کیلئے قوموں کو تباہ کرنے اور جلا دینے کیلئے ایٹم کی قوت کافی تھی۔ نشر و اشاعت پر اتنا روپیہ خرچ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ دراصل اخبار و رسائل مشن بھی ہیں اور امانت بھی اور جو اس امانت کا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ وہ اسی کو انڈسٹری کہتے ہیں۔ اپنے جریدے

کی اشاعت بڑھانے کی کوشش ایک جائز کوشش ہے لیکن اس مقصد برآری کیلئے اس حد تک تاجر بن جانا بھی مناسب نہیں کہ ہر ممکن ذرائع اختیار کرلئے جائیں صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے برسر اقتدار ہستیوں سے ڈرنا اور مشتہرین کی ناراضگی کے خیال سے سہم جانا بھی مناسب نہیں بلکہ قلمی پیشے کی آبرو کے خلاف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک جریدہ جاری کرنا اور رسالے زندہ رکھنا دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔ اپنے پڑھنے والوں میں حکام بھی ہوتے ہیں، عام قارئین بھی، مشتہرین بھی اور کلاکار بھی اس لئے سکندر مرزا سے رمضانی تک کو خوش رکھنا ممکن نہیں کیونکہ ان سب کے اپنے مفادات آپس میں ٹکراتے ہیں لیکن یہ بات اگر سچ ہے اور عوام کے لئے کسی نہ کسی حد تک مفید ہے تو اس کو مدیر کی نوک قلم پر آنا ہی چاہیئے۔ یہ ذکر فخریہ نہیں ہے۔ بس بات سے بات نکلی ہے ان سطور کے لکھنے والے نے ایک فلم ایکٹر یس کی — خفیہ شادی کی خبر اپنے جریدے میں شائع کی تھی اگرچہ اس خبر کو راز رکھنے پر اس ایکٹریس کی جانب سے دس ہزار روپے۔ کی پیشکش کی گئی تھی لیکن یہ سوچتے ہوئے کہ دس ہزار روپے اپنے پاس جیل کے کھونسلے میں مانس کسطرح زیادہ دیر تک نہیں رہیں گے۔ اور ایک خبر راز نہیں بن سکی تو وہ تو قارئین تک پہنچنے کی چیز ہوتی ہے اس لئے شائع کردیگئی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایڈیٹر کو فلم کے ڈائرکٹر کی طرح ہونا چاہیئے۔ پردہ فلم پر مختلف اداکار بولتے ہیں ہنستے ہیں، ناچتے ہیں، گاتے ہیں۔ پیار کرتے ہیں، نفرت کرتے ہیں، آنسو بہاتے ہیں اور انسانی جذبات کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کی معمولی سی معمولی جنبش کے پیچھے ایک ذہن ایک شخصیت نظر آتی ہے یعنی فلم کے ڈائرکٹر کی ذات، یہی صورت حال رسائل کی ہو۔ تمام مضامین اور ان کی ترتیب کے پیچھے ایک سوچتا ہوا ذہن ایک دل دھڑکتا نظر آئے، لیکن بہت کم بلکہ ایسے رسائل نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جن میں چھپنے والی ہر سطر ان کے مدیران کی شخصیت کو پیش کرتی ہو سبب یہ ہے کہ ہمارے مدیران یا تو شاعر ہیں یا افسانہ نگار، زندگی کی ہر سطر میں جھلک جانے والا تو شاید کوئی نہیں!

اردو رسائل پر جو برا وقت آپڑا ہے اس کے پیش نظر ایک معاصر نے "انجمن ادبی

رسائل کے قائم کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ گو قلم کاروں کا یک جا ہو جانا ناممکن سمجھا جاتا رہا ہے لیکن پاکستان میں رائٹرز گلڈ بن جانے کے بعد اس بات کی توقع ہے کہ یہ ناممکن ممکن بن سکتی ہے لیکن یہ کون طے کریگا کہ کون سا رسالا ادبی ہے۔ اور کون سا غیر ادبی۔ آج کا ہر ادبی رسالا نام نہاد ادبی رسالا ہوتا ہے۔ ادھر آج کے رسائل سے تو ہر اردو رسالا دوچار ہے وہ ادبی ہو یا غیر ادبی۔ یہ ہر نوع اردو رسائل کی انجمن کا خیال نیک ہے۔

چنانچہ ایسی ہی کوئی انجمن وجود میں آتی ہے تو اس انجمن کے سامنے جہاں رسالا نا خریدار بنانے کی درخواست، اعزازی کاپی جاری کرنا، معاوضہ طلب کرنے والوں سے نمٹنا، کلیوں کے نام پیا بھیجنا۔ نئے لکھنے والوں کی تخلیقات قبول کرنا۔ نام ور اور ربتیہ ور قلم کاروں کو معاوضہ دے دینا۔ ایجنسیاں قائم کروانا۔ اشتہارات حاصل کرنا۔ سرکاری مراعات حاصل کرنا۔ اور نام نہاد ادبی رسائل کو اپنے مزاج میں تبدیلی کا مشورہ دینا جیسے مسائل آئیں اور ان کے حل تلاش کئے جائیں۔ وہاں اردو رسائل کی طباعت کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔

طباعت کے سلسلے میں اگر اردو رسائل تیر کے زمانے سے نکل کر ٹائپ اختیار کریں تو یہ بہتر ہے، کاتب اور لیتھو پریس کا پتھر دو ایسے روڑے ہیں جو اردو رسالے کو آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ ہر کاتب انہی اوصاف کا حامل ہوتا ہے کہ جن کا ذکر پیارے بزرگ راج (سمار) اور سنار کے سلسلے میں کیا کرتے تھے۔

اگر لیتھو سے نجات ناممکن ہے اور کاتب کو داغ مفارقت نہیں دیا جاسکتا تو فن کتابت کے سلسلے میں ایک اسکول کا قیام بھی ضروری ہے جہاں نوجوانوں کو علمی تعلیم کتابت کا ہنر اور اس پیشے کی تربیت دی جاسکے، دراصل کاتب بُرے نہیں ہوتے بلکہ تعلیم کی کمی، فن کا سینا بہ سینا ان تک پہنچنا اور صحیح کاروباری طریق کار سے واقف نہ ہونا کاتبوں کو بدحال بنا ہوتے ہے۔ اور ان کی بدحالی ہر زمانے میں مالکان و مدیران کو پریشان کئے رہی ہے۔

آج اگرچہ یہ حال ہے کہ اگر کسی مہذب شائستا اور اردو دوست جان کر پیدائت

کیا جائے کہ آپ نے پچھلے مہینے میں کتنی امریکی فلمیں دیکھیں؟ تو جواب ملے گا چار! کتنی بار قوالی سنی؟ جواب ہوگا دو بار! اور دوستوں کو چائے کتنی بار پلائی؟ جواب میں کہا جائے گا بہت سی بار۔ اور اردو رسالے کتنے خریدے؟ رسالے بھی خریدے جاتے ہیں! یہ تو ادھر ادھر سے پڑھنے کو مل جاتے ہیں! شان بے نیازی کے ساتھ برجستہ جواب ہوگا۔ لیکن اجتماعی طور پر مندرجہ بالا مسئلوں اور ان کے حلوں پر غور کر کے عمل کیا جائے، تو ایک مہینے میں چار امریکی فلموں کے چار ٹکٹ خریدنے والا اردو داں کم سے کم دو اردو رسالے بھی خریدنے پر مجبور ہوگا۔ اور اردو رسالے کی بڑھتی ہوئی اشاعت رسالے کی دوسری مشکلات بھی حل کرتی چلی جائے گی۔ اور ہم کو خاصانِ ادب سے یہ نہ کہنا پڑے گا کہ :۔ اے خاصۂ خاصانِ ادب وقتِ دعا ہے۔

سالنامہ شاعر

نوارا تلخ تر می زن چوں ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

حضرت علامہ عاشق حسین سیماب اکبر آبادی (پیدائش آگرہ ۱۸۸۰ء وفات کراچی ۱۹۵۱ء) نے ۱۹۳۰ء میں ماہنامہ شاعر کا اجرا کیا تھا۔ علامہ مرحوم کے صاحبزادے جناب اعجاز صدیقی سرپرستی سے شایع فرما رہے ہیں۔ اور اس کا سالنامہ ۱۹۶۴ء راقم کے زیر نظر ہے ہم ان سطور میں ۱۱۱ صفحات پہلے ہوئے اس سالنامے کا قدرے تفصیلی جائزہ لیں گے۔

اداریہ میں ملک کے موجودہ ہیجان اور انتشار کا تذکرہ کرتے ہوئے ادارے نے لکھا ہے کہ "ایک ناآسودہ قوم نہ بڑا ادب پیدا کر سکتی ہے اور نہ اسے تقویت پہونچا سکتی ہے" ادارۂ شاعر کی یہ رائے تاریخ علم و ادب کی روشنی میں کسی طرح قابل قبول نہیں کیونکہ خود اُردو کا عظیم ترین شعری و نثری ادب بڑی حد تک انھیں ادوار میں پیدا ہوا ہے جن میں نہ قوم ہی آسودہ تھی نہ افراد کی زندگی پرسکون تھی۔ اُردو میں غالب اس کی بین دلیل ہیں۔ فارسی کا بہترین شعری ادب تاریخ ایران کے اُس ہنگامہ پرور دور میں معرض وجود میں آیا جبکہ سیاسی و اقتصادی اعتبار سے ایران کا شیرازہ بالکل ہی بکھرا ہوا تھا۔ ایران کے اسی دور میں ہمیں حافظ سے نغمۂ شیراز ملا۔

اداریہ میں چند باتیں ایسی ہیں جو سالنامے کے مندرجات و تصاویر دیکھتے ہوئے سچائی کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں۔ مثلاً دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی جدید مصوری پر ایک جامع مضمون اور اُس سے متعلقہ تصاویر کی اشاعت کا فخر بھی "شاعر" ہی کو حاصل ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مضمون حیدر پٹھان ہی کے اُس مضمون کی ترمیم و اضافہ شدہ شکل ہے جو کرشن آرا کے فن پر ایک نظر کے تحت ہفت روزہ "جہان" بمبئی کے ۲۰ نومبر ۱۹۶۳ء کے شمارے میں پہلے ہی شایع ہو چکا ہے۔ اس مضمون کے ساتھ شامل تصا

جو تصاویر شایع ہوئی ہیں ان میں تین دورِ حیات کے مذکورہ بالا شمارے میں شائع شدہ ہیں علاوہ اس کے ان تصاویر کی طباعت میں ایک بڑی کمی یہ ہے کہ یہ صرف "سفید و سیاہ" میں ہے جبکہ آرا کی اصل تصاویر مختلف رنگوں سے مزین ہیں۔ کرشن آرا کی ان تصاویر میں ایک تصویر جگر کے اس شعر کی ترجمانی کرتی ہے۔

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

بہتر تھا کہ یہ تصویر شاعر میں شایع نہ ہوتی ورنہ پھر دوسرے مصرعہ کو یوں شایع کیا جاتا۔

گھٹ گیا انساں بڑھ گیا سایہ

کیونکہ اس تصرف سے تصویر سے شعر کی صحیح ترجمانی تو ہوتی خواہ جگر کی روح پر کچھ بھی گذرتی۔ دراصل جگر نے اپنے شعر میں زمانہ حال کے قحط الرجال کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس کی ذمہ داری جہلِ خرد پر ڈالی ہے۔ یعنی جہلِ خرد کی وجہ سے آج کل کے انسانوں میں اصل انسان کم اور انسانوں کے بے جان سائے زیادہ ہیں۔ آرا کی تصویر اس مفہوم کو ادا نہیں کرتی۔ اگر کرشن آرا کسی سے اپنی ترجمانی کی صحت کرالیں تو یہ اعجاز سے کم نہ ہوگا۔

مقالات:۔ ڈاکٹر عبد العلیم نامی کا مقالہ "۱۸۵۷ء سے پہلے کے شیکسپیئر کے اردو ترجمے" عنوان کے لحاظ سے بڑا ہی ٹھوس اور معلومات آمیز ہونا تھا لیکن افسوس کہ تین صفحات پر پھیلے ہوئے ڈھائی صفحے کے اس مقالے میں غیر متعلقہ باتیں زیادہ ہیں۔

میر تقی خیال (گجرات کے باشندے جو بعد میں دہلی چلے گئے تھے) کی نو جلدوں پر مشتمل فارسی کی تصنیف "بوستانِ خیال" کے دہلوی ترجمے کے بارے میں ڈاکٹر گیان چند کا تحقیقی مقالہ اردو کے اہلِ تحقیق کے لئے واقعی مفید اور اہم ہے۔ ادارہ شاعر نے مقالات میں دوسرے نمبر پر شایع کر کے کسی اچھے معیارِ تربیت کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں ڈاکٹر نامی سے ملاقات اور ڈاکٹر گیان چند سے صرف نصف ملاقات کی مصلحت

کوپیش نظر رکھا گیا ہو۔

اب ہم سالنامے کے سب سے گھٹیا مقالے کو پرکھیں گے جس کا عنوان ہے "شاد عظیم آبادی تاریخ کی روشنی میں"۔ مقالہ دور از کار تفصیلات سے پُر ہے۔ پیراگراف نمبر ۲ میں بنگال کے صوبہ دار مرشد قلی جعفر خاں کے داماد کا نام شجاع الدولہ لکھا گیا ہے جبکہ اصل نام شجاع الدین خاں ہے۔ شجاع الدین کے بعد اُن کے بیٹے سرفراز خاں صوبہ دار ہوئے۔ صاحب مقالہ نے سرفراز خاں کو صرف مرشد قلی جعفر خاں کے نواسے کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے جس سے تشکیک کو جگہ ملتی ہے کیونکہ نواسہ تو کسی دوسرے داماد سے بھی ہو سکتا ہے۔ مذکورہ تینوں صوبہ داروں کا دور ۱۷۱۷ء سے ۱۷۴۰ء تک ہے۔ شاد ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ تاریخی پس منظر میں سو برس پہلے کے صوبہ داروں کی نام بنام تفصیل بلاشبہ دور از کار ہے۔ مقالے میں جو مغز ہے میر صاحب کے واقعات نفسِ مضمون سے میل نہیں کھاتے۔

مقالہ نگار نے مضمون کے ابتدائی حصہ میں شاد کی تاریخ پیدائش ۸ جنوری ۱۸۴۶ء درج کی ہے اور پھر آگے چل کر شاد کا معیار شاعری پرکھتے ہوئے نگار کا اقتباس پیش کیا ہے جس میں نیاز صاحب نے لکھا ہے کہ "شاد ۱۸۴۶ء سے چھ سات سال قبل عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔" دونوں بیانات کا فرق ظاہر ہے لیکن صاحب مقالہ نے اس سلسلے میں قاری کو اصلیت سے آگاہ کرنے کی زحمت نہ اٹھاتے ہوئے اُسے ایک دوراہے پر لا کر چھوڑ دیا ہے۔

شاد کے دورِ جوانی کی شاعری کو ابتذال سے پاک قرار دینے کے فوراً ہی بعد فاضل مقالہ نگار نے ٹیکھنے کی تعریف میں شاد سے منسوب کر کے برج بھاشا کی مندرجہ ذیل مثال پیش کی ہے۔

سکھی سہ آپ ہے اور مو کو ہائے۔ بلتے بلتے لگ گئیں انکھیاں

سہیلی: کو سکھی! ساجن!
سکھی: نا سکھی! پنکھا!

حیرت ہے کہ شاد کی اس عمدہ برج بھاشا میں فاضل مقالہ نگار کو ابتذال نظر نہیں آیا۔ یہ تو اس قبیل کی ایک مبتذل تخلیق ہے جیسے کہ حسب ذیل شعر:

دختیِ درزی کا سینا دیکھ کر   جی میں آتا ہے کہ ململ دیجیے

شاد کی اس تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے صاحب مقالہ نے مستند اساتذہ کی صف میں جو نام مثال کے طور پر پیش کئے ہیں وہ قابل غور ہیں مثلاً محمد شاہ رنگیلے سراج الدین ظفر واجد علی شاہ اختر، نظیر اکبر آبادی، میر شیر علی افسوس۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مقالہ نگار نے مذکورہ شعراء کو اپنے کسی مقالے میں مستند ثابت کر دیا ہے کیونکہ اس مقالہ میں انھیں بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ مستند کہا گیا ہے

علامہ سیماب کی برسی کے موقع پر (۳۱ جنوری) سالنامے میں "بیاد سیماب" کے تحت دو مضامین، دو خطوط کے عکس اور علامہ مرحوم کی چند غیر مطبوعہ رباعیات شائع کی گئی ہیں۔ دونوں مضامین بلاشبہ مرحوم کی زندگی کے چند پہلوؤں کو سمجھنے میں کافی مدد دیں گے۔ لیکن قیسی رامپوری کے مضمون میں چند باتیں استفسار انگیز ہیں مضمون کے آخری حصہ میں قیسی صاحب نے علامہ کو اپنے وقت کا بہت بڑا آدمی قرار دیا ہے اور پھر بالکل آخر میں تحریر فرمایا ہے کہ اگر اس شاعر اعظم نے کسی مہذب ملک میں جنم لیا ہوتا یا اس کا انتقال اپنے مشاہیر کو زندہ رکھنے والے دیس میں ہوتا تو اس کی آخری آرام گاہ گور غریباں کے بجائے شاندار مقبرہ کی شکل میں ہوتی اور ان کا کلام و پیام ملک کے بچے بچے کو یاد ہوتا۔

قیسی صاحب اول تو خود ہی مولانا کی شخصیت کو صرف اپنے زمانے کی بڑی شخصیت مانتے ہیں یعنی ان کی اہمیت کو صرف انھیں کے زمانہ تک محدود کر دیتے ہیں۔

اور دوسری طرف چاہتے یہ ہیں کہ ان کا مقبرہ بھی بنے اور ان کا کلام و پیام ملک کے بچے بچے کو یاد ہو۔ ایک ہی سانس میں دونوں باتیں کہنا اگر افسوسناک نہیں تو حیرت انگیز ضرور ہے۔ مولانا مرحوم کی شخصیت کو محدود کر کے قیصی صاحب نے ان کے متعلق صحیح رائے قائم نہیں کی ہے۔ اب رہا مہذب ملک کا معاملہ! قیصی صاحب نہ ہندوستان ہی کو مہذب تسلیم کرتے ہیں اور نہ ہی پاکستان کو

بریں عقل و دانش بباید گریست

ادارۂ شاعر کو نہ جانے کیسے یہ گوارا ہوا کہ شاعر کے صفحات پر اپنے وطن عزیز کی اس حرمت آمیز گلائے علامہ سیماب کے نام تاجور اور مولوی عبدالحق کے خطوط کے عکس شائع کرنے کا تک فہم سے بالا ہے ۱۹۳۵ء اور ۱۹۵۱ء کے لکھے ہوئے ان قلمی غیر اہم خطوط کی اشاعت سے نہ کوئی ادبی خدمت ہوتی ہے اور نہ ہی مخطوطات کی حفاظت۔

علامہ تاجور کے خط میں انھیں موت کا انتظار ہے مولوی صاحب کے خط میں ساتھ کھانا تناول کرنے اور غریب خانہ پر تشریف لانے کی بے تکلفانہ تاکید۔ ان خطوط سے نہ کوئی تاریخی، علمی یا ادبی مسئلہ حل ہی ہوتا ہے اور نہ پیدا۔ ان خطوط سے تینوں بزرگوں کی اہمیت میں کوئی کمی ہوتی ہے نہ بیشی۔ ادارہ شاعر کو اگر علامہ کے خطوط کو شائع کرنا ہی ہے تو ایسے خطوط شائع کرے جن کی ادبی اہمیت ہو یا پھر ان کی روشنی میں کوئی سوانحی، تاریخی، علمی یا ادبی سوالیہ نشان مٹے یا ابھرے۔ ان خطوط کو شائع کر کے شاعر نے خواہ مخواہ اپنے دو صفحات ضائع کئے ہیں۔ ان صفحات میں علامہ سیماب کا کچھ اور غیر مطبوعہ کلام شائع ہوتا تو بدرجہا بہتر ہوتا۔

حصہ نظم میں "اعتراف محرومی" کے تحت پہلا مصرعہ پڑھتے ہی زبان پر آجاتا ہے۔

لاحول و لا قوۃ الا باللہ

کیا ہی اچھا ہوتا کہ جمیل مظہری کی چاروں رباعیات کو رباعیات ہی کے تحت پیش کیا جاتا یا پھر حصہ نظم کا عنوان نظمیں ہونے کی بجائے منظومات ہوتا۔ علی جواد زیدی کی نظم شعلہ بہ شعلہ بہت عمدہ ہے۔ درک کے عنوان سے ایک ایسی نظم پیش کی گئی ہے جو حد ادراک سے تعلق نہ رکھتی

متین سروش کی نظم رنگ و بو کا غالب حصہ غالب کے اب تک شرح طلب اشعار کی طرح شرح طلب ہے نظم ہے یا الفاظ کا گورکھ دھندا۔

بشیر نواز کی نظم بحیثیت مجموعی گوارا ہے۔ کرشن موہن کی غزل نما۔ اس کلائمکس میں پیدا ہونے والی صف اول کی آزاد نظموں میں جگہ پانے کی بجا طور پر مستحق ہے۔

سالنامے میں مطبوعہ سترہ غزلوں میں صرف ماہر القادری، احسان دانش، منظر صدیقی اور شفا گوالیاری کی غزلیں واقعی عمدہ اور معیاری ہیں۔ بقیہ غزلوں نے صرف صفحات کو کالا کیا ہے۔

سالنامے میں بھی اچھی غزلوں سے شاعر کی محرومی قابل افسوس ہے۔

علامہ سیماب کے نام پر نکلنے والے اس رسالے میں جو بات اہل نظر کو سب سے زیادہ کھٹکے گی وہ یہ ہے کہ نظموں اور غزلوں کے کئی اشعار میں فنی غلطیاں موجود ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

گذر گئی بہر عنوان زندگی منظر
یہ کیا تماشا ہے خوش کہ سوگوار چلے (منظر صدیقی)

ذہن حق بیں کا اثر ہو کہ خرد کا جادو
پھول عقائد کے ہوئے خاک اڑی خوشبو (بشیر نواز)

مندرجہ بالا دونوں اشعار میں عین ساقط ہو جاتا ہے۔ متعلقہ شعرا کی اجازت سے عنوان کی جگہ انداز اور پھول کی جگہ گل شائع کیا جاتا تو یہ سقم جاتا رہتا اور علامہ سیماب کی روح کو بھی تسکین ہوتی۔

کرشن موہن نے پیغمبری کے ایک جز کی فنی قدروں کو سنبھالا ہے۔

نظم درک کا آخری شعر ہے۔

اور انساں کے مقدر میں فقط
سوچ کی گتھیاں سلجھاتا ہے

دوسرے مصرعے میں لفظ گتھیاں کیا بہ میں ہڈی کے مترادف ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ مصرعہ یوں کر دیا جاتا۔ "گتھیاں سوچ کی سلجھاتا ہے"

غلط قسم کی ترقی پسندی کے علمبرداروں نے گذشتہ ربع صدی میں استادی و شاگردی کی

صحت مند علمی و ادبی روایات کو جو نقصان پہونچایا ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اکثر شعرائے حلقہ کے کلام میں فصاحت و بلاغت اور فنی صحت کا فقدان ہے۔ بات اگر صرف یہاں تک ہو کہ جہاں شعر کے نفس مضمون کو بعض فنی قیود کی وجہ سے ٹھیس پہونچتی ہو وہاں انھیں ثانوی درجہ دیا جائے تو بلاشبہ درست ہو لیکن یہاں تو نوبت یہ آ پہونچی ہے کہ جن شعروں میں بعض الفاظ کے صرف الٹ پھیر اور مرادف الفاظ کے استعمال سے مختلف اسقام دور ہو سکتے ہیں ان میں بھی یہ زحمت قبول نہیں ہوتی۔

علامہ سیماب مرحوم کے قصر ادب کے صدقے ہیں نہ جانے کتنے شعرا اور شاعری کے فنی نشیب و فراز سے بہرہ مند ہوئے ہوں گے۔ افسوس کا مقام ہے کہ اسی قصر ادب کا جریدہ شاعر فنی قدروں کو پس پشت ڈال کر شعراء کی ادبی و علمی بے راہ روی کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔

افسانے۔ کوثر چاندپوری، رت پرکاش سنگر اور زکی انور تینوں کے افسانے گوارا ہیں۔ اردو کے افسانوی ادب کے اس بحرانی دور میں یہی بہت ہے کہ شاعر کو کم از کم دو سکہ رائج کے افسانے شائع کرنے کو مل گئے۔ زکی انور اپنے افسانے "پرانا ناسور یا نشتر" کے اختتامی حصہ میں وہ جان پیدا نہیں کر سکے جو نقطۂ عروج پر ختم ہونے والے افسانوں میں ہونی چاہیئے۔

طنز و مزاح کے تحت احمد جمال پاشا کی بی جمالو، یوسف ناظم کے اشرف المخلوقات اور غلام احمد فرقت کی تخلیق فرمانے سے پہلے شریک اشاعت ہیں۔ انداز بیان کے لحاظ سے تینوں گوارا ہیں۔ فرقت کو تیسری جگہ دی گئی ہے جبکہ اپنی اس تخلیق کے لحاظ سے وہ ترتیب میں پہلی جگہ کے مستحق ہیں۔

ترتیب کے لحاظ سے سالنامے کی سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اکرام جاوید اور نور شاہ کے ڈراموں کو بالکل آخر میں جگہ دی گئی ہے جبکہ اردو ڈراموں کی موجودہ ناگفتہ بہ حالت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی اور اس کے لکھنے والوں کی حتی الامکان حوصلہ افزائی کی جائے۔

ڈرامہ نگاروں کو پس خوردوں کی صف میں ڈالنا شاعر کے لئے کسی طرح مناسب نہیں تھا۔

نورشاہ کے ڈرامے میں منظر بدلنے یا ختم ہونے پر انگریزی الفاظ فیڈ آرٹ اور پیچ اور کچھ اس طرح استعمال کئے گئے ہیں کہ جیسے اردو کے پاس اس کے مترادف الفاظ ہی نہ ہوں۔ نورشاہ کوئی ایسے انل "لکھنے والے تو نہیں کہ ادارۂ شاعر نے بھی اس کمی کو پورا کرنے کی جرات نہ کی ہو اردو کے ادبی خالقوں کے سر پر انگریزی کا جو بھوت سوار ہے اس کے پیش نظر علامہ اقبال سے معذرت کے ساتھ عرض ہے :-

ہائے بیچاروں کے اعصاب پہ انگلش ہے سوار

نورشاہ نے اپنے اسی ڈرامے میں ایک جگہ غالب کا شعر یوں تحریر فرمایا ہے۔

جی چاہتا ہے پھر دہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

جبکہ غالب کا اصل اور تحقیق شدہ شعر یہ ہے۔

جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

یہاں بھی ادارۂ شاعر سے ذوق سلیم داد خواہ ہے کہ ملاحظہ ہو۔ ارمغان غالب صفحہ ۱۲۹۔

اب ہم ذرا شاعر کے اندرونی سرورق کے بارے میں دو مشورے دیں گے۔

(۱) زرِ سالانہ اور زرِ ششماہی کے تحت سات اور چار کے ساتھ "روپیہ" لکھا گیا ہے اور ایک پرچے کی قیمت "فی پرچہ دس آنے" لکھی گئی ہے۔ مناسب یہ ہے کہ روپیہ کی بجائے لکھا جائے روپے اور دس آنے کی جگہ ۶۲ نئے پیسے۔

(۲) شاعر کو اردو کا علمی و ادبی ماہنامہ تو ضرور لکھا جائے لیکن لفظ قدیم حذف کردیا جائے۔ یہ لفظ اپنی موجودہ جگہ پر اس وقت کام میں لایا جائے جب سنہ ۶۲ء میں اس کا پہلا شمارہ شایع ہو۔

قدیم ہندوستان کے سکّے

انور احمد سوپاروی

سکّے انسانی تہذیب کے ارتقائی مرحلوں اور منازل کے عکاس ہوتے ہیں۔ تمدنی زندگی جب تدریجاً ترقی سے متاثر ہونے لگی اور انسان کو خرید و فروخت میں متعدد پیچیدگیوں اور ہمہ گیر تاریکیوں سے دوچار ہونا پڑا تو اس کا ذہن مددگار ذرائع کا متلاشی نظر آنے لگا۔ جو ان دشواریوں سے اُسے نجات دلانے میں اس کا ممد و معاون ثابت ہوں۔ تمدنی زندگی کے آغاز میں لین دین وغیرہ میں گائے بیل اور دوسرے پالتو جانوروں کو مبادلہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ روزمرہ کے مقامی لین دین کے سلسلہ میں اکثر اوقات کھانے پینے اور دیگر ضروری اشیاء کا باہمی تبادلہ کیا جاتا تھا۔ مثلاً دودھ والا، دودھ کے بدلے گھی یا کپڑا خریدے، یا سبزی والا سبزی کے عوض مٹی کے ظروف خریدے۔ وغیرہ مگر بیرونی تعلقات اور تجارتی علمی اور سفارتی رابطہ نے انسانوں کی تمدنی زندگی میں ایک تعمیری ہلچل پیدا کر دی۔ چنانچہ سکے رائج ہوئے اور بتدریج سکوں کے پیمانے مقرر ہوئے جو مختلف دور میں حسب ضرورت تغیر و تبدل کے سانچے میں روبہ ترقی تھے۔ اس بابت سی۔ جے۔ براؤن (C. J. Brown) رقمطراز ہے:۔

"اس زمانہ میں مویشی آدمی کا سرمایہ تھا، اور یہ قدرتی بات بھی تھی۔ ہندوستان اور قدیم یوروپ میں گائے، خرید و فروخت کے معاملہ میں سب سے زیادہ قیمتی تصور کی جاتی تمام پالتو جانوروں میں اس کا رتبہ سب سے بلند تھا چنانچہ آج بھی ہندوستان میں گائے قابل پرستش سمجھی جاتی ہے"

بعد کے دور میں سیپ، شنکھ اور کوڑیاں سکوں کی بجائے مستعمل تھیں مگر جب دھات دریافت ہوئی تو دھات کے ٹکڑوں سے سکوں کا کام لیا جاتا تھا۔

علم سکہ جات (NUMISMATICS) ایک نہایت دلچسپ اور اہم تاریخی موضوع ہے جس کی

رؤ سے انسانی تاریخ کے کئی پہلو روشن ہوتے ہیں۔
جب کہ ہربرٹ اسپنسر Herbert Spencer کی رائے میں سکہ شناس Numismatist "مردہ حقائق کے متلاشی ہیں" جی۔ بی۔ رانگر G. B. Ranger اس بیان کی تردید کرتے ہوئے لکھتا ہے۔
"اس علم سے انسانی ذہن کی ترقی کی رفتار کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہوتی ہے"
محققین کا خیال ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے ... ق م میں سکے وجود میں آئے ، بعض ماہرین گلدھ کے راجہ بمبی سار Bimbisara کو سکوں کو ہندوستان میں رائج کرنے والا سب سے پہلا فرمانروا گردانتے ہیں جس نے تاجروں اور صنعت پیشہ لوگوں کو اپنے نام کے سکے رائج کرنے کی اجازت دے دی تھی۔
ڈاکٹر رادھا کمد مکرجی نے ہندوستان کے قدیم سکوں کے تین دور بتلائے ہیں۔
(الف) آغاز میں ملی جلی دھات کے متفرق وزن اور شکل کے سکے، جن پر کسی قسم کی عبارت یا مخصوص علامتیں Symbols نہیں تھیں۔ ایسی صورت میں ان سکوں کو ان کے متعلقہ دور سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔
(ب) بعد ازیں نسبتاً ترقی یافتہ دور آیا جس میں پنچ مارکڈ (Punch marked) سکے جاری ہونے ان سکوں پر حکمرانوں کے نام اور ان کی مخصوص "علامتیں" منقوش ہوتی تھیں۔ یہ سکے عموماً چوکور یا گول ہوتے تھے خالص سونا اور چاندی استعمال ہوتا تھا۔ ان سکوں کا رواج لگ بھگ ... ق م تک رہا۔
(ج) تیسرے دور کے سکے فنی اعتبار سے کافی دلکش اور دیدہ زیب تھے۔ اب مختلف دھات کے سکے نظر آنے لگے جن پر مخصوص نشانیاں ہوا کرتی تھیں۔
آج تک ماہرین آثار نے تقریباً تین سو مختلف علامتوں Symbols کے سکے دریافت کئے ہیں مثلاً



(۱) چیتیہ Chaitya
(۲) سواستک
(۳) سواستک ناقص



(۴) چکر
(۵) چاند
(۶) انکھ
(۷) سیاہی — ایودھیہ سکے۔

(واضح رہے اس عہد میں ہندوستان میں صرف تین مذہب (ویدی، بدھ مت اور جین مت) ہی مقبول تھے چنانچہ ان کے سکوں پر بھی جتنی نشانیاں منقوش تھیں وہ عموماً انہی مذاہب سے متعلق تھیں)

مندرجہ بالا علاقوں کے علاوہ سانپ، شیر، ہاتھی، کچھوا، بیل، گائے، ترشول (♆) دیوی، دیوتا جہاز، کتا، وغیرہ بطور علامت نقش کئے جاتے تھے۔ کوشالہ کے سکوں پر بیل اور پانچال کے سکوں پر متعدد سروں والا ایک سپاہی نظر آتا ہے جو درود پدی (Draupadi) کے پانچ شوہروں کی طرف نشاندہی کرتا ہے۔ الغرض یہ سکے اس زمانہ کے عام حالات کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔

ابتدائی دور میں سکوں کے صرف ایک ہی جانب عبارت یا کوئی نشانی ہوا کرتی تھی، البتہ افغان اور پنجاب میں گریک سلطنت کے قیام کے بعد ہندوستانی سکوں کی ساخت میں حیرت انگیز تبدیلی رونما ہونے لگی۔ اس سے قبل ہندوستان کے چاندی اور تانبے کے سکے دو اقسام پر منقسم تھے۔ مگر دونوں قسم کے سکے عبارت اور علامتوں سے مبرا ہوا کرتے تھے چاندی کے سکوں کو "پوران" "Purana" کہا جاتا تھا جو چاندی کی موٹی چادروں کو کاٹ کر مختلف شکلوں میں بنائے جاتے تھے، ہر صوبہ یا شہر جہاں یہ سکے پہنچتے تھے۔ وہاں کا حکمراں اپنی مخصوص نشانی یا عبارت نقش کر دیتا تھا۔ گریک کی حکومت اور ان کے سکوں نے ہندوستانی فن سکہ سازی پر گہرے اثرات چھوڑنا شروع کر دیا چنانچہ ہندوستانی حکمرانوں نے بھی ان گریک سکوں کی نقل کرنا مناسب سمجھا، جیسا کہ پنجاب کے سوبھوتی (Sophytes) نے سب سے پہلے گریک رسم الخط میں سکوں پر اپنا نام منقوش کر دیا تھا۔ مشہور مورخ آر۔ ڈی۔ بنرجی کی (R. D. Banerji) تحقیق مظہر ہے کہ سوبھوتی کی تقلید میں کوسمبی (Kosambi) کے سنگا خاندان نے بھی تانبے کے سکوں پر اپنا نام منقش کر دیا۔ ان کا شمار ہندوستان کے قدیم ترین سکوں میں کیا جاتا ہے جب کرشن قوم نے رومنوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خالص سونے کے سکے جاری

کر دیئے تھے۔ کنشک (Kanishka) اور واسودیو اوّل نے خالص سونے اور تانبے کے سکے جاری کئے۔ کشن قوم نے شاید سکوں کیلئے چاندی کا مطلق استعمال ہی نہیں کیا۔ اس کی وجہ تحقیق طلب ہے۔ تانبے کے سکوں کا افراط سے دستیاب ہونے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسری یا تیسری صدی عیسوی میں شمالی ہندوستان میں یہی سکے مقبول عام رہے ہونگے۔

انڈو گریک سکے ابتداء میں گریک وزن کے مطابق ڈھالے جاتے تھے تاہم چند صدیوں بعد ہندوستانی طرز پر بننے لگے تھے، شکا قوم (Scythians) کے دور میں گریک طرز پر تانبے کے سکے بنائے جاتے تھے، اس قوم کے ابتدائی بادشاہوں نے شاید سکہ سازی کیلئے سونا استعمال کرنا مناسب نہیں سمجھا، انہی کے ہم عصر (سنہ ۱۰۰ق م تا سنہ ۲۰۰ء) راجنیہ (Rajanya) کننڈ (Kunindas) مالوا، یادھیہ اور ارجونائن (Arjunayanas) قبائل نے چاندی اور تانبے کے سکے جاری کر رکھے تھے جو خروشطی (Kharoshthi) اور براہمی رسم الخط سے آراستہ ہوا کرتے تھے۔ جو قدرے خوبصورت بھی تھے۔

جنوبی ہندوستان کے مشہور خانوادہ ساتواہن نے سکوں کی طرف خاص توجہ دی تھی ان کے سکے متعدد قسموں کے بنائے جاتے تھے جن پر عموماً گھوڑا، شیر، ہاتھی، کچھوا، سمندری جہاز اور چیتیہ (Chaitya) وغیرہ کے نشانات منقش ہوا کرتی تھیں۔ اس صنعت میں انہوں نے چاندی سیسہ اور پوٹن (Potin) استعمال کیا۔ ان کے ایک مشہور حکمراں گوتمی پتر (سنہ ۸۲ء تا سنہ ۱۰۶ء) نے اُدتی کے ستراپ کے چاندی کے سکوں پر اپنا نام کندہ کر دیا تھا۔ چونکہ یہ جنوبی ہندوستان کے ایک بہت بڑے حصے پر قابض تھے۔ جس میں جنوبی ہند کی مشرقی اور مغربی ساحلی پٹیاں شامل تھیں، ان کی مملکت میں کئی مشہور بندرگاہیں زیر اقتدار آگئی تھیں، ان کے دور حکمرانی میں بیرونی ممالک سے تجارتی تعلقات میں وسعت اور استواری آگئی تھی چنانچہ انہوں نے ان گنت سکے ڈھال لئے تھے، جو تجارتی لین دین میں سہولت بہم پہنچانے میں مددگار ثابت ہوئے تھے، یہ سکے اب بھی بعض مقامات سے برآمد ہوتے رہے۔ راقم الحروف کو صرف اس خاندان کے تقریباً پچیس ۲۵ سکے ملے ہیں۔

ہندوستان میں صنعتِ سکہ سازی چار ارتقائی مرحلوں سے ہو گزری ہے۔

(الف) سب سے پہلے دور میں جو سکے بنائے جاتے تھے انہیں پنچ شدہ [illegible] سکے کہتے ہیں یہ ہمارے قدیم ترین سکے تھے جن کی شکل چوکور ہوا کرتی تھی

(ب) دوسرے دور میں اس فن نے نسبتاً ترقی کر لی تھی۔ اس دور کے سکوں کو ڈھالے کی مدد سے بنے ہوئے سکے ([illegible]) کہتے ہیں۔ یہ دور سنہ ق م کے بعد سے چلتا ہے

(ج) سانچے میں ڈھلے ہوئے سکے ([illegible]) یہ خوبصورتی اور فنی اعتبار سے مندرجہ بالا دونوں دور کے سکوں سے بہتر تھے۔

(د) ٹکسالی سکے ([illegible]) جو صنعت سکہ سازی کی نہایت ترقی یافتہ صورت ہے جو آج بھی رائج ہے،

سکے فن تاریخ کے اہم ترین ستون ہیں، ان کی مدد سے متعلقہ دور کی اقتصادی صورتحال کے خدوخال واضح ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں فنی ترقی کا سلسلہ روشنی میں آتا ہے۔ گپت خاندان نے اپنے سکوں کے لئے صرف سونا ہی استعمال کیا تھا جس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ اس قیمتی دھات کی بہتات تھی، لوگ خوش حال تھے۔ تجارت ترقی پذیر تھی جب کہ گپت خاندان کے آخری حکمرانوں نے اس میں ملاوٹ شروع کر دی تھی جو ان کے اقتصادی انحطاط اور تجارتی بحران کی غمازی کرتی ہے۔ جنوبی ہند کی مختلف مملکتوں کے سکوں کی علامتوں سے فن جہاز رانی اور سمندری تجارت کے پہلو روشنی میں آتے ہیں۔ الغرض ہندوستان کے سکے ہماری تہذیب کے دوش بدوش اپنے چولے بدلتے رہے، یہاں تک کہ ۱۲ ویں صدی عیسوی کے بعد فن سکہ سازی نے حیرت انگیز ترقی کر لی، دور مغلیہ نے انہیں نت نئے روپ

بسلسلۂ اصلاحاتِ محوی

حفیظ مالیگانوی

جناب تبسم صدیقی کی غزل پر اصلاح اور توجیہ

(۱) سرورِ کیف کا وہ لمحۂ کامراں گزرا — جو دو دلوں میں محبت کی درمیاں گزرا

(۲) نفس نفس ہوا معمور بوئے الفت سے — ادھر سے کون یہ پھر آج گل فشاں گزرا

(۳) تری تلاش، تری جستجو بھی کیا شے ہے — ہجوم شوق لیے میں کہاں کہاں گزرا

(۴) بڑھی جو فکر میں وسعت، نظر میں بے تابی — وہ میرے سامنے سو بار گل فشاں گزرا

(۵) نگاہِ ناز میں ہم مدتوں رہے — رہِ وفا میں اک ایسا بھی امتحاں گزرا

(۶) بڑھا جو حوصلۂ دل تو پھر کہیں نہ رکا — چلا تو جانبِ منزل رواں دواں گزرا

(۷) جنونِ عشق نے پہنچا دیا سرِ منزل — ہر ایک گام پہ میں شاد و کامراں گزرا

(۸) کشاکشِ غمِ ہستی سے پا گیا فرصت — جو بس جہاں سے بہر رنگ شادماں گزرا

(۹) ~~پھر آئی شرم تبسم کو جرم عصیاں پر~~ قفس سے ~~چھوٹ کے~~ جب ہوئے آشیاں گم ہوا
پھر آئی آنکھ تبسم کی دل ہوا بے تاب — جب چھٹ کے وہ

توجہات

شعر نمبر ۱ ۔ (م ۔ ۱) میں معنوی نقص تھا لمحہ کبھی جاوداں نہیں ہوتا، وہ تو ہر آن بدلتا رہتا ہے، البتہ اسے ناکامی و کامرانی سے ضرور تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے لفظ "کامراں" سے استاد نے بدل دیا، اب مصرعہ صاف، سلیس اور معنویت کے لحاظ سے عمدہ ہو گیا!

(۱) دوسرے مصرعہ میں لفظ (کی) ضروری تھا۔ اس کے بغیر در مفہوم بند تھا اب کھل گیا

(۲) لفظ (میں) سے (کی) میں زیادہ لطافت و شعریت ہے

(۳) (میں) اور (درمیاں) کی یکجائی بھی اچھی اور مناسب نہ تھی۔

شعر نمبر ۲ ۔ دوسرے مصرعے میں ناگوار تعقید پیدا ہو گئی تھی۔ استاد محترم نے کس خوبی سے اسے دور کر دیا۔

شعر ۳ : (م ۔ ۱) اسلوب بیان کے لحاظ سے کچھ نہ تھا۔ مصرعے کے آخر میں (بھی کیا شے ہے)، استاد فاضل نے ایسا ٹکڑا رکھ دیا ہے جو صرف ۲ مصرعے سے دست و گریباں ہے بلکہ شعریت و دلکشی کے اعتبار سے جامع اور بڑی خوبیوں کا حامل ہے۔

شعر ۴ کا دوسرا مصرعہ دو لخت تھا۔ مصرعہ اول سے کوئی مناسبت نہ تھی اب اصلاحی مصرعے نے چمکا دیا اور شاعر کا مفہوم تابناک ہو گیا۔ (سو بار) نے جان ڈال دی۔

شعر ۵ (۱) شعر نمبر ۵ کا مصرعہ اول بے کیف تھا کوئی شاعرانہ خوبی نہ تھی اس لئے اصلاح دی گئی (ان کی نظر) کی بجائے نگاہ ناز میں جو لطافت ہے اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔

(۲) مصرعہ (اک ہم) کا (کاف) یا (ہ) گر گئی تھی، اور مصرعہ ناموزوں ہو گیا تھا

(۳) لفظ (فقط) زائد اور حشو تھا۔

(۴) (ہیں) فصیح اور صحیح ہے۔ یہی اہل زبان کی بول چال ہے۔ اس کی جگہ (ہم ہی) درست نہیں۔ متروک ہو چکا ہے۔

(۵) مصرعہ کی بندش میں الجھاؤ تھا اور روانی نہ تھی یہ سب عیوب اصلاح سے دور ہو گئے مصرعہ کتنا چست اور عمدہ ہو گیا۔

نگاہِ ناز میں ہم مدتوں سے ہے مشکوک

شعر نمبر ۶ - مصرعہ اول کے پہلے رکن میں (اٹھا) محل نظر تھا (اٹھنے) میں رکنے اور چلنے کی کیفیت نہ تھی۔ اس لئے اسے قلم زد کر کے (بڑھا) بنا دیا گیا۔ جو دونوں حالتوں کی نشاندہی کر رہا ہے کیا عمدہ اور نازک اصلاح ہے۔ پہلے مصرعہ میں بڑھا آ چکا تھا۔ بنا بریں، دوسرے مصرعے میں اسے (چلا) سے بدل کر شعر کے مفہوم کو مکمل کر دیا گیا۔

شعر ۷ مصرعہ ثانی سے مصرعہ اول کا کوئی تعلق نہ تھا۔ (غبار راہ) اگر (دھواں دھواں) بن جائے تو منزل پر پہنچنے کا امکان کہاں؟ محترم استاد نے اس عیب کو محسوس فرما کر مصرعہ بدل دیا اور شعر کو وہ معنویت عطا کر دی جو شاعر کے ذہن میں نہ تھی۔

شعر ۸ اس شعر کے مصرعہ ثانی میں بھی ناگوار تعقید تھی، اصلاح سے عیب دور ہوا اور شعر میں دلکشی پیدا ہو گئی (کامراں) سے (شادماں) بہت خوب ہے۔

شعر ۹ مصرعہ اول مصرعہ ثانی کے دعوے کو ثابت کرنے سے قاصر تھا (جرم عصیاں) کا بیان محل نہ تھا (دل بیتاب) ہی کی ضرورت تھی۔ کیا اچھا مصرعہ بنا دیا گیا ہے۔ دوسرے مصرعے میں (فاعل) نہ ہونے کی وجہ سے تغیر کیا گیا۔ اس عمدہ اصلاح سے دونوں عیب دور ہو گئے۔ اور مقطع کی شان دوبالا ہو گئی۔

ایک شعر

زمانے کی تگ و دو نے اسے بھی ختم کر ڈالا
بجز انسانیت کے آدمی کے پاس ہی کیا تھا

فنیح

"شمس کنول ایک اعلیٰ ادیب ہونے کے ساتھ ایک انتہائی باسلیقہ مدیر بھی ہیں —
ان کا شعورِ ادارت داد و ستائش سے بالاتر ہے!" صفدر آہ

"میں نو انشاء کے ذریعہ محض ایک کوشش کر رہا تھا۔ مگر شمس کنول نے اس
کوشش کو پورا کر دکھایا۔" جون ایلیا

"گگن کا اس لئے بھی انتظار رہتا ہے کہ یہ اور پرچوں سے مختلف ہے متنوع
اور گہرا ہے" آمنہ ابو الحسن

"شاید دو ہی پرچے ایسے ہیں جو اپنے مدیران کے بس میں ہیں، نگار (نیاز
فتحپوری) اور گگن (شمس کنول)، شمس کا اندازِ تحریر نہایت موثر، شگفتہ
اور نوکیلا ہے۔" شبنم رومانی

رشید الدین

ایک بادشاہ کی کہانی

ایڈورڈ ہشتم کی خود نوشت سوانح حیات

کس قسم کی تحریر پڑھنے والے کے دل پر زیادہ سے زیادہ اثر کرتی ہے یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب مختلف دیا جا سکتا ہے لیکن اس سلسلے میں جو جواب سرسید احمد نے دیا ہے وہ بڑا معقول اور دل کو لگتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کسی تحریر کا پڑھنے والے کے دل پر زیادہ سے زیادہ اثر کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے لکھنے والے کے دل میں سچا خلوص ہو۔ واقعی سرسید نے یہ بات بڑے پتے کی کہی ہے اور اس زمرے میں بہت کم تحریریں آتی ہیں پہلے تو ہمیں بامقصد اور صحت مند تحریریں ہی بہت کم نظر آتی ہیں اور پھر ایسی تحریریں تو شاذ و نادر ہی ملتی ہیں جن میں لکھنے والے کا دلی خلوص شامل ہوتا ہے۔

ایڈورڈ ہشتم سابق شاہ برطانیہ کی خود نوشت سوانح حیات "ایک بادشاہ کی کہانی" میں ہمیں دلی خلوص ملتا ہے۔ اس کتاب کو پڑھتے پڑھتے قاری اس کے ماحول میں کچھ اس طرح کھو جاتا ہے کہ وہ بھی اپنے آپ کو اس ماحول کا ایک کردار محسوس کرتا ہے حالانکہ ایک ہندستانی قاری کیلئے انگلستان کا ماحول وہ بھی شاہی خاندان کا کچھ غیر مانوس سا ہوتا ہے اور محض مصنف کے خلوص کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب میں ایسی کوئی ادبی یا مسحور کن زبان بھی استعمال نہیں کی گئی ہے جس کا خود مصنف نے اعتراف کیا ہے۔

"میں اپنے آپ کو کوئی ادبی شخصیت یا ادبی مورخ نہیں سمجھتا۔ یہاں میں نے ان چیزوں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کی حقیر سی کوشش کی ہے۔ جنھوں نے مجھے ایک بادشاہ ایک شہزادے اور ایک بنی نوع انسان کی حیثیت سے متاثر کیا ہے۔ لیکن مصنف کی اس مخلصانہ انکساری کے باوجود ایک قاری ان کی شائستہ اور والہانہ انداز بیان کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا جس کا ہر ہر

جملہ نوکِ قلم سے نکل کر سیدھا قاری کے دل و دماغ میں پیوست ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں وہی خلوص ہے جو مصنف کے دل میں مستور ہے۔

ایک عام پڑھے لکھے شخص کے لئے ایڈورڈ ہشتم کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں جس نے اس بیسویں صدی میں ایک معمولی عورت کے لئے برطانیہ کے اس تاج کو ٹھکرا دیا تھا جس کے پہننے والے کی سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ تاریخ اس کو کبھی نہ بھلا سکے گی کہ ایک ۴۱ سالہ انگریز بادشاہ نے ایک ۴۰ سالہ دو بار مطلقہ امریکی عورت کے لئے نہ صرف تخت و تاج چھوڑ دیا بلکہ مستقبل میں بھی ہمیشہ کیلئے شاہی خاندان اور شاہی تخت سے اپنی اولاد کا ناطہ توڑ لیا تھا۔

ایک عام آدمی کو یہ بات بہت عجیب و انہونی محسوس ہوتی ہے۔ اور صرف اتنا پڑھ کر وہ اسے مافوق الفطرت انسان سمجھنے لگتا ہے۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ ایڈورڈ نے جو کچھ کیا وہ بہت سوچ سمجھ کر کیا اسے یہ حرکت کرتے ہوئے نہ اس وقت کوئی قباحت محسوس ہوتی تھی اور نہ آج کوئی پشیمانی ہے بلکہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ویسی ہی اطمینان کی زندگی گزار رہا تھا۔ جیسی کہ ایک عام شادی شدہ شخص گزار سکتا ہے۔

ایڈورڈ ہشتم کا معاشقہ غالب کے اس مشہور شعر کی جیتی جاگتی مثال اور تفسیر ہے۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

ایک شہزادے اور وہ بھی ولیعہد شہزادے کی اکتالیس سالہ زندگی میں کیسی کیسی لڑکیاں اس کے ساتھ نہ رہی ہونگی اور کس کس بڑے امیر و لارڈ نے اسے داماد بنانا چاہا ہوگا، لیکن اس کے باوجود وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ کبھی کسی لڑکی کی طرف سے اسے یہ خواہش نہیں ہوئی کہ وہ اس کی شریک حیات بنے یا کبھی اس نے اپنی زندگی میں کسی قسم کی تشنگی محسوس نہ کی، لیکن اچانک ایک ادھیڑ عمر کی معمولی شکل و صورت کی شادی شدہ خاتون نے اسے کچھ اس طرح متاثر کیا کہ اسے زندگی میں ایک خلا محسوس ہونے لگا، اور وہ اسے ہر قیمت پر اپنی شریک حیات بنانے پر تیار ہو گیا۔

تاریخ انگلستان میں ایڈورڈ ہشتم کا دور صرف دس ماہ پر مشتمل ہے۔ وہ اپنے باپ جارج پنجم کے انتقال پر ۱۹۳۶ء میں تخت نشین ہوا۔ اور ۱۹۳۶ء میں تخت سے دست بردار ہو گیا۔

یہ پورے دس ماہ وزیر اعظم انگلستان بالڈوین اور ایڈورڈ کے درمیان کشمکش میں گزر گئے دستور برطانیہ کی روایات کے تحت شاہ برطانیہ صرف شاہی خاندان ہی میں شادی کر سکتا ہے۔ شاہی خاندان سے باہر عوام کے طبقہ میں شادی کرنے کا کسی طرح حق نہیں پہنچتا۔ اس کے برخلاف ایڈورڈ جس عورت سے شادی کرنا چاہتا تھا وہ عام طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور جس سے وہ اپنے شباب کے زمانے ہی سے متاثر تھا۔ اور شادی کے منصوبے باندھ رہا تھا۔

ایڈورڈ ہشتم کوئی جذباتی یا ناتجربہ کار بادشاہ نہیں تھا۔ جس وقت وہ تخت نشین ہوا اور اس کی عمر پورے اسی سال کی ہوئی۔ اس کے علاوہ اس کے زمانے ولیعہدی میں اس کے باپ نے اس پر کافی ذمہ داریاں ڈال رکھی تھیں۔ وہ "شہزادہ ویلس" کا خطاب رکھتا تھا اور عوامی زندگی میں قدم رکھ چکا تھا۔ اپنے دور ولیعہدی میں اس نے تقریباً تمام دنیا کا مختلف اوقات میں تفصیلی سفر کیا۔ جس کا نقشہ بھی کتاب کے شروع اور آخر میں دیا گیا ہے۔ اس سفر کے دوران شمالی امریکہ میں اس کی ملاقات ایک شادی شدہ جوڑے سے ہوئی۔ مسٹر اور مسز سمپسن نے دورہ شمالی امریکہ میں اس کی خوب مہمان نوازی کی۔ اور اس کے ساتھ شکار وغیرہ میں شامل رہے۔ یہیں سے ایڈورڈ کی زندگی کا ڈرامائی منظر شروع ہوتا ہے۔ جانے کیوں مسز سمپسن نے اسے غیر معمولی متاثر کیا۔ اپنی خود نوشت سوانح حیات میں ہر جگہ وہ مسز سمپسن کا والہانہ انداز میں ذکر کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ دل کے آجانے میں کسی خاص وجہ کو دخل ہوتا ہے۔ اور اس لئے اس نے اس باب کا جس میں پہلی مرتبہ مسز سمپسن کا ذکر کیا ہے کا عنوان "دل اس کی وجہ رکھتا ہے" رکھا ہے مسز سمپسن کا ذکر پہلی مرتبہ وہ اس کتاب میں یوں کرتا ہے۔

"باوجود شاہانہ ٹھاٹ باٹ اور مصروفیات کے میری زندگی بڑی آزاد اور تنہا تھی اب تک میں اپنی طبیعت کا خود مالک تھا۔ جمہوری معاشرے کا ایک بگڑا دل شہزادہ، لیکن یہ میری زندگی کچھ خالی خالی تھی۔ مجھے کسی چیز کی تلاش تھی باوجود اس اہتمام کے میرا دل مطمئن نہیں تھا اس اثنا میں ایک چیز واقع ہوئی اگرچہ کہ اس وقت میں نے اسے محسوس نہیں کیا جو میری زندگی کے سارے دھارے کو موڑنے والی تھی وہ یہ کہ میری ملاقات ویلس وارفیلڈ سمپسن سے ہوئی:

اس کے بعد ویلس کے متعلق اس نے کیا رائے قائم کی وہ بھی اس کی زبانی سنیئے۔

خود میں سماج کے متعلق بہت بالغ شعور رکھتی تھی وہ سیاست اور روز مرہ بدلتے ہوئے حالات سے بخوبی واقف تھی ۔ میں اس کی اس عادت سے بہت متاثر تھا کہ وہ بعد از لندن کے چار چھ اخبارات برابر پڑھتی تھی ۔ اور وہ بھی مفصل اس کے پاس ہمیشہ نئی نئی کتابیں ہوتی تھیں اور تعیش کے متعلق اس کی معلومات بہت وسیع تھیں ۔ اس کا بات کرنے کا سٹائل بڑا متاثر کن تھا ۔ اور دل کو خوش کر دینے والا تھا مگر مجھے اس کی جو عادت سب سے زیادہ پسند آئی وہ اس کی ہار نہ ماننے کی عادت تھی ۔ جب بھی وہ کسی بحث کے دوران اپنی بات کو منوا نہ سکتی تھی تو کبھی بھی ناامید نہ ہوتی تھی ۔ یا جھینپتی نہیں تھی ۔ لیکن یہ تمام چیزیں نہ بھی ہوتیں تب بھی ہماری دوستی مستحکم ہونے کیلئے ۔ ایک چیز کافی تھی ۔ اور اس کے لئے میں ہمیشہ ویلیں کا شکر گزار رہونگا ۔ اور وہ چیز تھی ویلیں کی یہ جاننے کی عادت کہ شہزادہ ویلس (ایڈورڈ ہشتم) اپنے فرائض کس طرح انجام دیتا ہے جیسا کہ میں نے پہلے ہی کہا ہے ویلیں کسی شکل و صورت کے اعتبار سے زیادہ قابل توجہ نہ تھی اور عمر کے جس حصے میں ایڈورڈ سے اس کی ملاقات ہوئی تھی وہ ویسے بھی عورت کی زندگی کا ایک ڈھلتا ہوا حصہ ہوتا ہے ۔ ایڈورڈ جب پہلی مرتبہ اس سے ملا تو اس کی عمر چالیس سے تجاوز کر چکی تھی اور اپنے شوہر سے طلاق لے کر وہ دوسرے شوہر کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی ۔ عمر میں وہ ایڈورڈ سے دو تین سال بڑی ہی تھی اور ایڈورڈ جتنا وجیہ تھا وہ اس کی پاسنگ بھی نہیں تھی ۔ کتاب میں ویلیں کی مختلف تصاویر ہیں جس سے ایک پڑھنے والا بخوبی اس کے خدوخال سے واقف ہو جاتا ہے ۔ وہ ایڈورڈ سے امریکہ میں پہلی مرتبہ ۱۹۳۱ میں ملی تھی اس کے بعد جب ایڈورڈ کو شہزادہ ویلس کا خطاب ملا تو اس وقت وہ جشن میں شرکت کرنے انگلستان آئی اور پھر یہیں بس گئی ۔ اسی اثنا میں ایڈورڈ سے اس کے مراسم زیادہ بڑھ گئے اور ان کے رومان کا ہلکا ہلکا چرچا بھی ہونے لگا ۔ برطانیہ کے اخبار تو خیر نہیں مگر امریکہ کے اخبارات اس سلسلے میں بہت پیش پیش تھے ۔ اور برابر رومان کی خبریں شائع کئے جا رہے تھے ۔ ایڈورڈ اپنے ملک کے دستور سے واقفیت کی بنا پر بہت پریشان تھا کہ کیا کیا جائے ۔ وہ ولی عہد تھا ۔ اپنے باپ کا قانونی وارث اس کے برخلاف ویلیں کو بھی وہ نہیں چھوڑ سکتا تھا اسی کشمکش میں ۱۹۳۶ میں اس کے باپ کا انتقال ہو گیا ۔ اور وہ انگلستان کا بادشاہ بن گیا ۔ اس دوران میں ویلیں نے

بھی اپنے دوسرے خوہر سے طلاق لے لی۔ اس طلاق کے بعد تو ان دونوں کے رومان کے چرچے کھلے بندوں ہونے لگے، اور ویلس نے مصلحت کی بنا پر انگلستان چھوڑ دیا اور فرانس چلی گئی ادھر وزیر اعظم بالڈوین اور پارلیمنٹ، ایڈورڈ کی اس شادی کے سخت مخالف تھے بآخر بالڈوین نے اس سے ایک آخری ملاقات کی جس کے مکالمے بے حد دلچسپ ہیں۔ بالڈوین نے اس سے رسمی گفتگو کے بعد مطلب پر آتے ہوئے پوچھا۔

"سر ۔ تو پھر آپ نے اس کے متعلق کیا فیصلہ کیا؟"

"فیصلہ؟ میں اس سلسلے میں خود کافی فکر مند ہوں، بہر حال مجھے کوئی ایک چیز تو آخر میں منتخب کرنی ہی ہوگی۔ ۔ بادشاہت یا ویلس"!

"سر ۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی اگر آپ اس میں سے بادشاہت کا انتخاب کریں گے"۔

"نہیں مسٹر بالڈوین میں ان میں سے ویلس کو منتخب کرتا ہوں۔"

"اور اس کے فوراً بعد اس نے دست برداری ایکٹ پر دستخط کر دیئے۔ جس کی رو سے وہ نہ صرف برطانیہ کے تخت سے محروم کر دیا گیا بلکہ مستقبل میں اس کی اولاد کو بھی اس کا حق نہیں پہنچ سکیگا۔ اس رات اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو چارج دیدیا اور وہ جارج ششم کے نام سے تخت نشین ہوا جارج ششم نے بادشاہ ہونے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے بھائی کو ونڈسر کا علاقہ دیکر اسے ڈیوک آف ونڈسر کا خطاب دے دیا۔ اور اس طرح ایڈورڈ ہشتم ڈیوک آف ونڈسر بن گیا اور آج بھی اس نام سے مشہور ہے۔

ایڈورڈ ہشتم کو اس رات ایک خصوصی جہاز کے ذریعہ فرانس بھیج دیا گیا۔

اس وقت اس کے دل ودماغ میں جو جذبات موجزن تھے اس کا ذکر اس نے یوں کیا ہے

اور ۱۲ دسمبر ۳۶ء کی رات کو ۲ بجے ہمارا جہاز برطانوی ساحل چھوڑ رہا تھا۔ برطانوی ساحل کو پیچھے چھوڑتے ہوئے میرے ذہن میں کئی جذبات موجزن تھے۔ تخت چھوڑنے کا خیال میرے لئے اتنا اذیت ناک نہیں تھا جتنا خود اپنا ملک چھوڑنے کا۔ میں جانتا تھا کہ ایک وقت میرے پیچھے سارا برطانیہ تھا۔ اور آج میں اکیلا ہوں لیکن ایک بات مجھے مطمئن کئے ہوئی تھی اور یہ کہ سیاست پر محبت نے فتح پائی تھی۔"

فرانس میں ویلیس پہلے ہی سے موجود تھی۔ وہاں سے وہ دونوں امریکہ چلے گئے شادی انھوں نے غالباً فرانس ہی میں رچائی تھی۔ جون ۱۹۳۷ء سے لیکر نومبر ۱۹۳۹ء تک وہ پھر انگلستان نہیں آیا۔ تخت سے دست برداری کے بعد پہلی بار وہ اپنے بھائی جارج ششم کی موت پر ۱۹۵۲ء میں انگلستان آیا اور پھر یہیں سے ۱۹۵۰ء میں کیسل اینڈ کمپنی لمیٹڈ سے اپنی زیر بحث خودنوشت سوانح حیات "ایک بادشاہ کی کہانی" چھپوائی۔

تو یہ تھی ایڈورڈ کی کہانی جو اس نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں ہمیں سنائی ہے لیکن اگر اس کتاب میں بھی یہی کچھ ہوتا تو کچھ خاص بات نہ ہوتی مگر خوشی کا مقام ہے کہ اس کی سوانح حیات میں اس واقعہ کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے اور اس کی وجہ سے اس کی اہمیت غیر معمولی بڑھ گئی ہے۔ اپنی اس کتاب میں اس نے شروع سے آخر تک تمام واقعات بہت تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ اس کتاب سے ہمیں انگلستان کے شاہی ماحول کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک شہزادے کی زندگی کس طرح پروان چڑھتی ہے اس کا ایک خاکہ ہمارے ذہن میں آجاتا ہے۔ جس وقت وہ پیدا ہوتا ہے اس وقت سے لیکر اس نے تمام واقعات بہت تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ اور اس وجہ سے کتاب کافی ضخیم ہو گئی ہے۔ اس کتاب کی ایک اور خصوصیت متعدد تصاویر ہیں۔ ان تصاویر کو دیکھتے ہوئے ہمیں اس زمانے کی شان و شوکت اور رکھ رکھاؤ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں جہاں شاہی حالات اور ماحول سے ہمیں واقفیت ہوتی ہے وہیں برطانوی دستور کے بھی بہت سے اچھے اور برے نکات سامنے آتے ہیں بعض جگہ ایڈورڈ اپنے بے باک سٹائل سے وہاں کے دستور پر اپنے مخصوص انداز میں تنقید کرتا ہے۔

مثلاً وہ ایک جگہ لکھتا ہے: "برطانیہ کی پارلیمنٹ میں جب صدر مملکت تقریر کرتا ہے تو اور کان یہ دیکھتے ہیں کہ وہ کیسے کہتا ہے۔ (کیونکہ تقریر تو وزیر اعظم کی لکھی ہوئی ہے)۔ اس کے برخلاف امریکہ کا صدر مملکت جب سینیٹ میں تقریر کرتا ہے تو اور کان یہ دیکھتے ہیں کہ وہ کیا کہتا ہے"۔

یہاں ایڈورڈ نے دستور برطانیہ کی بڑی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور خاص بات جس نے اس کتاب کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے وہ ہے مصنف کا خاص انداز بیان ہے۔ اس کتاب کی زبان بڑی خاص ہے۔ اور سٹائل ایڈورڈ کا اپنا منفرد ہے۔ مثلاً وہ اس کتاب کو جبکہ وہ پیدا ہوا تھا، یوں شروع کرتا ہے
موسم گرما کی ایک شام میں تخت برطانیہ کا ہونیوالا بادشاہ اپنی قیام گاہ وہائٹ لاج کی لائبریری میں کچھ پڑھ رہا ہے یا پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ انتظار کرتے ہوئے کہ اس کی بیوی کو بچہ ہونے والا ہے۔ اس اثنا میں اسے بچہ پیدا ہونے کی اطلاع ملتی ہے اور وہ اپنی ڈائری میں تیزی سے لکھنے لگتا ہے۔ وہائٹ لاج ۲۳ رجون ۱۸۹۴ء ۱۰ بجے صبح ایک پیارا سا بچہ پیدا ہوا جسکا وزن آٹھ پونڈ تھا اور جسے دیکھنے مسٹر کونیٹھ (وزیر داخلہ) تشریف لائے دیکھا آپنے اس نے اپنی پیدائش کے واقعے کو کتنی دلچسپ پیرائے اور کتنے اسٹائلش طریقہ پر بیان کیا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی پیدائش کے دور کا بڑا عمدہ تجزیہ کرتا ہے: جب میں پیدا ہوا اس وقت یورپ میں بیس بادشاہ حکمراں تھے اب صرف چھ باقی رہ گئے ہیں اس کے علاوہ گلیڈسٹن (لبرل پارٹی کے لیڈر) سیاست سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ جب میں آٹھ سال کا تھا تو پہلی مرتبہ بجلی کا استعمال ہوا اس کے بعد میں گھوڑوں کی بگی کی بجائے موٹر میں بیٹھا اور اس کا گراما فون سنا۔
اور جب میں پندرہ برس کا تھا تو پہلی مرتبہ آسمان پر ہوائی جہاز اڑتے ہوئے دیکھا اور تیس سال کی عمر میں ریڈیو سے آواز سنی۔ ساری کتاب کا یہی حال ہے۔ بار بار کتاب میں ایسے جملے ہماری نظر سے گزرتے ہیں جن سے ہمیں ایڈورڈ کے اسٹائل کی پختگی کا پتہ چلتا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی زبان پر کتنی دسترس رکھتا ہے۔ یقیناً انگریزی ادب میں ایک خود نوشت سوانح نگار کی حیثیت سے ایڈورڈ کا نام زندہ رہیگا اور ایک سچے پریمی کی حیثیت سے تو وہ بیسویں صدی کی مشہور اور منفرد شخصیت ہے۔ ویسے یہ کتاب اس نے صرف اپنی پریم کہانی بیان کرنے کیلئے ہرگز نہیں لکھی۔

انشائیہ



بکری

عرفانہ شرف

بکری کو ادب میں وہ مقام نہیں مل سکا جس کی وہ مستحق ہے، باوجودیکہ اس کا مطالعہ بہت وسیع اور مشاہدہ نہایت تیز اور باریک ہے۔ وہ دیگر ناقدین فن کی طرح کتابوں کو صرف چرنا ہی نہیں جانتی۔ بلکہ مطالعہ اور مشاہدہ کے دوسرے اہم لوازمات کو بھی بحسن و خوبی برتنا جانتی ہے۔ ہری بھری کول دوب کو دیکھتے ہی اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور وہ ایک مشاق اور باذوق قاری کی طرح نہایت سلجھے ہوئے انداز میں فطرت کی لکھی اس سبز جلد والی کول کتاب پر منہ مارنا شروع کردیتی ہے۔ وہ کسی جلد باز قاری کی طرح ساری کی ساری کتاب کو ایک ہی جھونک میں نہیں چر جاتی بلکہ کچھ ابواب پر (مع دیباچہ کے) منہ چلانے کے بعد چرنا یکلخت بند کردیتی ہے اور تب کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر نہایت اطمینان سے جگالی کرنا شروع کردیتی ہے گھاس کے ایک ایک تنکے کو خوب کترتی ہے چباتی ہے پیستی ہے اور اس میں اپنا لعاب دہن ملا کر اسے خوب نرم اور ملائم بناتی ہے۔ گویا وہ ان ابواب پر نہایت جانفشانی اور جگر کاوی کے ساتھ غور و خوض فرما کر انہیں اپنے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں محفوظ کرلیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بکری کبھی بدہضمی کا شکار نہیں ہوتی جو ہمارے ادبا اور شعرا کیلئے ایک مستقل اور نہایت تکلیف دہ آزار بن چکا ہے۔

ہرچند کہ بکری کو ادب میں وہ مقام نہیں مل سکا جس کا وہ صحیح معنوں میں استحقاق رکھتی ہے لیکن یہ بات کسی بکری کے لئے اگر باعث صد افتخار نہیں ہے تو موجب اطمینان و تسلی ضرور ہے کہ بکری دنیا میں وہ واحد جانور ہے جس کے نام کوئی کتاب معنون کی گئی ہو، نسیم حجازی بکریوں کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا ادیب ہے جس نے اپنی مشہور کتاب "سو سال بعد" کا انتساب گاندھی جی کی اس بکری کے نام کیا ہے۔ جسے وہ اپنے ساتھ انگلستان لے گئے تھے لیکن ایک ترقی پسند بکری کا خیال ہے کہ چونکہ وہ گاندھی جیسے عظیم شخص کی بکری تھی۔ اس لئے وہ

کتاب اسی کے نام معنون کی گئی۔ مگر وہی بکری اگر کسی "نام والے" یا "کالو بھنگی" کی ملکیت ہوتی تو بیچاری اسی گمنامی کے تاریک غار میں پڑی ہوئی ہوتی جیسے بکریوں کو عام شکایت ہے کہ یہاں گھوڑے کتے اور یہاں تک کہ گدھے پر درجنوں کتابیں لکھی گئیں۔ وہاں خدا کے کسی نیک بندے کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ بکری پر ایک آدھ مضمون ہی لکھ مارتا۔ ہر چند کہ ارباب فن نے بکری کے ساتھ سخت ناانصافی اور غیر روا داری کا سلوک کیا۔ بکری نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور گوناگوں خوبیوں کے بل بوتے پر عوام کے دلوں میں گھر کر لیا اور بعد مرے اور محاورات کی زبان میں پلنے کے لئے ایک نمایاں مقام حاصل کر دیا۔

شیر اور بکری کو آج تک کسی نے ایک گھاٹ پانی پیتے نہیں دیکھا۔ ایک بار سیٹھ تھیٹریکل کمپنی کے مالک کاؤس جی پلٹن والا نے آغا حشر کاشمیری کے ایک ڈرامہ میں شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پانی پیتے ہوئے بتانے کی کوشش کی تھی لیکن یہ کوشش بھی سعی رائگاں ہی ثابت ہوئی۔ اسے بکری کی بد نصیبی پر ہی محمول کیا جانا چاہئے۔ کہ اس شخص کو جس نے شیر کی کھال پہن رکھی تھی، عین پانی پیتے وقت اس زور کی چھینک آئی کہ وہ شیر سے یک بیک شعر بن گیا یعنی تماشائیوں نے وہ زبردست داد دی کہ بقول شاعر۔ مشاعرہ لٹ گیا۔ اور سیٹھ کاؤس جی پلٹن والا کی سٹی گم ہو گئی

اس عظیم ناکامی کے باوجود بکری نے اس محاورہ کے ذریعہ تاریخ کی ان گنت کتابوں میں مختلف بادشاہوں اور راجاؤں کی زبردست خدمت انجام دی ہے یعنی ان کی انصاف پسندی اور رعایا پروری پر مہر تصدیق ثبت کی ہے مثلاً چنگیز خان ہلاکو خان، مہر گل، نادر شاہ مسولینی اور ہٹلر کے دور حکومت میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ

اگر دنیا کی کسی قوم نے بکری کے ساتھ انصاف کیا ہے یا یوں کہئے کہ حق دودھ ادا کیا ہے تو وہ یہودی قوم ہے۔ یہودیوں کے بارے میں یہ قصہ تاریخی حیثیت اختیار کر چکا ہے کہ سال کے کسی ایک دن، ایک بڑے تہوار کے موقعہ پر ایک سیاہ بھیڑ پکڑی جاتی تھی پھر یہودیوں کا سب سے بڑا مذہبی رہنما مختلف منتر پڑھ کر اپنی قوم کے سال بھر کے گناہ ان کے سروں سے منتقل کر کے اس کالی بھیڑ پر لاد دیتا تھا۔ پھر ایک بڑا الاؤ جلایا جاتا تھا۔ اور وہ گناہگار بھیڑ بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جھونک دی جاتی تھی اس طرح تمام یہودی قوم کے سال بھر کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا جاتا تھا مگر بکری کو یہودیوں کا یہ اقدام اس لئے پسند تھا کہ اس طرح ان کی ازلی دشمن مخلوق بھیڑ کو دنیا کی گناہگار ترین مخلوق بتا کر زندہ جلا دیا جاتا لیکن افسوس ہے ——————

انگریز قوم کی تاریخ کو مسخ کر دینے والی —— ذہنیت پر کہ انھوں نے اس تاریخی واقعے سے متاثر ہو کر ایک غلط اصطلاح گڑھ لی جس میں بلا کسی پس و پیش کے بکثیر کا مقام بکری کو دے کر اسے رسوا اور بدنام کیا، میرا اشارہ انگریزی کی اصطلاح (Scape-Goat) کی طرف ہے جس کا اردو والوں نے بعینہٖ ترجمہ کر لیا "قربانی کا بکرا" یہ بات تو فطری اور ناگزیر تھی کہ انگریزوں نے (Scape Goat) کے مصداق گوشت یعنی بکری کو ترجیح دی اور مشرق والوں کی زن کشی اور صنفِ نازک سے مستقل غیر ہمدردی نے انہیں اس اصطلاح کا ترجمہ کرنے میں خیانت پر آمادہ کیا۔ نتیجتاً (Scape-Goat) کا ترجمہ "قربانی کا بکرا" کیا گیا۔

راوی روایت کرتا ہے کہ بکری اور گدھے میں ایک زمانہ میں بڑا میل جول اور اتفاق تھا یا یوں کہئے کہ گاڑھی چھنتی تھی۔ دونوں نے ایک دن مل کر اپنی محبت کا بیج بویا، کلّہ پھوٹا، بیل پروان چڑھی بار آور ہوئی اور دنیا والوں نے ایک نیا پھل ظہور میں آتے دیکھا، انتہائی لذیذ نرم اور شیریں۔ بکری اور گدھے کی دوستی کی یہ یادگار خربوز کہلائی۔ لیکن بعد میں دونوں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور لوگوں کو اس نام میں ترمیم کرنی پڑی یعنی یہ خربوزے سے خربوزہ بن گیا جس کا تعلق اب نہ خر سے ہے اور ہی بوز سے۔

بکریوں میں آپس میں بڑا اتفاق پایا جاتا ہے۔ دو بکریاں آپس میں کبھی تو تو میں میں نہیں کرتیں، یہ تو انسان کا شیوہ ہے، بکریاں تو صرف میں میں کرنا ہی جانتی ہیں، انھوں اپنے حصہ کا سارا تو تو انسان کے لئے ودیعت کر دیا ہے بعض لوگوں کے نزدیک بکری بڑی غیور اور خوددار جانور ہے اس میں انا کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ دن رات میں میں کرتی رہتی ہے۔ بعض کے نزدیک یہ میں میں، بکری کے تصوف، زہد، خود مستی اور خدامستی پر دلالت کرتی ہے اور انا الحق کا براہ راست اردو ترجمہ ہے ان لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ دنیا کے تمام ممالک کی بکریاں بلا تفریق مذہب و ملت اردو بولتی ہیں اور اسی زبان میں شاعری کرتی ہیں۔

بکری کی یہ داستان حیات (جیسا کہ عام طور پر یہ رواج ہے کہ کسی بھی داستان کا خاتمہ کسی بڑے شاعر کے شعر سے کیا جاتا ہے) میں علامہ اقبال کے اس شعر کے ساتھ ختم کرنا چاہتا ہوں۔

یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی ۔ دل کو لگتی ہے بات بکری کی

کنول موت کے منہ میں

شیام کنول

جناب یہاں کنول سے مراد نا چیز نہیں بلکہ وہ کنول ہے جو کیچڑ میں اگتا ہے اور شفاف پانی کی سطح پر مسکراتا ہے۔ اور تیرتا نظر آتا ہے۔ کیچڑ اور دلدل میں جنم لینے کے باوجود اپنے حسن کی ملاحت اور خوبصورتی کے سحر سے نہ جانے کتنے دلوں کو گھائل کرتا ہے۔ ان کو تڑپاتا ہے اور پھر ان کی تڑپ پر مسکراتا ہے۔ میں اسی کنول کی بات کر رہا ہوں

آپ شاید سمجھ رہے ہوں گے کہ کنول ایک قومی پھول ہے۔ اور اس ناطے سے میں اس کی اہمیت پر کچھ ملا اس شرح کر کے آپ کو بور کروں گا۔ نہیں جناب ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کے بعد غالباً آپ یہ سوچنے لگیں گے میں کنول کی خوبصورتی اور اس کے اقسام وغیرہ کے بارے میں کچھ کہوں گا۔ پہلی بات یعنی خوبصورتی کے تعلق سے ممکن ہے۔ کہ دوران گفتگو کوئی ایسی بات نکل آئے جس سے میں اس کی "خوبصورتی" کا کچھ حلیہ ذکر کر بیٹھوں۔ کیونکہ کنول مجھے صرف پسند ہی نہیں بلکہ ایک طرح سے مجھے اس سے عشق ہے۔ اب کوئی بتائے کہ اپنے محبوب کے حسن کی تعریف میں چند کلمے نکل جائیں تو خطا کیا ہے؟۔ جناب یہ تو کنول کی بات ہے جو بلا شبہ خوبصورت ہوتا ہے اور جس کے دل پذیر حسن سے منکر ہونا ممکن نہیں۔ ہم نے تو اس دنیا میں ایسے بندگان خدا دیکھے ہیں جو گرگٹ تک کی تعریف سے نہیں چوکتے۔ گرگٹ جو رنگ بدلتا ہے اس عظیم ترین دنیا میں کسی وقت بھی اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ آپ نے کبھی گرگٹ دیکھا ہے۔ اگر نہیں دیکھا ہے تو چینی حکمرانوں کو دیکھئے جو گرگٹ کی طرح ثابت ہوئے ہیں۔ ہاں اب یہ بتانا مشکل ہے کہ رنگ بدلنا چینی حکمرانوں نے گرگٹ سے سیکھا ہے۔ یا گرگٹ نے چینی حکمرانوں سے کیونکہ اس رنگ بدلنے اور فریب دینے کی دوڑ میں کوئی ایک ڈگری بھی آگے پیچھے نظر نہیں آتا۔

تو یہ ہے! بات کنول کی ہو رہی تھی۔ اور بیچ میں یہ کمبخت گرگٹ اور چین آ ٹپکے لیکن
جناب اس میں میرا کیا قصور؟ اس زرد نسل نے دوستی کی آڑ میں جو فسادی ہے وہ ہر ہندستانی کے
دل و دماغ میں کچھ اس طرح پیوستہ ہو گئی ہے کہ دل و دماغ کچھ سوچنے سے قبل اس عیار نسل
سے دوچار ہوتے ہیں ایسی صورت میں بات میں بات بن جائے۔ تو کیا بات ہے۔ لیکن خدارا
کہیں آپ مجھ سے یہ نہ پوچھ بیٹھیے کہ کیوں بھئی کچھ ہندستانی (جنھیں میں نسلاً صرف ہندستانی
تسلیم کرتا ہوں لیکن ذہنی طور پر ....) چین کو حملہ آور تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں اس
کی وجہ کیا ہے؟ یہ بات تو میں دیدہ پردہ ہی سمجھتا ہوں کہ ان سے مگر ان سے بھی نہیں ان کے
بیرونی آقاؤں سے پوچھنے والی بات ہے کہ وہ آخر ایسا کیوں کہتے ہیں؛ نہ کہ کنول سے ...
لیجیے بات پھر کہیں سے کہیں چلی گئی۔ یہ بات نہ ہوئی شیطان کی آنت ہو گئی۔ تو صاحب
میں عرض کر رہا تھا کہ کنول مجھے بے حد پسند ہے سفید سرخ اور نیلے کنول، نیلے پانی کی چادر
پر مسکراتے دیکھ کر میرے دل کو نہ جانے کیا کیا ہونے لگتا ہے۔ یعنی بقول شخصے مرغ بسمل کی طرح
پھڑپھڑانے لگتا ہے۔ کسی تال میں مسکراتے ہوئے کامنی سے کنول دیکھ کر میرا من چاہتا ہے
کہ ان کی تمام پنکھڑیوں کو نوچ کر اپنے دامن میں سمیٹ لوں ان کی تمام خوبصورتی سمیٹ کر
کر اپنے دل میں سوئی ہوئی امنگوں کو تسکین دے لوں۔ میری ان باتوں کو ذہن نشین کرتے
ہوئے یقیناً آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں ایک ظالم اور ایذا رساں انسان ہوں، کیوں صاحب
ہے نا یہی بات؛ لیکن جناب گزارش یہ ہے کہ ایسا فیصلہ کرنے میں عجلت نہ کیجیے
اب مجھے آپ ظالم یا ایذا رسانی رساں قرار دینے سے پہلے اپنے ڈرائنگ روم پر ایک طائرانہ
نظر ڈالیے، وہ دیکھیے، وہ رہا رنگ برنگے پھولوں سے سجا ہوا آپ کے ڈرائنگ روم کے
سجاوٹ کو دوبالا کرنے والا حسین گلدستہ۔ کیوں جناب ہے نا؛ یہ انسان بھی بڑا عجیب و
غریب جانور ہے۔ روز اول سے حسن اور نزاکت اس کی کمزوری رہی ہے۔ وہ سدا چاہتا آیا ہے
کہ دنیا جہان کا حسن سمٹ کر اس کے زیر نگیں ہو جائے۔ جہاں کہیں بھی وہ حسن کا پرتو پاتا ہے
سمیٹ کر اپنی زندگی کی زینت بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ کبھی
نہیں سوچتا کہ اپنے جذبات کی تسکین کی خاطر حسن اور نزاکت کو روند رہا ہے۔

فرض کیجئے آپ کہیں سے کوئی خوبصورت پھول توڑ لائے ہیں، کسی نے آپ کو ٹوک
دیا کہ کیوں صاحب یہ ستم آپ کیوں ڈھا رہے ہیں۔ اس کے حسن کی نزاکت بھرے اس کی زندگی کے
درپے کیوں ہیں۔ تو آپ بڑی متانت سے مسکراتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں فرمائیں گے
جناب میں نہ توڑتا تو کیا ہوتا، کوئی اور توڑ لے جاتا۔ اور پھر ..... اور پھر اگر کوئی نہ بھی توڑتا
تو بیچارے پھول کی زندگی ہی کتنی ؟ آج نہیں تو کل مرجھا جائیگا۔ تو اس حسن اور نزاکت سے
محروم ہو جائے گا۔ پھر ہوا کا کوئی جھونکا آکر اسے سپردِ خاک کر دیگا۔ یہ جواب پاکر ٹوکنے
والا سر لٹکا لیتا ہے۔ اور ان دو مقولوں پہ سوچنے لگتا ہے "حسن لازوال ہے" "حسن لمحاتی
ہے"۔ یہ دو متضاد قول اس کے لئے گرداب بن جاتے ہیں وہ اس گرداب میں چکراتا ہی رہتا ہے
کہ آپ پھول کو بڑی نزاکت سے توڑ کر اپنے کوٹ کے کالر میں ٹانک لیتے ہیں یا اپنی انگلیوں کے
درمیان جنہیں آپ بہت نازک اور خوبصورت تصور کرتے ہیں داب کر رفو چکر ہو جاتے ہیں
اب اگر کوئی ایمان کی کہے کہ دنیا کا دستور ہی یہ ہوتا ہو تو اکیلا میں کس طرح جابر کہلاؤں گا!
اور پھر لطف تو یہ ہے کہ میں نے ابھی یہ جرم کیا ہی نہیں ہے۔ نیت البتہ کئی بار کر چکا ہوں اب
آپ اسے میری بدقسمتی سمجھ لیجئے یا اور کچھ اور کہ ابھی کنول کو اپنی نازک یا بھدی جیسی بھی آپ
سمجھیں تصور پر کوئی پابندی نہیں ہے، انگلیوں سے چھونے تک کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔ کبھی
باغ تال میں کھلے ادھ کھلے کنول دیکھ کر من چاہتا ہے کہ چھلانگ لگاؤں اور ڈھیر سارے کنول توڑ لوں
کہ جی کو تسکین حاصل ہو۔ لیکن جہاں کنول کو دیکھ کر میرا من فعل اشتیاق ہوتا ہے وہیں پانی کو دیکھ کر میری،
ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ جاتی ہے۔ اور کنول کی تمنا اس لہر کے ساتھ جانے کہاں بہہ
جاتی ہے بہرحال کنول کے لمس کی تمنا اس وقت میرے دل میں انگڑائیاں لے کر تڑپا رہی کہ
جب سے میرے دل میں ارمانوں کا خانہ خشت ہوا ہے

تمنا کنول کو پا لینے کی آرزو کی تکمیل کا اور اس آرزو کی تکمیل کیلئے غیر ثابت منزل اقدام کا
اور اس بات کے احساس کا کہ کنول کو پانا کھیل نہیں ہے۔ یوں بیان ہوتا ہے کہ ہم پچھلے دنوں
بعزم حیدرآباد دگلبرگہ سے روانہ ہوئے۔ دگلبرگہ کا جغرافیہ یہ ہے کہ آندھرا اور
مہاراشٹرا کے بارڈر پر واقع ہے۔ اور یہاں سے سفر بذریعہ بس کرنا پڑتا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں

ہوں گے کہ آندھرا اور مہاراشٹرا کا حساب کتاب الگ الگ ہے۔ دونوں کے کھانے بالکل علیٰحدہ ہیں اور ایسی صورت میں ظاہر ہے ہیں جیسے آپ دجانا ہو تو مہاراشٹرا سے آندھرا میں داخل ہو کر وہاں سے آندھرا کے حساب کتاب کے مطابق دوسری بس پکڑنی پڑتی ہے اس دوسری بس کو پکڑنے کیلئے لازماً دو چار گھنٹے انتظار تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ لذت انتظار سے محظوظ ہونے میں تو خیر کوئی حرج نہیں لیکن پتہ نہیں کیا بات ہے کہ نظام ساگر پہ مجھے جب بھی بس بدلنا پڑتا ہے۔ تو ایسا محسوس ہوتا ہے۔ میں ایک ملک کی سرحد سے دوسرے ملک کی سرحد میں داخل ہوتا ہوں اور اس احساس کے ساتھ ہی شدید تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ مجھے یہ صوبہ داری سرحدیں کبھی پسند نہ آئیں۔ جب کبھی ایسی سرحد سے دوچار ہوتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ جانے وہ دن کب آئے گا۔ جب ہمیں ایسی سرحدوں سے نجات ملے گی اور ہم صوبوں کے اعتبار سے بالاتر ہو کر صرف ہندوستانی رہ جائیں گے۔ خیر خواب یہ تو میرا اپنا احساس ہے۔ جو نقار خانے میں طوطی کی آواز کے مماثل ہے خدا کرے وہ دن جلد آئے کہ میری طرح سب ان چیزوں کو محسوس کریں۔ اور اندرونی تقسیم کا یہ روگ نابود ہو جائے۔ بہرحال جب میں نظام ساگر پہنچا تو پتہ چلا کہ انتظار کی گھڑیاں کافی طویل ہیں۔ بس میں اس انتظار کے وقت کا فائدہ اٹھانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے خیال آیا کہ نظام ساگر ڈیم ہی کی سیر کر لوں، اس نیت کے پیدا ہوتے ہی اپنا سوٹ کیس ایک ہوٹل والے کو سپرد کر کے تکمیل نیت کے لئے روانہ ہوا۔ چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں، ٹیڑھے میڑھے راستوں اور چھوٹے بڑے پتھروں کو پھلانگتا بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ ناگہاں ایک چھوٹے سے گڑھے پر نظر پڑی جو پانی سے لبالب بھرا ہوا تھا اور پانی کی سطح پر سرخ و سفید کھلے ادھ کھلے کنول مسکرا رہے تھے۔ اس ویرانے میں ایک چھوٹے سے گڑھے میں سبز سبز گھاس اور چوڑے چوڑے پتوں کے درمیان ایسے حسین چہروں "کولوں" نرالے انداز میں مسکراتا دیکھ کر جو حالت میری ہوئی ہے اسے بیان کرنا میرے بس سے باہر ہے کہ اپنے محبوب کو یوں تنہا اور بے نقاب دیکھ کر کیا دل نہ مچل اٹھے گا۔ کون اس دل پر تہمت دھرے گا۔ ہمارا دل مچلا اور ایسے مچلا کر جیسے شہرستان کی منصوبہ بندی کو دیکھ کر چاؤ ناؤ کا مچلا تھا۔ فرق صرف نیت کا

جب کنول کو حاصل کرنے کی آرزو نے ایک زوردار انگڑائی لی تو ایک ایڈونچرسٹ انسان
کے رکھ رکھاؤ کی تمام زنجیریں یکلخت کڑکڑا کر ٹوٹ گئیں وزدیدہ نظروں سے ہم نے چاروں
اور دیکھا آہستہ سے سینڈل اتارے پیر موڑے، اس کام سے فراغت پاکر بڑی احتیاط سے
پینٹ کو گھٹنوں تک چڑھایا اور کنول توڑنے کے بھرپور عزم کے ساتھ پانی میں اتر پڑے
قصہ ہمالیہ کی برف پوش چٹانوں پر قدم رکھنے کا دراصل یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ ادھر
ہم نے پانی میں قدم رکھا اور ادھر کیچڑ اور کائی نے اس طرح قدم بوسی کی کہ بس طبیعت باغ
باغ ہوگئی۔ ایک سرد لہر تن بدن میں اس طرح دوڑ گئی کہ ہمیں اپنے عزائم پر پانی پھرتا نظر
آنے لگا۔ لیکن جناب ہم نے کہا چاہے جو ہو آج تو ہم کنول توڑ کر ہی دم لیں گے نظروں
کے سامنے نیلے پانی پر کنول زیر لب مسکرا مسکرا کر کلوپطرا کی طرح ہمیں ترغیب دے رہے تھے
اور پیروں تلے سے دھنسا ہوا کیچڑ نکلنے کا صحیح مفہوم سمجھانے پر کوشاں تھا۔ خیر جناب! ہم نے
ہمت سے کام لیکر ایک قدم اور آگے بڑھایا اور ہمیں کنول کے بجائے دن میں تارے نظر
آنے لگے اور پینٹ کی کریز کے ساتھ ساتھ خود اپنی سلامتی بھی خطرے میں نظر آنے لگی۔ مرتا کیا نہ کرتا
اپنے عزائم پر نظر ثانی کرنے کا فیصلہ کیا اور کنارے پر لوٹ آئے۔ اور کنارے پر پہنچ کر اب
جو ہم اپنے پیروں پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ بزدلی اور پست ہمتی نے ہمیں کنول کی بجائے
ذلت اور خواری کے کیچڑ میں لت پت کر دیا ہے۔ ہمیں فوری طور پر سبق مل گیا ہے۔ کہ جو شخص
اپنے حوصلوں اور اپنے ارادوں کی تکمیل کی ہمت نہیں رکھتا اسے اسطرح کی ذلت سے دوچار ہونا
پڑتا ہے۔ اسی سبق نے ہمیں راجہ تیلب کا ہم رکاب کیا اور ہم "منجمد" کنول پر دوبارہ "حملہ"
کرنے پر کمربستہ ہوگئے۔ یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ انسان اپنی آرزوؤں کو یوں برباد ہوتا
کبھی نہیں دیکھ سکتا۔ جب کبھی اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ اس کی آن اور مان کا سوال
تو پھر وہ کرو یا مرو کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ لہٰذا تو جناب کم ہمتی کے باعث ہونے والی ذلت کا ہمیں
احساس ہوا۔ "تہذیب کی دھجیاں" یعنی پینٹ وغیرہ اتار کر ہم پورے عزم سے پانی میں اتر
پڑے پہلے ہی کی طرح کیچڑ اور کائی نے دہشت زدہ کرنے کی کوشش کی جان کے خطرے
کا احساس دلایا — پانی میں چھپے مینڈکوں نے دھمکانا چاہا، پانی کی گہرائی نے

موت کی تصویر پیش کی اور ریڑھ کی ہڈی میں سرسراتی سرد لہر نے جان عزیز کی حفاظت کو ابھارنا چاہا لیکن ہمارے قدم آگے بڑھتے ہی رہے۔ ہم ایک سفید کنول سے قریب تر ہونے لگے تو پانی کا پھیلا ہوا قریب دیکھ ہمارا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ معاً ایک بڑا سا مینڈک اچھل کر ہمارے سامنے پانی میں آگرا اس کی اس بدتمیزی کے نتیجے میں گدلے پانی کے بیشمار چھینٹے ہماری صاف شفاف قمیص پر داغ ڈال گئے چاہا کہ مینڈک کو اس گستاخی کی سزا دیں لیکن فوراً اس خیال نے کراہت پیدا کردی کہ اس کا پورا وجود گندگی سے لتھڑا ہوا ہے۔ یہاں پر اپنی بے بسی کو دیکھ کر چینیوں کی یاد آئی کہ اگر ہماری جگہ کوئی چینی ہوتا تو شفاف کنول پر توجہ دینے کے بجائے مینڈک پر ہاتھ صاف کرتا اور اپنے ناشتے کا انتظام کر لیتا۔ بہر حال مینڈک کی گندگی اور چینیوں کے تصور سے بالا ہو کر ہم کنول سے قریب ہونے کی کوشش کرنے لگے۔

جوں جوں کنول قریب آتا جا رہا تھا توں توں پانی کی گہرائی بڑھتی جا رہی تھی یہ احساس شدید ہوتا جا رہا تھا کہ کنول کو پانا کھیل نہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کنول درحقیقت موت کے منہ میں کھلتے ہیں اور یہ کہ آرزو کی تکمیل کیلئے موت کے منہ تک پہنچنا ہوگا۔ پھر خیال ہوا کہ مرد کامل تو وہی ہے جو موت کے منہ میں آرزو کی تکمیل کرے اس خیال نے ایک بار پھر ہمت بڑھائی۔ اور ہم نے آگے بڑھ کر کنول توڑ ہی لیا۔

کنارے پہنچ کر جب ہم نے اپنے کو کیچڑ اور کائی سے صاف کیا اور دوبارہ کپڑے زیب تن کر کے ہاتھ میں کنول لے کر ایک مسکراتی ہوئی نظر اس پر ڈالی تو ایسا محسوس ہوا جیسے کنول نہیں توڑا بلکہ ہمالیہ سر کیا ہے۔ جب ہمالیہ سر کرنے کی بات ذہن میں آئی تو آج کی اپنی کامیابی کے ساتھ ساتھ خیال گزرا کہ اگر ایسا عزم ہر ہندستانی پیدا کر لے تو کیا ہمالیہ کے تحفظ کا سوال کیا لداخ کی تیغ بستہ چوٹیاں۔ اور کیا چالیس کروڑ انسانوں کی ترقی کے منصوبے، ہر چیز ہر سوال عزم کے سامنے پست ہو کر رہ جائے۔ لیکن جناب بات دراصل عزم والی ہے مجھے تو موت کے منہ سے کنول نے للکارا تھا آج چالیس کروڑ ہندستانیوں کے عزم کو ان کے مسائل للکار رہے ہیں۔

زمستاں کی شب



اختر راہی
(بمبئی)

زمستاں کی شب ہے
سبھی سو رہے ہیں
زمیں کو پر اسرار چپ سی لگی ہے
بڑی خامشی ہے
مگر وقفے وقفے سے پولیس والوں کے ڈنڈے
صدا دے رہے ہیں
اور آوارہ کتے بھی چلا رہے ہیں
مگر گھر کی کھڑکی
کھلا کرتی ہے جو دوا گھر کی جانب
ابھی تک کھلی ہے
دوا گھر کے بالکل مقابل
جو میرے بدن کا جو پتلا کھڑا ہے۔
اسی کے احاطے میں سردی کا مارا ہوا ایک بوڑھا
جو ٹھنڈا پڑا ہے
زمانے کے سارے بکھیڑوں سے وہ بے خبر سو رہا ہے۔
جو میرے بدن کا وہ پتلا
اسی طرح جیسے کھڑا ہے
دوا گھر پہ سناٹا چھایا ہوا ہے
نہ ہے شور ماتم نہ آہ و فغاں ہے
سبھی سو رہے ہیں
زمیں کو پر اسرار چپ سی لگی ہے
بڑی خامشی ہے۔

کل کے نغمے

آغا جان اشک

تری تنقید ہے اے دوست بجا اور درست
مجھ کو اس بات سے خود بھی کوئی انکار نہیں
میرا نغمہ ہے فقط وقت کی آواز عجب
میرا نغمہ ہے فقط میرے ہی دل کی دھڑکن
اس میں موجود نہیں ہے ابدیت کا جلال
اس میں شامل ہی نہیں نور ازل کا پرتو
ایک شاعر ہوں پیمبر تو نہیں ہوں اے دوست
ایک بھی پرتو نہیں ختم سرود ہستی
ایک بھی پرتو نہیں رونق دنیا کا مدار
سیل نغمہ تو ہر اک قلب میں آسودہ ہے
جبر ماحول لگائے نہ اگر مہر سکوت
ہر گوالا ہے یہاں کرشن کنھیا پیارے
دیکھ ہر لمحہ نکھرتے ہوئے ماحول کو دیکھ
جبر کے داغ ہر اک آن مٹے جاتے ہیں۔
اور ابھرتے ہی چلے آتے ہیں دلکش خد و خال
یہ ہر اک لمحہ نکھرتا ہوا ماحول کا حسن
نغمۂ شوق کی تطہیر بھی کروائے گا۔
اک نئی تان نئے ساز کا موجب ہوگا۔
بدلے ماحول کے خوش وقت مغنی کی قسم
کل کے نغمے مرے نغموں سے حسیں تر ہوں گے

فصل آرزوؤں کی

ظفر اورکزئی

زندگی کیا ہے کشتِ ویراں ہے
آرزوؤں کے خوبصورت سے بیج
سینۂ نرم پر چھپائے ہوئے
دہقاں کی سرخ بالیوں کے عوض
بھوک کی برچھیاں اگائے ہوئے
زخم کے بنجر سے لوٹے ہوئے
کس عبارت سے سجائے ہوئے
غم کی پھیلی ہوئی گھنیری دھوپ
رنگ کے تار سر اٹھائے ہوئے
گرد کی چادروں میں رنج ہو
خون روتی ہے منہ چھپائے ہوئے
جیسے اور کنوار عمر ہونے کی طرح
جیسے کہ پہلے آیا نظر جھکائے ہوئے
زندگی کیا ہے کشت ویراں ہے
بیچتی ہے جو آرزوؤں کی ارض
کبھی تکتی ہے آسماں کو —
اپنی سوکھی زباں دکھاتی ہے
بدلیوں کو کبھی ہواؤں کو —
اور تڑپ کر پکارتی ہے کبھی —
ندیوں جھیلوں جوئباروں کو
کوئی دو بوند تک نہیں دیتا
اس کے سینے کے شعلہ زاروں کو
درد سے گھورتی ہیں برساتیں —
رحم آتا نہیں بہاروں کو

~~~

زندگی کیا ہے کشتِ ویراں ہے
اور ہم سب ستم زدہ دہقاں
باندھ کر اپنے پیٹ سے پتھر
تپتی مینڈھوں پہ مشتعل گریاں
اور کب تک فلک کو دیکھیں گے
اور کب تک رہیں گے یوں نگراں
کب تلک بادلوں کی پرچھائیں
کب تلک خواب موسمِ باراں
آؤ اپنی رگیں نچوڑ دیں ہم . . . . .
آؤ سر زدہ پر چھڑک دیں جاں
آرزوؤں کی فصل آنے تک
کچھ دنوں اور خونِ دل ارزاں

~~~

زندگی کیا ہے کشتِ ویراں ہے
اور ہم سب ستم زدہ دہقاں

تبدیلی



نہ چھیڑتی ہو مجھے تم، نہ کھلکھلاتی ہو
مری خوشی کیلئے صرف مسکراتی ہو

نہ تھا یہ ربط کبھی صبح کے ستارے سے
کہ اس کے ساتھ ہی بستر سے جاگ جاتی ہو

غزل کے شعر ابھرتے نہیں ہیں ہونٹوں پر
جو "موڈ" ہو تو کوئی گیت گنگناتی ہو

نہ جانے کیوں تمہیں پھولوں پہ پیار آتا ہے
کہ توڑنے کے عوض ان کو گدگداتی ہو

تمہاری چال میں اب احتیاط ہوتی ہے
ہر ایک بات میں سنجیدگی دکھاتی ہو

بظاہر اپنی نظر میں سنبھل گئی ہو تم
میں سوچتا ہوں کہ کتنی بدل گئی ہو تم

خاور بانکوٹی

"تاج محل"

نور محمد شوق پونوی

ارمغانِ عشقِ صادق میں جو ہی دارد کمال — در لباسِ تاج گشتہ بے مثال و لازوال

پھر تصور کو مرے حاصل ہے معراجِ کمال — لے اڑی پھر لامکاں کی سمت پروازِ خیال

پھر جمالِ مہر و مہ سے ہو گیا مسرور دل — پھر مئے پیمانۂ گل سے ہوا مخمور دل

ہے دلِ پر شوق کو عہدِ تمنا کی تلاش — یعنی ہے مدِ نظر مجنوں کو لیلیٰ کی تلاش

سامنے آنکھوں کے تصویرِ محبت آ گئی — سرخوشی سی اک جہانِ آرزو پر چھا گئی

دیکھ کر نقشِ وفا کو ہو گیا دل باغ باغ — وہ وفا جو ہے جہانِ عشق و الفت کا چراغ

عشق میں مطلق نہیں ہے امتیازِ این و آں — اس جگہ سب ہیں برابر کیا گدا کیا حکمراں

تاج کی تعمیر میں مضمر ہے اک شانِ حسیں — جس کو دل محسوس کرتا ہے کہہ سکتا نہیں

ہے وفا کی زندۂ جاوید اک تصویر تاج — اہلِ عالم سے لیا ہے جس نے تحسین کا خراج

ہاں وہی تاجِ حسیں اک پیکرِ ناز آفریں — شاعرِ مغرب جسے کہتا ہے "خوابِ مرمریں"[1]

صنعت و کاریگری کا ایک نقشِ کامیاب — تاج وہ جس کا نہیں ہے سارے عالم میں جواب

ماہِ کامل پر اگر ہے آسماں والوں کو ناز — تاج کی ہستی سے ارضِ خاک بھی ہے سرفراز

شاعرِ مغرب مجھے کہنا نہیں تیرا پسند — کیجئے کیوں کانچ کے صندوق ہی میں اسکو بند[2]

اہلِ الفت اس کے نظارے کو کرتے ہیں پسند — دیدۂ پر شوق میں رکھتے ہیں اسکو ہوشمند

ہے یہ اک آئینۂ آئینِ وفا کا دہر میں — ہو گیا جس سے وقارِ عشق دونا دہر میں

عشق کا ہے یہ کرشمہ اور محبت کا کمال — بخش دے جو ہستیِ فانی کو عمرِ لازوال

جذبِ کامل شوقِ بے پایاں وفائے بے مثال
گر یہ حاصل ہو تو ہے اے شوق الفت نہال

1- It's a dream in marble — 2 It but needs a glass case

مژدہ اے آزاد

جگن ناتھ آزاد

مژدہ اے آزاد! وہ جانِ بہار آ ہی گئی
جس کا تھا تیری نظر کو انتظار آ ہی گئی

وہ نگاہوں کا سکوں، دل کا قرار آ ہی گئی
رقص فرماتی ہوئی دیوانہ وار آ ہی گئی

پھر گلستاں کی فضا میں زندگی پیدا ہوئی
ہر گلستاں میں شمیمِ عطر بار آ ہی گئی

رنگ و بو کے بیکرانہ سلسلوں سے کھیلتی
گلستاں میں دخترِ فصلِ بہار آ ہی گئی

دل کے ہر ویران گوشے کو خبر کر دے کہ آج!
ایک ہستی مثلِ ابرِ کوہسار آ ہی گئی

بھیج دے یہ آرزو کے رنگ زاروں کو پیام
موجِ رحمت بن کے موجِ جوئبار آ ہی گئی

موسمِ گل بن کے میری آ گئی ہنگامِ صبح
گلستانِ روح میں روحِ بہار آ ہی گئی

آ گئی جس کے تصور سے الم کافور ہو—!
ہر خوشی کا جس پہ ہو دار و مدار آ ہی گئی

اپنے چہرے پر لئے حسنِ ازل کی جھلکیاں
اپنے دل میں لے کے لطفِ بیکنار آ ہی گئی

آ گئی آخر ترے حسنِ نظر کی آبرو
آبرو کے حسن کی آئینہ دار آ ہی گئی

صدرِ بزمِ نازنیناں، فخرِ بزمِ گلرخاں
مہ جبینوں کے جہاں کی تاجدار آ ہی گئی

آ گئی وہ جلوہ افزائے جمالِ صبح و شام
اک تجلی زینتِ لیل و نہار آ ہی گئی

تذکرہ جس کا نہ تیری شاعری میں ختم ہو
گلشنِ [illegible] کی وہ صبحِ بہار آ ہی گئی

مدتوں جیسے کوئی طائر جہاں چہکا نہ ہو
اس چمن میں صورتِ بانگِ ہزار آ ہی گئی

حور طلعت، ماہ وش، خورشید رو، زہرہ جمال
نور پیکر، گلبدن، عنبر عذار آ ہی گئی

جس کو بس اپنا سکا تیرا ہی دورِ سازگار
آج پھر مانندِ بختِ کامگار آ ہی گئی

تاکہ تیری زندگانی میں خلا باقی نہ ہو!
صانعِ حسنِ ازل کی شاہکار آ ہی گئی

سہارا

اختر نظمی

اسی وادی کے آس پاس کہیں

اک تنہا اداس سا گھر تھا
اس کھنڈر سے لگا ہوا گھر تھا
جس کو ٹوٹے دلوں کا پیار کہیں
آرزوؤں کا اک مزار کہیں
اس نے دیکھا تھا زندگی کا چلن
اس نے محسوس کی تھی مری تھکن
مجھ پہ سایہ کئے ہوئے تھا وہ
اک سہارا دیئے ہوئے تھا وہ

کتنی یادوں کے خشک گلدستے
اپنی آغوش میں سجائے ہوئے
وہ مرا انتظار کرتا تھا
کسقدر مجھ سے پیار کرتا تھا

ڈھونڈتا پھر رہا ہوں اس کا نشاں
وہ کہاں گم ہے؟ کھو گیا ہے کہاں؟

گیت وعدوں کے انتظار کے گیت
پیار کے گیت اعتبار کے گیت
ہر ترانہ یہیں سے ابھرا تھا ....
ہر فسانہ یہیں سے ابھرا تھا

مرگ امید و اعتبار کے بعد
اک مدت کے انتظار کے بعد

مونس و غمگسار تھا میرا
[illegible] رازدار تھا میرا
[illegible] کی صدا سے واقف تھا
[illegible] سے واقف تھا

وہ بھی بے بس ہو گیا ہوگا
اس کھنڈر میں ہی کھو گیا ہوگا

اک سہارا تھا آج وہ بھی نہیں

چاند پر بم مارنے والوں سے خطاب

ظریف نظامپوری

اک آدمی کو زمیں سے ہو آئے یہ کیا ہے
رفتار تخیل ابھی راکٹ سے سوا ہے
ہم تک تو ہمارے ابھی کی پہنچ نہیں
وہ فاصلہ بھی معمہ سا ہے جو دنیا میں گیا ہے
یہ حالانکہ اوضح ابھی طے نہ کر سکے
دو چاندوں کے بیچ خلا ہے کہ بلا ہے
دو سو کروڑ میل کی رفعت پہ ہے فلک
پہنچا ہے جو فرشتہ ابھی کب کا چلا ہے
جاری ہو فرشتوں کی جو پرواز تمام دن
معیار کا فی سکنڈ میں گر کہیے تو کیا ہے
اس فاصلے سے سات فلک تک یہ تو ہو گر
چودہ ارب کی دوری کا تخمینہ دھرا ہے
ایٹمونس آنکھ جھپکی میں آتا ہے فرشتہ
بتلایئے بجلی ہے جلا ہے کہ ہوا ہے
نہ ایسی ریڈیم ہے نہ مقناطیس نہ پارا
اک زندہ سی مخلوق ہے ایجاد خدا ہے
باہر ہے حد بینوں کے شیشوں کی گرفت سے
ایتھر کی موج تند کی سرعت سے سوا ہو
دانش اس بہاؤ کی مقدار سے عاری
اور بیچ یہ رکاوٹ دکھانے سے رکا ہے

امریکہ کی سوغات یہ روس بتائے گی
کہ چاند کا عزم یہاں فیروز ہوا ہے
ناقص ہیں ابھی آپ کے آلات ترقی
بم چاند پہ ماریں گے یہ ارشاد بجا ہے
ضمیر میں یہ نقش ہے کہ دنیا فنا کرے
انسان بنانے کو جا بجا ہے وہ کیا ہے
عاقل کے لئے بم ہے یہ اک مصرع ظریف
لے بیٹھ ناقص وہ مٹا ہے وہ خدا ہے

صبحِ معراج

مہر مصلائی

یوں تو ہیں رات کی معراج کی واقف دو جہاں
صبحِ معراج کا اک واقعہ کرتا ہوں بیاں

ابھی شاہد نے شہادت کا کیا تھا اعلان
اور موضوعِ سخن تھا یہ مقدس عنوان

نفس کہنے لگا نفسانی اپج کا ہے فسوں
عقل کہنے لگی "ایں امر محال است و جنوں"

تجربہ کہنے لگا سیرِ فلک نا ممکن!
آدمی اور ہم آہنگِ ملک۔ نا ممکن

جاننے والے تو پہچان گئے، مان گئے
جو نہیں جانتے تھے ان کی ادا جان گئے

جہل سے پایا تھا بوجہل نے وافر حصہ
وہ سمجھنے لگا معراج کو فرضی قصہ

خود تو بہکا ہی تھا اوروں کو بھی بہکانے لگا
اور معراج کی تضحیک پہ اکسانے لگا

اس کو معلوم تھی صدیق کی عالی نسبی
تھے دل و جاں سے جو شیدائے رسولِ عربی

وہ صداقت [illegible] ان میں
[illegible]

ہم [illegible] تھا بوجہل بھی دل سے قائل
کیوں نہ ہو یار [illegible] سے تھے مائل

اس کی کوشش تھی کہ صدیق صداقت چھوڑے
ثانیِ اثنین محمد کی رفاقت چھوڑے

ابھی صدیق تک آئی نہ تھی معراج کی بات
جا کے بوجہل نے پوچھا کہ سنی آج کی بات

کہتے ہو غیب پہ ایمان ہے تمہارا ایماں
[illegible] غیب ہی کی سیر کر آئے [illegible]

عرش و کرسی و خدا، دوزخ و جنت دیکھے
انبیا اور فرشتوں کی جماعت دیکھے

ایسا دعویٰ کرے کوئی تو کبھی مانا تم
سن کے بوبکر نے فرمایا کہ [illegible] ہیں ہم

یوں وہ کرتے ہیں [illegible] ترے پیمبر
رات بھر [illegible] کر آئے ہیں وہ جبریل کے

سوچ صدیق کی [illegible] دیتے [illegible] کو
اور [illegible] کہا صرف قسم کھانے کو

جانے اس مقصدِ مکر کی قسم کی وقعت
جانے اس [illegible] صداقت [illegible] قسم کی وقعت

میں جنتم لکھا ہی کے کہتا ہوں کہا مفسر نے ۔ بولے صدیق کہ حق ہے جو کہا مرشد نے
وحی والہام کا مورد ہے خدا کا محرم ۔ اس کی ہر بات حقیقت ہے قسم ہی کی قسم
وہ خدا کا ہے رسول اور رسولوں کا امام ۔ اس کے حق ہونے میں قائم ہے حقیقت کا نظام
تجربۂ نفس و خرد رہ گئے سب ہنس کے ۔ سن کے ایمان کی ایکار سے یہ کیا کہتے
صبح معراج کا یہ واقعہ ہے مشعل راہ ۔ ذہن اگر پاک ہو دل صاف ہو روشن ہوگا
تجربۂ نفس و خرد راہ جو ہموار کریں ۔ رہنمائی میں ہم ایماں کی اسے پار کریں

صبح معراج ہوئی تھی شب معراج کے بعد
مہر آمادہ ہو آئے گا کل آج کے بعد

انحراف

نشاطِ ادیب

میری محبوب آ ملے جی میں یہی !
اب تو بس تیری محفل سے اٹھ جاؤں میں

جانتا ہوں کہ بہتی ہے ہر گام پر
نشۂ و کیف و مستی کی گنگا یہاں

جانتا ہوں کہ دل کھاتی ہے ہر گھڑی
ناز و انداز کی ایک تمنا یہاں

جانتا ہوں تری زلف کے سائے میں
پرورش پاتے ہیں لاکھ جیون یہاں

اور جنبش میں اے جان تری چشم کی
ڈھلتے ہیں سینکڑوں جسم اور تن یہاں

مجھ کو معلوم ہے لمس سے تیرے ہاں
جاگ اٹھتی ہے ہوش و خرد کی کلی

ساز پر چھیڑتی ہوں کے تری جانِ جاں
جھوم کر رقص کرتی ہے یہ زندگی !

جانتا ہوں کہ جھکتے ہیں قرباں ترے
نقشِ پا پر اجنتا کے نقشِ حسیں

تجھ کو معلوم ہے بام و در پر ترے
حسنِ الوراکی ہوتی ہے خم جبیں

تجھ کو معلوم ہے یہ محفل تری
ایک فردوس ہے ، ایک خلدِ حسیں

جانتا ہوں کہ ہر ست ہے موجزن
شور و مستی و نشۂ حسینۂ دلنشیں

ہاں مگر ! میری محبوب اے دل ربا
اے مری پیکرِ ناز اے ارسلا

اے مجسم نشاط اے سراپا خوشی
اے سرور ابتدا اے خمار انتہا

تجھ سے کہدوں اگر ہو نہ تجھ کو گراں
تری محفل میں سب کچھ ہے الفت نہیں

تجھ سے کہدوں اگر تو نہ مانے برا
یاں نہیں پیار جنس محبت نہیں

یاں ہیں سامان عشرت ہزاروں مگر
درد ملتا ہے یاں اور نہ ملتا ہے غم

ملتی ہے یاں نظر سے نظر تو مگر
دل اے زہرہ یہاں دل سے ملتا ہے کم

ہیں اگر یاں نہیں خلدِ فردوس کا
تجھ کو دوزخ بھی مل جائے تو غم نہیں

ہوں میں انسان ہے پیار جیون مرا
پیار میرے لئے خلد سے کم نہیں

ہوں میں انسان ہے آرزو یہ مری
سینے میں دردِ دنیا بسا تا رہوں

میں ہوں انسان ہے یہ تمنا مری
دل میں شمعِ محبت جلاتا رہوں

میری محبوب آ ملے جی میں یہی
اب تو بس تیری محفل سے اٹھ جاؤں میں

بھاکڑا ننگل

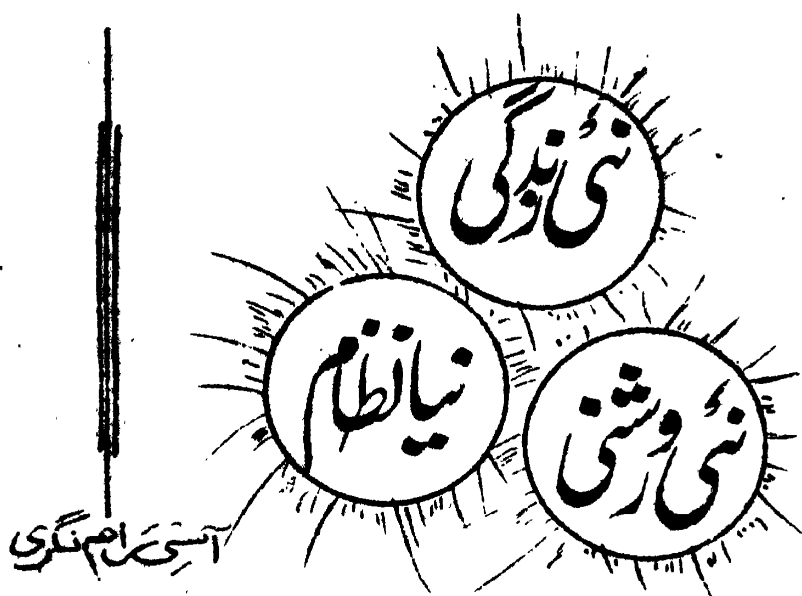
شاکر سہاروی

سالہا سال سے ہر ذرہ تب و تاب میں تھا
نیم شاداب زمینوں کا لہو خواب میں تھا
جس قدر زور نمو وادیٔ پنجاب میں تھا
آج وہ جاگ اٹھا بھاکڑا ننگل بن کر
زندگی پھیل گئی ریشمی آنچل بن کر

جیسے پگھلی ہوئی چاندی کی مچلتی ہوئی رو
جیسے آئینے پہ سورج کا سنہرا پرتو
نقرئی برف کے تودے سے نکلتی ہوئی لو
چادر آب ہے یا برق کا گہوارا ہے
جیسے پگھلی ہوئی کرنوں کا خنک دھارا ہے

نوجوانوں کے پیامات دیئے ہیں اس نے
خشک دھرتی کے گریبان سئیے ہیں اس نے
دور تک کھیت شرابور کئے ہیں اس نے
فاقہ مستی کو بدل دیئے گئے دھارے اس کے
گلکوں بنکے مہکتے ہیں کنارے اس کے

علم نے آج تراشا ہے نیا تاج محل
مسکراتے ہیں رہِ عشق کی محنت کے کنول
لہلہاتا ہے یہاں سبز کا دھانی آنچل
اہل دل سجدہ کریں جس پہ وہ دامن ہے یہی
آؤ دیکھو کہ زیارت کدۂ فن ہے یہی



آسی رام نگری

گنگا کی سطح پر جگمگاتی ہوئی آرتی کی تھالی کی طرح چاند نیلے آسمان کی وسعت میں تیر رہا ہے —

گنگا کے کنارے کی ریت پر ٹھنڈی چاندنی میں دو تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے شہر کے ہنگامے سے دور سکوت کی پُرسکون چھاؤں میں ان کے بارے آتے وقت حادثات سے گزرتے ہوئے دل کی طرح بن کے جیسے کسی قدر پانی میں دبے تھے حرادث زدہ کے جسم کی طرح پورے پل میں ہلکا ہلکا سا ارتعاش ہوا تھا سارے پہیوں کو ایک نظام میں باندھے رکھنے والی آہنی زنجیر میں ہولے سے باہم ٹکرانے والے ہڈیوں کے پنجر کی طرح خشک کھڑکھڑاہٹ ہوئی تھی۔

پیپوں کے اوپر بچھے ہوئے تختوں کے بجنے اور اٹھنے سے گڑگڑ پیدا ہو کر ایک عجیب سی کربناک چرچراہٹ
چاندنی کی چادر اوڑھے نیند کی ان انگڑائی لیتی ایک بار کسمسائی تھی پھر جیسے دوسرے ہی لمحے رات کے
سکڑتے بھیگی بھیگی ہوا نے تھپک کر اسے سُلا دیا تھا

ان آدمیوں میں دو کا چاند سے دیرینہ تعارف کیا غائبانہ اور خاموش دوستی کہیے۔ گزشتہ پانچ چھ
برسوں سے ایسی چاندنی دونوں کو اکثر اس جگہ کھینچ لایا کرتی تھی اور دور تک پھیلی ہوئی روپہلی ریت
پر باتیں کرتے ہوئے دونوں یوں ہی چلتے رہتے۔ اور چلتے چلتے تھک جاتے تو بیٹھ کر باتیں کرتے
رہتے وہی اور ویسی ہی باتیں جو چاند کی تخلیق کے دن سے لوگ چاندنی میں کرتے آئے ہیں
اصل میں چاند دونوں دوستوں کے درمیان مرکزِ اتصال بن گیا تھا۔ ویسے چاہے دونوں ایک
دوسرے کو یاد بھی نہ رہتے ہوں، لیکن چاند کی جوانی دونوں کو اس طرح کھینچ کر ملنے پر مجبور کر دیتی
جیسے دو شرابی ایک دوسرے کے بغیر تنہا پی ہی نہ سکتے ہوں دونوں ایک دوسرے کو ڈھونڈ نکالتے
اور اسی پیپے سے شعوری طور پر گذرتے ہوئے اسی گنگا کے کنارے کی ریت پر پہنچ جاتے اور پھر دل
کی تہیں الٹ الٹ کر اس میں سے سوز نغمے، آنسو، آہیں اور مسکراہٹیں — ایک ایک کر کے ریت
میں بکھیرنے اور سمونے لگتے اور جیسے چاند کی کرنیں مسکرا مسکرا کر ایک ایک کو چننے لگتیں۔ ان سے پہلے
تعارف کی بات چاند کو آج بھی یاد ہے۔ کالج میں پڑھنے کا زمانہ تھا۔ جسے لڑکپن کی زبان میں زندگی
سنہرا دور کہتے ہیں صرف کھیلنا اور کھانا۔ لانے کی فکر سے آزاد مستقبل کی جنت کا رنگین دلفریب
آمد تصور کبھی کلی جیسی کومل فطرت۔

دونوں ریت کی وسعتوں میں کھوتے چلے گئے یہاں تک کہ کنارا اوجھل ہو گیا۔ صرف بس
سفید چمکیلا سنہرے ہرے چاندنی کے دودھیا پردے اور سنگ مرمر کے فرش جیسی ریت پر ان
دھندلے نقطوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔

دونوں وہیں بیٹھ گئے۔ چند لمحوں کے بعد ایک نے خاموشی توڑی — کتنا حسین منظر
ہے جیسے نیچے زمین ہو نہ اوپر آسمان۔ جیسے ہم بادلوں کے نرم پہلو پر بیٹھے اڑ جا رہے ہوں
دوسرے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش لیٹا چاند کی طرف تکتا رہا۔ جیسے وہ چاند کی
دنیا میں پہنچ گیا ہو۔ چاند کی کرنیں اس کے چوڑے ماتھے پر لہراتے ہوئے بالوں کو چوم رہی تھیں

کیا سوچ رہے ہو راجو ——— ؟" اُس نے راجیش کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا "خاموش کیوں ہو گئے —؟"

راجیش نے چاند کی طرف سے نگاہیں ہٹائیں ایک لمحہ کیلئے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور عجیب نشیلی اور مرتعش آواز میں بولا

"ایک بات بتاؤ کنور! کبھی تم نے یہ محسوس کیا ہے کہ جب کبھی آدمی ایسے پُر سکوت مقام پر آجائے اور اس کے سامنے حسین پھول ہوں یا بادلوں میں چھپ چھپ کر جھانکتا ہوا چاند ہو یا ایسا ہی اُجلی اُجلی بیلوں سے گھرا ہوا کوئی ہرا بھرا منظر ہو، تو بار بار اس کے تخیل کے پردے پر کوئی چہرہ اُبھر آتا ہے اور رہ رہ کر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ کبھی آنسوؤں سے دُھلا ہوا کبھی مسکراہٹ سے کھِلا ہوا۔ آخر کیوں ——؟"

کنور کچھ نہیں بولا صرف پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ راجیش کا ہاتھ آہستہ سے دبایا اور چاندنی میں کھوئی ہوئی دریا کی لکیر کو دیکھنے لگا۔ چاند کے چہرے پر ہلکی سی معنی خیز مسکراہٹ آئی اور چاندنی اور تیز ہو گئی۔

راجیش جیسے کراہ کر اُٹھ بیٹھا اور بولا "کنور! تم نے کوئی ایسی لڑکی دیکھی ہے جو پھولوں کی طرح معصوم چاندنی کی طرح پاک اور شراب کی طرح مدہوش کن ہو۔ بولو ——؟"

کنور پھر کچھ نہ بولا ——جیسے احساسات کے دباؤ سے بول ہی نہ سکتا ہو۔ خاموش بیٹھا غیر شعوری طور پر ریت پر لکیریں بناتا اور مٹاتا رہا۔ البتہ چاند جیسے ہنس کر بولا "بےشک لیکن ہو پیارے تمہارے ذہن میں بھی کوئی نہ کوئی لڑکی شراب کی طرح مدہوش کن نظر آتی ہے کیا عمر ہو گی تمہاری ——؟"

لیکن چاند کی آواز راجو تک پہنچنے بھی نہ پائی ہو گی۔ کہ کنور جیسے نیند سے چونک کر بولا —"ہاں —— تم کسی لڑکی کی بات کہہ رہے تھے۔ کون ہے وہ لڑکی؟ کیا اُسے کبھی معلوم ہے کہ ——"

"کیا ——"

یہی کہ وہ تمہیں پھول کی طرح معصوم —— چاندنی کی طرح پاک —— اور شراب کی طرح مدہوشی کن معلوم ہوتی ہے؟

"اوہو — " راج کھکھلا کر ہنستے ہوئے بولا
"تم بہت آگے تک سوچ گئے۔ وہ کیوں اور کیسے جانے لگی کنور — ؟ تمہیں معلوم ہے
تمہیں معلوم ہے میں اور ہی مسلک کا آدمی ہوں۔ پیار اور محبت میرے بس کا روگ کہاں ؟
میں نے کہا وہ لڑکی چاند کی طرح پاک ہے۔ لیکن یہ تو نہیں کہا کہ وہ میرے لئے ہے۔ پھول
کو دور سے دیکھنا اور محظوظ ہونا تو ہر آدمی ہو لیتا ہے۔ لیکن اس سے کہنے کون جاتا ہے کہ تم مجھے
اچھے لگتے ہو —
چاند جیسے کھکھلا کر طنز آمیز ہنسی ہنس پڑا آج کل کے اکثر لڑکوں کو ایسی شاعرانہ باتیں
کہنے کی عادت ہو گئی ہے۔ اور پھر چاند جیسے سوچ میں پڑ گیا معلوم نہیں یہ لوگ اپنے
کہنے کا مطلب بھی سمجھتے ہیں یا نہیں ؟"
کچھ دیر خاموشی رہی یکایک راج کے ہاتھ پر گرم گرم آنسو ٹپک پڑا اس نے چونک کر کنور کی
طرف دیکھا کنور نے راج کی طرف دیکھے بغیر ہی بہت مدھم آواز میں کہا۔ "تم بہت خوش نصیب
ہو راج، تم میں طاقت ہے عقل و دانش اور خود اعتمادی ہے۔ تم پیار میں یقین نہیں رکھتے
پھر بھی تمہاری زندگی میں کوئی ہے جو ہر لمحہ تمہارے قریب رہتا ہے۔ اور میں — ؟ .....
میں پیار کرتا ہوں۔ پیار کو حاصل زندگی سمجھتا ہوں۔ پیار پر ہی جینا اور پیار پر ہی مرنا جانتا ہوں
لیکن جسے پیار کرتا ہوں اس سے پچھلے چھ برسوں میں باتیں بھی نہیں کر پایا۔ پھر بھی ہر سانس
اسے چھو آتی ہے۔ اس سہارے کے بغیر ایک لمحہ بھی جی نہ سکتا تھا۔ تم مجھے کمزور کہہ سکتے ہو۔ اس
لئے کہ مجھ میں بھی دبی چنگاری ہے۔ تمہاری طرح بھڑکتا ہوا شعلہ نہیں ہے جو —"
"چنگاری اور شعلہ" راج زیر لب بڑبڑایا۔ اور ایک پھیکی ہنسی ہنس پڑا۔ اور جیسے دور
سے بولا — "آؤ — چلیں —" اور دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔
راج کا دل شعلے کی طرح لہرانے کیلئے بیتاب تھا اور کنور کا دل راکھ میں دبی ہوئی چنگاری
کی طرح بیٹھا ہوا۔ بھاری بھاری، اداس، مضمحل اور سوگوار — چاند تو بہت دور تھا
اس شعلے اور چنگاری کی دنیا سے بہت بلندی پر پھر بھی وہ اس شعلے اور چنگاری کی تفصیل
معلوم کرنے کے اشتیاق کو نہ دبا سکا۔

اور اس کی نگاہوں نے انھیں ڈھونڈ نکالا انھوں نے ان دونوں کے دلوں میں شعلے اور چنگاریاں بھر دی تھیں جس کی طرف راج کا اشارہ تھا وہ چھت پر جوانی کی مدہوش نیند سو رہی تھی اس کی سیاہ چوٹیاں سینے پر ناگن کی طرح لوٹ رہی تھیں سر کے نیچے رکھی ہوئی کلائی میں پڑی ہوئی چوڑیاں ذرا سی حرکت پر کھنک اٹھتی تھیں۔ ہاتھ سے چھوٹ کر کتاب گر کر نیچے جا پڑی تھی۔ سرہانے ٹیبل پر دودھ سے بھرا ہوا گلاس اسی طرح رکھا ہوا تھا۔

اور جس پیار کی چنگاری اپنے دل میں دبائے ہوئے کنور آہستہ آہستہ سلگ رہا تھا وہ کھڑکی کے پاس ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کتاب ہاتھ سے دبائے اور سر گھٹنوں میں دیئے جانے کیا سوچ رہی تھی آنچل سر سے کھسک کر بے ترتیبی سے اس کے گرد پڑا ہوا تھا۔ اور جیسے یکایک چاند کو تکتی لگا۔ اپنی طرف دیکھتے ہوئے محسوس کر کے جلدی سے اٹھ کر اس نے کھڑکی بند کر لی۔ اور اس کی چوڑیوں کی کھنک جیسے گجر کی گھنٹیوں کی طرح چاندنی کے تاروں پر دور اور دیر تک لہراتی رہی۔

چاند نے دونوں دوستوں کی باتیں سن ہی لی تھیں۔ ان سے تعلق رکھنے والی دونوں لڑکیوں کو بھی دیکھ لیا۔ لیکن کچھ نہ بولا۔ صرف اپنی طویل فہرست میں چار ناموں کا اور اضافہ کر لیا۔

یہ پانچ سال پہلے کی بات ہے اسی دن سے چاند ان پر کڑی نگاہ رکھنے لگا۔ اس کے بعد سب اپنی اپنی راہوں پر چلتے ہوئے اپنی اپنی منزل کی طرف رواں رہے۔ حالات کی ڈور میں بندھے ہوئے کبھی سست کبھی تیز۔ چلتے چلتے کہیں راہیں الجھتیں کچھ دور پہلو بہ پہلو چلتیں۔ ہیں فاصلہ بڑھنے لگتا اور آہستہ آہستہ بالکل ہی مختلف سمتوں کو مڑ جاتیں۔ کبھی ایک دوسرے کی سانسوں کی گرمی تک محسوس کر لیتے کبھی دو گھڑی بھی نہ پاتے۔

لیکن اس دوران میں چاند ہمیشہ اپنی فطرت کے مطابق اپنے کام میں مصروف رہا بالکل مکڑے کی طرح اس کے قریب جیسے تاروں کے تانوں کے تانے بانے میں پھنس کر وہ ادھر کبھی پھڑکی اور وہ ادھر تیزی سے دوڑ پڑا۔ اور اس کے دائیں بائیں نیچے اوپر تیزی سے دوڑ لگا کر راستے تار بن دیتا ہے کہ پھر اس کے لئے کوئی راہ فرار نہیں رہ جاتی۔ بالکل اسی طرح جیسے زمین پر یہ لوگ روزی روزگار، پیار، ملاپ، اور جدائی کے طوفان میں ڈوبتے اور تیرتے رہے اور اوپر چاند اس کونے تک ان کے گرد ایک عجیب سے چمکدار تاروں کا جال بنتا رہا اور انھیں جکڑتا رہا اور یہ

کبھی کبھی انھیں چاندنی کی ڈوریں باندھ کر اسی ریت پر کھینچ لاتا حالانکہ مالی مشکلات اور سماجی مجبوریاں
انھیں بار بار جھنجھلاتی رہتیں۔ لیکن چاند اپنی نرم نرم کرنوں سے تھپک تھپک کر ان پر ایک ایسے سکر آمیز
سکون کی تہہ در تہہ جما دیتا کہ وہ سب کچھ بھلا کر پھر اسی ریت پر اسی دن کی طرح لیٹ کر ویسی ہی باتیں
کرنے لگتے۔ جس دن ان کے دلوں پر پیار کا پہلا عکس پڑا تھا۔ اسی پیار کا جو آسمانوں سے زیادہ وسیع
اور سمندر سے زیادہ عمیق ہے۔

ایسی ہی ملاقاتوں میں ایک دن راجیش نے ہنستے ہنستے بتایا کہ اب اسے بہت فرصت رہتی
ہے کیونکہ وہ لڑکی اب اس کی زندگی سے نکل گئی ہے۔ لیکن معلوم نہیں کون سی ایسی چیز ہے جو سائے
دونوں کے دلوں کی گہرائیوں میں کہیں نہ کہیں ہمیشہ رہے گی۔ دنیا کی زبان میں پیار ہے یا اس
کے علاوہ اور کچھ؟ کیونکہ راج تو اپنے خیال کے مطابق پیار پر یقین ہی نہیں رکھتا۔ یہ بات کہتے وقت
راجو ہنس رہا تھا لیکن چاند کو وہ ہنسی عجیب کھوکھلی سی معلوم ہوئی تھی۔ بالکل بے روح سی۔ سسکی سے
بھی زیادہ پر اندوہ، کربناک اور گریہ آمیز۔ ہو سکتا ہے کہ یہ چاند کا وہم رہا ہو۔ لیکن کنور کی آنکھوں میں آنسو
آگئے۔ اسے ضرور کسی کی یاد آگئی تھی۔ اس کی یاد جسے اسے کھونا ہی پڑے گا۔ کیونکہ پیار کی ریت
اور روایتوں کے مطابق پیار میں پانے سے زیادہ کھونے کو اہمیت حاصل ہے۔ اور پھر جب دو سال
بعد وہ دونوں پھر ملے تو کنور نے بتایا کہ اس کی شادی ہونے والی ہے لیکن اس لڑکی سے نہیں۔
کیونکہ وہ راج کے اس عقیدے سے متفق تھا کہ دیوتا کی جگہ اس کا مندر ہے۔ عقیدت کے معنی یہ نہیں
کہ دیوتا کو اپنی مرضی اور خواہشات کا غلام بنا لیا جائے۔ پرستش کی معراج تو یہی ہے کہ اپنی تمناؤں
کے پھول اور کلیاں اور ارمانوں کے دیپ سب قربانی کی تھالی میں سجا کر دور سے دیوتا کے قدموں میں
رکھ کر صرف سر نیاز جھکا دیا جائے۔ اور اپنے میلے ہاتھوں سے اس کے چرنوں کو ملوث کرنے کا حوصلہ
تو کیا دل میں خیال بھی نہ لایا جائے۔ حالانکہ راج اس کی شادی کی خبر سے بہت برہم ہوا تھا لیکن جب
کنور نے بتایا کہ خود اس لڑکی نے قسمیں دے دے کر اسے شادی کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور سماج کے
سامنے دلہن کا کردار ادا کرنے کیلئے لڑکی بھی خود اسی نے تلاش کی۔ جس اور پسند کی ہے تو راج کی
جبین عقیدت اس بے غرض لڑکی کے تصور کے سامنے جھک کر رہ گئی۔ اور وہ ایک لفظ بول نہ سکا

اس کے بعد اکثر دونوں ملتے رہے اور یہی گفتگو ہوتی رہی۔ کہ درحقیقت محبت ایک بے پایاں طاقت کا نام ہے جسمانی دوری سے اس کی کشش میں کوئی کمی اور کمزوری نہیں آتی بلکہ اس دوری نے اس میں ایک نئی طاقت نیا حوصلہ اور نیا جوش پیدا کر دیا ہے۔ اُن کے لئے اس دنیا سے الگ ایک نئی دنیا تخلیق کر دی ہے۔ لیکن آخر انسان ہی تو تھے۔ کبھی کبھی اداس بھی ہو جاتے۔ کنور کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور راج کے ہونٹوں پر ایک سسکتی ہوئی مسکراہٹ۔ لیکن چاند نے دیکھا وہ اندر سے کھوکھلے ہوتے ہوئے بھی کوک بھرے ہوئے کھلونوں کی طرح اپنے سامنے فرائض کے میدان میں حرکت کرتے ہیں، آگے بڑھتے ہیں۔

راج نے اکاونٹس کا امتحان پاس کیا اور آڈیٹر ہو گیا۔ اور کنور امتحان دینے کے بعد ڈپٹی انسپکٹر آف سکولس کی جگہ پا گیا۔ اور چاند ـــ؟

چاند صرف ایک بے ڈول چمکیلے ٹکڑے کی طرح ان کے گرد تاروں کا جال بنتا رہا۔ نتیجے کے طور پر راج کچھ اور منہ پھٹ، ہنس مکھ اور ہوشیار ہوتا گیا۔ اور کنور اور زیادہ کارگزار اور دور اندیش بنتا گیا۔ اس کے کنبہ جو ہو گیا تھا۔

لیکن یہ سب اس کی اوپر کی تہہ تھی۔ اندر کی تہہ میں تو صرف پیار ہی پیار تھا، ان کا ناکام پیار، بے ثمر پیار جس کے بعد انسان انسان ہی نہیں صرف ایک چلتا پھرتا کھلونا، چلتی پھرتی لاش یا سوکھی ہوئی ہڈیوں کا پنجر رہ جاتا ہے۔ صرف پیار ہی زندہ رہ جاتا ہے کیونکہ پیار روح کی طرح غیر فانی ہوتا ہے۔

چاند کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ پیار میں مایوسی کے باعث اندر کے کھوکھلے پن کے باوجود ان کی زندگی میں ترقی اور عمل میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ پہلے ہی کی طرح چلتے پھرتے اور پہلے ہی کی طرح ہنستے اور بولتے بھی تھے۔ بلکہ ہنستے بولتے تو پہلے سے بھی زیادہ تھے یہاں تک کہ سوچنے اور سوچ کر فکر میں پڑنے کا موقع ہی خود کو نہ دیتے تھے۔

چاند ہر مہینے نئی سج دھج کے ساتھ ایک بہت بیلے کے پھول کی طرح آسمان کی وسعتوں میں تیرتا آتا لیکن وہ اب اس کی طرف بھی دھیان نہ دیتے اس طرح جب سترہ اٹھارہ پورنیمائیں بیت گئیں۔ تو چاند سے اپنی تذلیل برداشت نہ ہو سکی۔ اور آخر ایک رات [illegible]

جال پھینک کر انہیں اسی دریا کے کنارے کی ریت پر کھینچ لایا۔

بہت دنوں کے بعد آج ایک بار پھر پیسے کی پتلی زنجیریں خمار توڑنے ڈالے والے کے جسم کی رگوں کی طرح ہلکے سے اکڑیں۔ تھنتے۔ سرگوشیوں کی طرح ہولے سے چرچرائے۔ پہیوں میں تھوڑا ساز پر دھم ہوا۔ اور ساکت پانی کی نیند ٹوٹ کر لہروں میں کسمساہٹ ہوئی اور جب وہ دونوں اس پار پہنچے تو چاندنی کے باوجود ان کے دلوں پر دھندلکے کی تہہ در تہہ جمی ہوئی تھی۔ وہ جانتے کیا کیا اور کہاں کہاں تنہائیوں کی باتیں کرتے رہے تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی ایسی بات نہیں تھی جو انسان آغاز آفرینش سے چاندنی راتوں میں کرتا آیا ہے۔ جنھیں سننے کا عادی چاند آج بھی مشتاق تھا۔

ہاں — ان کے ساتھ آج ایک آدمی اور تھا۔ جس کا کھویا کھویا انداز شرابی آنکھوں کے گلابی ڈورے، نشیلی چال اور خاص کر پاؤں کے سرخ کامدار سلیم شاہی جوتے سے صاف ظاہر تھا کہ کچھ ہی دن ہوئے اس کی شادی ہوئی ہے۔

چاند کے جادو کا جال جو آج کنور اور راجیش پر نہیں کام کر رہا تھا شاید اس پر اثر انداز ہو گیا۔ اور یکایک راج کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "کتنا حسین ہے چاند میاں —؟ اور کتنی سکر آمیز ہے یہ چاندنی، جیسے ہر طرف ہر چیز پر ایک خمار اور مدہوشی طاری ہو۔ اور چاند پر لگا ہی جائے، جھومتا ہوا سا آگے بڑھا۔ راج نے یکایک اس کا ہاتھ تھام کر جھٹکے سے پیچھے کھینچتے ہوئے بولا۔ "دیکھو دینو آگے گڑھا ہے۔" دینو قریب قریب راج سے ٹیک لگاتا ہوا بولا۔ "راجو کبھی تمھیں ایسا معلوم ہوا ہے آگے گڑھا ہو، یا کھائی اور پہاڑ ہو، بھول ہو یا چاند کالی گھٹائیں ہوں یا سرسبز جھاڑیوں کا کنج یا گھنے درختوں کی قطار ان کے سب کے پیچھے سے کسی کا چہرہ جھانک پڑے —؟"

راج خاموش رہا جیسے دینو نے انجانے میں اس کے کسی پرانے زخم پر سے کھرنڈ نوچ لی ہو۔ آخر ہچکی کی طرح ایک اکھڑی ہوئی ہنسی آتے آتے مرجھائی ہوئی مسکراہٹ میں تبدیل ہو کر اس کے ہونٹوں میں جذب ہو کر رہ گئی۔

ادھر چاند جیسے ایک شوخ، طنز آمیز، فاتحانہ اور پراسرار ہنسی ہنس پڑا — "تو اس کا نام بھی فہرست میں آنا چاہئے۔ اس کے اندر بھی جراثیم پیدا ہونے لگے ہیں۔"

اتنے میں ونود بھی بول اٹھا۔ "میں جانتا ہوں تم لوگ ہنسو گے منور لیکن معلوم نہیں اس لڑکی میں کیا ہے۔ یا میں ہی پاگل ہو گیا ہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس سے پہلے میں نے اس سے اچھی لڑکیاں دیکھی ہیں۔ اپنے خیال میں شاید انھیں بھی پیار کیا ہے کیونکہ ہفتوں خیالوں اور نگاہوں میں اسی کو پاتا رہا ہوں لیکن آج محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ صرف عمر کا تقاضا تھا اور جذبات کی وقتی مانگ تھی، ان کا تعلق صرف خیالوں اور نگاہوں ہی سے تھا۔ دل کا کونہ تک نہ چھو سکیں۔ کیونکہ بیوی کے پیار میں جو عقیدت اور خلوص کا کیف ہوتا ہے۔ اس کا نشہ بہت میٹھا اور دیرپا ہوتا ہے۔ راجو! کاش تمہیں بھی حقیقی معنوں میں رفیق حیات اور جیون ساتھی کی صلاحیت رکھنے والی بیوی ملے اور تم بھی سنسار ہی میں سورگ کا سکھ محسوس کرو۔

"دیکھو، شاید نصیب وہ گھڑی دکھائے۔" راج نے کہا اور جیسے دل ہی دل میں وہ مضحکہ خیز سکھ محسوس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ادھر چاند نے آنکھیں جھپکا کر سوچا یہ عجیب سا کیس ہے اب تک کی شاید فہرست میں کوئی ایسی نظیر نہیں ہے، پیار اور اپنی بیوی سے! یہ کون خوش نصیب آیا بھئی ـــ؟

"کیا کہا ونود ابھی ابھی تم نے ـــ؟" کنور جیسے نیند سے چونک کر پوچھ بیٹھا۔ "شادی تو میں نے بھی کی ہے۔ میرے صرف بیوی ہی نہیں بچہ بھی ہے۔ میں نے جسے پیار کیا اس کا شوہر اور خاندان بھی معلوم ہے۔ معلوم نہیں تم بیوی کی کس ہمدردی اور پیار کا ذکر کر رہے ہو۔ مجھے تو بیوی سے کچھ فاضل ذمہ داریوں کے سوا کچھ نہیں ملا۔" تم نے کہا، تم نے کسی سے پیار بھی کیا تھا جو وقتی تھا یا تو تم واقعی پاگل ہو گئے ہو یا جھوٹ بولتے ہو۔ پیار وقتی نہیں غیر فانی ہوتا ہے۔ گھر بار بیوی بچے سب ہی صرف سماج کے پنجرے کی تیلیاں ہیں ان میں سے کوئی بھی ذرا سا موقع دیتی ہے تو وہی آہستہ آہستہ سرک کر چند لمحوں کیلئے داخل ہو جاتی ہے جو ہمارے زندگی میں مستقل طور سے داخل نہیں ہو سکے یا تی جسے ہم کھو چکے۔"

ونود خاموشی کے ریت میں بے معنی لکیریں بناتا اور مٹاتا رہا۔ چاند نے زہریلے کیڑے کی طرح اپنے جال اور کسا، کنور نے ایک سرد سانس چھوڑ کر کہا میں جانتا ہوں اس ظاہری دوری کے باوجود نہ وہ بدلی ہے اور نہ میں۔"

"ابھی کتنے دن گزرے ہیں ۔۔ " راج نے پوچھا "تو ۔۔ تم بھی ملتے ہو کہ " کنور نے اس کے جواب میں سوال ہی کیا۔ راج نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خود راج سے سر ٹیک کر بیٹھ گیا۔

"ایک بات تم سے بھی پوچھوں راج؟" کنور نے راج کا ماتھا چھو کر پوچھا "تم کچھ بدل گئے ہو ۔۔ کیوں؟"

"بدلنے کو تو کلی بھی پھول میں بدلتی ہے کنور!" راج نے فلسفیانہ انداز سے کہا "ایک بات اور پوچھوں؟"

"کیا ۔۔؟"

"یہی کہ وہ بھی ۔۔۔۔؟"

"نہیں ۔ بالکل نہیں وہ نہیں بدلی ہے۔ وہ تو پہاڑوں کی طرح اٹل، سمندر کی طرح اتھاہ اور آسمان کی طرح بلند اور وسیع اور چاند کی طرح روشن کردار کی مالک ہے۔ لیکن میں نے پہلے صرف اسے دیکھا تھا اس کے بعد دنیا دیکھی ہے ۔ دنیا، جس کا وہ صرف ایک جز ہے۔ زندگی دیکھی ہے جو صرف پیار نہیں ہوتی ۔ جانے کتنے تجربات کتنی تلخیوں اور کتنے حادثات کے امتزاج سے زندگی تکمیل پاتی ہے۔"

"لیکن پیار ان سب پر بھاری اور سب سے زیادہ اہم ہے" کنور نے جوش سے کہا اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہر حالت میں، ہر دور اور ہر عالم میں زندہ اور پائندہ رہتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے تمہارا خیال درست ہو" راج نے ایک لمبی سانس بھر کر کہا "لیکن سچ پوچھو تو تجربات کی بنا پر اب مجھے محبت پر اعتماد نہیں رہا کیونکہ محبت مکڑی کے اس چمکدار اور باریک جالے سے زیادہ کچھ نہیں ہے جس میں وہ مکھی کو پھانس کر اس کی جان تک لے لیتی ہے۔ مکھی کو پھانسنے کا مقصد اسے راحت پہنچانا یا اس سے محبت کرنا نہیں ہوتا بلکہ اسے بے بس کر کے اپنی بھوک کی آسودگی پیش نظر ہوتی ہے۔ مکھی کے گرد بار بار تھرکنا اور ناچنا اسے خوش کرنے کیلئے نہیں ہوتا وہ صرف مکڑی کا اظہار کامیابی ہوتا ہے۔ گفتگو اب کچھ غیر رومانی محسوس اور خشک انداز اختیار کرتی جا رہی ہے۔ کہ چاند کی سمجھ میں تو آ ہی نہیں رہی تھی۔ اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے جو تار

ان سب کے گردن رکھا تھا اسے راج بار بار جھٹکا دے رہا تھا۔

"تو تمہارے خیال میں محبت کی کوئی حقیقت نہیں ہے! پھر خواہشات کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے" کنور نے پوچھا ۔۔۔ "ہاں ۔ اول تو محبت کی کوئی حقیقت نہیں اور اگر ہے بھی تو وہ بالکل ریت کی لکیر ہے" جو صرف ہوا کے ایک تیز جھونکے سے بگڑ جاتی ہے۔ محبت کے نام پر اپنے آپ کو فریب دیتے رہنا البتہ مستقل اور دائمی ہے لیکن بہت ہی تکلیف دہ ۔"

"ہوں ۔" کنور نے ایک لمبی سی ہنکاری بھری ۔

کنکھیوں سے اس کا تیور دیکھ کر راج ہنستے ہوئے بولا "نہیں کنور وہ تو مذاق تھا ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ حالات اس خود فریبی کو بھی قائم رہنے نہیں دیتے ۔ لیکن اگر میری بات کا برا نہ مانو تو کہوں اگر عورت اور مرد کے درمیان سے محض روحانی جز نکال کر ایک صحت مند انسانی ہمدردی بسنے دی جائے جس کے بل پر انسانی زندگی کی تعمیر کی جاسکے تو بہت سے مسائل کا حل نکل آئے ۔"

اس خشک گفتگو سے رومان پسند چاند کا دل ڈوبنے سا لگا ۔ اتنے میں کنور پھر بول اٹھا ۔ لیکن ہم کسی مقصد کے پیش نظر اور دانستہ تو محبت کرتے نہیں وہ تو نہ جانے کون سی طاقت ہم میں ایک نئی احساس کی دنیا تخلیق کر دیتی ہے ہماری نس نس میں عجیب سی لذت بھر دیتی ہے ۔ ہماری زندگی ایک نئی انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتی ہے ۔ پھر تمہیں سوچو کہ کیا یہ ذلیل خود غرضانہ اور مضحکہ خیز اصول نہ ہوگا کہ جو ہماری ہستی کا دامن چھوڑ کر تازہ پھول کی طرح کھلا دے جو ہمارے وجود میں ایک امرت بھر کر ہمیں نئی زندگی دے دے ۔ جو اس مادی دنیا میں رہتے ہوئے بھی ہمارے گرد ایک فردوسی ماحول تخلیق کرے ۔ جو ہمیں ہر طوفان سے ٹکرا کر ہر ناممکن بنانے کی طاقت بخش دے اسے ہم اپنے مسائل کے حل کرنے کا آلہ بنا لیں ، بولو ۔ یہ ہماری سماجی زندگی کی خود غرضانہ کھوکھلی ہے ۔" چاند نے دیکھا ، کنور کا چہرہ ہیجان آمیز جذبات سے سرخ ہو رہا ہے وہ اور دھیان سے سننے لگا ۔

راج اسی طرح اسی سنجیدگی سے بولا " لیکن میں تو اسے دوسرے ہی پہلو سے دیکھتا ہوں ذرا اپنے انفرادی اور ذاتی مفاد سے الگ ہو کر سوچو ۔ ایک عمر زندگی ہے جب کبھی کسی کے دل میں

وہ رنگین اور معطر قرمزی پھول کھلتا ہے اور اس وقت جو بھی ہمارے قریب آئے اس کا دامن
اسی خوشبو میں بس جاتا ہے۔ لیکن ہمارے سماجی نظام اور روایتی قدامت نے ہمیں اتنا بزدل اور
ہمارے حوصلوں کو اتنا مفلوج بنا دیا ہے۔ کہ ہم اس ہستی کو ساتھ لے کر سماج کی سطح پر ابھرنے کی ہمت
نہیں رکھتے، جھینپتے ہیں، شرماتے ہیں بلکہ یوں کہو کہ ڈرتے بھی ہیں یہاں تک کہ اصول اور ضابطے
دھرم اور مذہب کی آڑ لیکر اسے بیوی کا نام دیکر سماج کی نگاہوں میں اسے اپنے اوپر جائز
کرتے ہیں اور پھر پجاری سے دیوتا بن بیٹھے ہیں۔ اور وہ بیوی، نام کی تسکین نیچے پیدا
کرنے اور گھر سنبھالنے کے سوا اور کسی کام کی نہیں رہ جاتی۔ پھر ہماری دو شخصیتیں ہو جاتی ہیں نتیجہ
یہ ہوتا ہے کہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کو ملامت کرتی رہتی ہیں اور اس ملامت کے ٹکڑے نے
ہم دونوں کی شخصیتیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔

اور کھوکھلی شخصیتوں سے مرتب شدہ سماج ٹھوس کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ ایک تھکی ہوئی سی
سانس لے کر بولا: میں اکثر سوچنے لگتا ہوں، کاش ہم اس مصنوعی ماحول میں رہنے اور جینے کیلئے
مجبور نہ ہوتے تو ہماری زندگی کتنی خوشگوار بلند اور کارآمد ہوتی اور ہمارا سماج کتنا صحت مند ہوتا
انفرادی مفاد کے گھٹے ہوئے دائرے سے نکل کر ہمیں سانس لینے کیلئے کتنی پاک اور صاف ہوا
ملتی ہے ہماری ہر سانس ایک مدھر سنگیت میں بھیگی اور ایک میٹھی تان کے تاروں میں پڑی
ہوتی کبھی تم نے بھی اس مقام پر کھڑے ہو کر سوچا ہے کنور۔ چاند ململا اٹھا۔ اسے محسوس
ہوا جیسے راج نے جھٹکے سے سب سے مضبوط تار توڑ دیا ہو۔ اس نے جھنجلا کر چاندنی کا ایک تیز
تھپیڑا دیا۔ کنور نے بھاری آواز میں کہا۔ اٹھو راج! چلو چلیں! اور چاند کے ڈور کھنچتے ہی تینوں
ایک تار میں بندھی ہوئی کٹھ پتلیوں کی طرح آگے بڑھ چلے۔ ساتھ ہی جیسے چاند کا طنز فضا میں
گونجا: ہونہہ جانے انسان کو اشرف المخلوقات کس نے اور کیوں کہہ دیا۔ یہ نہ جانے کیسی کیسی کیا کیا
کرتا ہے، کوئی شادی کو اپنی منزل کہتا ہے۔ کوئی شادی کو ایک ناخوشگوار بندھن بتاتا ہے
کوئی سماج سے ٹکر لینے کا خبط سر میں لئے پھرتا ہے۔ دیوانے کہیں کے!

اور شکار کو پھڑکتے دیکھ کر بھرے ہوئے مکڑے کی طرح چاند کرنوں کے جال بننے لگا۔
تینوں کا دل جال میں پھنسی ہوئی مچھلی کی طرح اندر ہی اندر عجیب عجیب طرح سے پھڑک رہا تھا

اور ان کی بےچینی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اکتا کر تیزی سے چاند اور ریت کے ذرّے [illegible] جانتے تھے۔ پاس کے کھیت کی مینڈ پر چلتے ہوئے سرکنڈے کا ایک ٹکڑا ریت پر بکھر کر گم ہو گیا تھا۔ اسے ٹھوکر مار لینے سے اندر سے کافور کا ریت ابھر آئی تھا۔

لیکن چاند تو ظاہری اور باطنی تفریق سے بہت بلند تھا۔ اندر کچھ ایسا ہی کچھ [illegible] زمین پر ہے۔ اسے اس کھیل میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اسی لئے اس نے نگاہ پھیر کر کہیں اور دیکھا جس کے لئے راج سماج کا بنیادی دستور مرتب کرنے کو جی چاہتا تھا۔ کل کی طرح جیسے چاند نے اسے پہلے دن دیکھا تھا کھلی ہوئی چھت پر چاند اور چاندنی کی رعنائیوں سے بےخبر بےہوش سی سو رہی تھی۔ بغل میں پہلے ستارے کی طرح معصوم اور ننھا سا ایک بچی کلکاریاں مار مار کر جوان ماں کو جگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کنول کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ بڑا معصوم سا [illegible] کی طرح پھڑک رہی تھی۔ وہ چھوٹی سی ماں پہلے سے زیادہ مدھر اور روپ بھری معلوم ہو رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ فطرت کی بہت بڑی امانت کی امین تھی۔

اور چاند نے دیکھا جس کے خیالوں میں کنور کھویا ہوا تھا۔ وہ اسی طرح لیمپ کے پیچھے چلنے سے بےخبر اندھیرے میں کھڑکی کے پاس گھٹنوں میں سر ڈالے اپنے سرتاج کی اداسی کی گہرائی [illegible] وہ قریب پڑے ہوئے اس بجھے ہوئے لیمپ سے بھی زیادہ اداس اور سونی سونی معلوم ہو رہی تھی شاید تنہائی سے زیادہ اسے اپنے شوہر کی بےپروائی تکلیف دے رہی تھی۔ [illegible] جس کا راگ گایا تھا وہ سہاگ کی تجلی، شبنم کی طرح پاک کلی کی طرح معصوم [illegible] تھی۔ جانے کیوں چاند کی نگاہیں اس پر ٹھہری ہی نہیں۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کنور کی طرف نیچے دیکھ کر چاند بڑبڑایا۔ "نادان"۔ کسی نے سنا نہیں۔ البتہ لیلا ایک کونے سے آگے بڑھ کر کہا "راج! یکایک خاموش کیوں ہو گئے۔؟"

راج کی آواز بھرّا گئی۔ اس کا دل بھر آیا۔

بولا "کون جانتا ہے۔ ہم لوگ کس کے مارے رہتے ہیں۔ شکست خوردہ اور شکستہ دل کچلے ہوئے لوگ، پر پڑ بڑے بچھیا۔" پھر ایک لمبی سانس بھر کر بولا۔

"معلوم نہیں حقیقت کیا ہے؛ میں نے جو کچھ کہا معلوم: میں خود ہی [illegible]

نہیں۔ میں محبت کے لفظ کا معتقد نہیں ہوں، پھر بھی محسوس کرتا ہوں جیسے اس کا منکر بھی نہیں ہو سکتا۔"

چاند کو محسوس ہوا جیسے راج نے ابھی ابھی جال کے جن تاروں کو جھٹک دیا تھا۔ انھیں پھر خود ہی سمیٹ کر اپنے گرد اکٹھا کر رہا ہے۔ اور ایک ایک کر کے سارے تار اس کے قدموں میں الجھے جا رہے ہیں۔ راج بھرے ہوئے گلے سے کہتا گیا "کبھی کبھی مجھے معلوم ہوتا ہے جیسے چاند میرا پیار اب انفرادی بندھنوں سے پرے ہو لیکن ہڈیوں میں کھولتے ہوئے سیال کی طرح تیرا کرتا ہے۔"

ماحول بہت بوجھل ہو گیا تھا۔ لوگ کچھ بھی کہیں کہیں چاند تو زمین والوں کے دکھ سکھ سے بلند غیر جانبدار بے تعلق ہے۔ اور یوں بھی تخ بستہ تودہ ہے۔ جس میں انسان انسان کی دکھ بھری زندگی الجھے ہوئے مسائل اور کشمکش کب کی ختم ہو چکی ہیں اس میں صرف سونے بہار چٹیل میدانوں کے سوا اور کچھ باقی نہیں ہے۔ وہ الجھنوں میں کیا پڑے کہ زمین پر رینگنے والے کیڑے اپنی زندگی، اپنی رہن سہن، اپنا سماج اور اپنے نظام کو بدل کیوں نہیں ڈالتے بجوں اپنی ہڈیوں میں کھولتے ہوئے سیال کو تیرنے دیتے ہیں۔ اور خود بھی پگھل کر سیال ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے جال کے تار خود بخود ڈھیلے پڑتے گئے یہاں تک ان کے شکار آزاد ہو گئے۔ اور وہ خود بخود تھکا ہوا سا ایک کلیے یا دل کے ٹکڑے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ چاندنی دھندلی پڑ گئی۔ تینوں بوجھل دل لیے اس بار لوٹ آئے۔ ڈھائی بج گئے تھے صرف ایک رکشہ مل سکا۔ تینوں اسی میں بیٹھ گئے۔ رکشے کے ہچکولوں کے ساتھ ساتھ جیسے راج کے خیالات میں پھر گردش شروع ہو گئی۔ وہ بولا آجکل جب دن کے ہنگامہ پر ور حدود پار کر کے رات کے پرسکون آنچل میں دم لینے کیلئے آنکھیں بند کرتا ہوں تو کیا خواب دیکھتا ہوں۔ ایک وسیع اور بے پایاں سمندر ہے۔ اس کے کنارے ایک بہت بلند مینار ہے جس کے ایک جھروکے میں یکایک میرا پاؤں پھسل گیا ہے۔ اور میں گرتا جا رہا ہوں اور راج کا گلا رندھنے سا لگا۔ اور رکشے کی بھیگی ہوئی سلاخ پر سر ٹیک کر سو گیا جیسے واقعی بہت بلندی سے گر کر بے ہوش ہو گیا ہو۔ دیوندر نے تسلی آمیز انداز سے اس کا

ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا لیکن کوئی منہ سے بولا نہیں۔ چاند اب گھنے بادلوں میں بالکل ہی چھپ گیا تھا اور جیسے تینوں دبیز اندھیرے میں گھٹ رہے تھے۔ چاند نے آنکھیں کھولیں تو ہر طرف اندھیر اگھور ہو تھا یا اندھیر ابھی کو گھیرے ہوئے تھا۔ راج ۔ کنور ۔ یہ وید وہ نئی ماں اس کی معصوم ممتا ۔ وہ سماج کی بیوی" اور اس کا گھر ۔ دنیا ۔ سب کے سب اندھیرے کے سمندر میں بغیر بادبان کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ بالکل غیر مادی پرچھائیوں کی طرح جن میں حقیقت کا کوئی ٹھوس پن نہیں اتنے میں رکشہ ڈھال پر پہنچا۔ اور رکشہ والے نے جیسے پیڈل سے مار کر چھوڑا تو اس جھٹکے سے نیچے کی طرف چل پڑا کہ راج کو معلوم ہوا کہ جیسے سچ مچ وہ آج مینار سے گر پڑا ہو اور ایک بے پایاں خلا میں گرتا چلا جا رہا ہو۔ جہاں سے وہ آواز بھی دے تو خلاؤں اور فضاؤں میں ٹکرا کر گنبد کی آواز کی طرح پھر اس کے کانوں میں واپس آ جائے یکا یک اس کی پسلیوں میں ایک درد سا اٹھا اور انجانے میں اسکی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ ٹپک کر گال پر ڈھلک پڑا ہے اس اندھیرے میں یکا یک ایک چمک پیدا ہوتے ہی چاند نے حیرت سے دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ سوچنے لگا۔ یہ جس کی ہڈیوں میں تپا ہوا اسپات نیر رہا ہے جو افرادی محاذ کو کچل چکا ہے یہ اس کی تپتی ہوئی آنکھوں سے ٹپکا ہوا آنسو ہے : پانچ سال میں یہ پہلا آنسو تھا جو اس نے ان پلکوں سے باہر ہوتے ہوئے دیکھا۔ چاند کو محسوس ہوا جیسے وہ آنسو کا قطرہ نہیں سفید چمکتا ہوا لیکن تپتے ہوئے فولاد کا ٹکڑا ہو۔ جس کے پلکوں سے باہر آتے ہی ساری کائنات جگمگا اٹھی ہو۔

وہ سوچنے لگا۔ حالانکہ یہ سب ہی بزدل اور ماحول کے غلام اور حالات کے قیدی ہیں لیکن راج کے اس آنسو میں کنور کے باغی خیالات ہیں۔ اس آرتی کے دیپ جیسی نوعروس میں اس نور العین کی بھی ہیں۔ اپنا سارا دکھ ممتا میں گھول کر پی جانے والی اس ماں میں ہیں۔ سب ہی ہیں ایک پیاس بھری ہے۔ جو روشنی کی پیاسی ہے۔ جدا جانے ہیں آنسے کیلئے بیتاب ہے اس لمحہ چاند کو محسوس ہوا جیسے وہ صرف چاندی کا ایک ٹکڑا نہ ہو۔ جیسے وہ سونے اور کانسی پہاڑوں اور چٹیل میدانوں کا ایک بے مصرف کرہ نہ ہو۔ بلکہ وہ جیسے روشنی کا دیوتا ہو۔ امرت کا ایک لہراتا ہوا سمندر ہو اور یہ سب اس کے اپنے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے ہوں جو اس سے الگ جا پڑنے کے بعد تاریکی اور دھند کے بھٹک بھٹک کر نئی روشنی نئی زندگی نئے نظام کی تلاش میں لڑکھڑاتے ہوئے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں

ڈیلائیٹ بیکری

کرسمس شادی بیاہ، سالگرہ اور دیگر پر مسرت تہواروں کے موقع پر
ہمارے اسپیشل کیک آپ کی خوشیوں میں اضافہ کریں گے !

ہمارے یہاں :-

لذیذ پیسٹری ، نرم و نازک کیک —
خوش ذائقہ پیٹیس ، ملک ٹوسٹ کھاری بسکٹ
بن پاؤ . ڈونٹس ہر وقت تازہ اور تیار ملیں گے

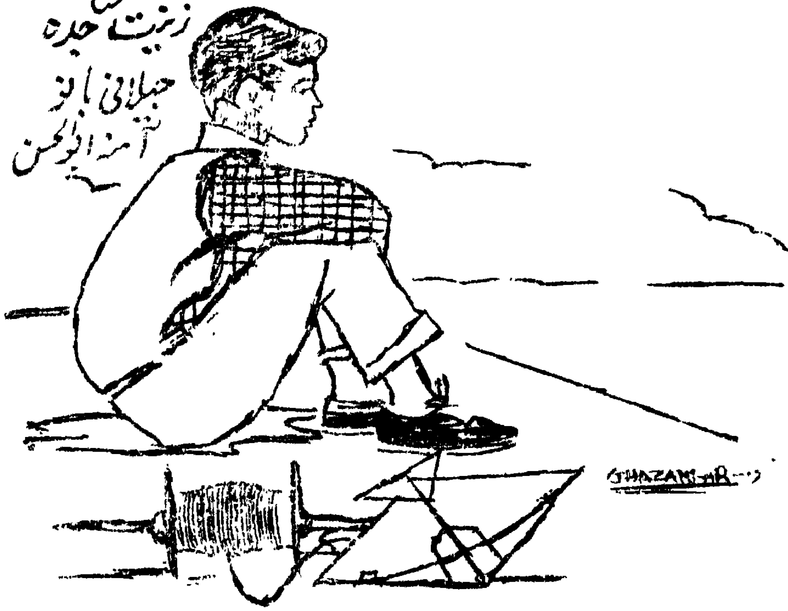
ڈیلائٹ بیکری

نذرانہ کمپاؤنڈ بھیونڈی

شاخیں: (۱) انصاری اسٹورس — مدار چوک بھیونڈی
(۲) غالب سویٹ میٹ مارٹ . ہندستانی مسجد محمد علی مارکیٹ روڈ بھیونڈی

یادوں کی انجمن

اقبال متین
زینت ساجدہ
جیلانی بانو
آمنہ ابوالحسن



مٹی کے گھروندے ڈھ جائیں تو ان کو دیکھ کر کوئی بھی تو یہ نہیں کہتا کہ ایک چھوٹی سی دنیا اجڑ گئی ہے۔ تم جب سے گئے ہو میرے دل میں بھی کسی نے جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔

میں بھی چپ ہی رہی۔ میں کرتی بھی تو کیا کرتی۔ عقل ٹھکانے ہو تو آدمی کوئی ڈھنگ کی بات سوچے بھی نا۔ تم گئے ہو تو جدا ہو کر پہلے تو مجھے جدائی کا احساس کم کم ہوا... ایک عجیب سا ڈر میرے دل میں اس طرح بس گیا تھا جیسے آنگن کے دو گھنے گھنے سائے تنے تھے

سارے میرے دل میں اٹھ آئے ہوں جن میں کھیلتے کھیلتے ہم یکایک کسی نامعلوم خوف کے تحت بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ نیپر، تمہیں کیسے بتادوں جان، آج تو ہر گھنے سائے سے بھی جی اداس ہو جاتا ہے۔

تم کیسے سدھارے میرے راجے۔ میں تو آج بھی ایسا ہی کچھ محسوس کرتی ہوں کہ جیسے تم بھاگتے ہوئے ابھی دروازے میں داخل ہو جاؤ گے، نیا پتنگ نیا مانجھا اچک کر الماری پر سے نکال کر مجھ سے الجھو گے "ہٹو نا بیچ میں سے، راستہ کیوں روکتی ہو" اور پلک جھپکتے میں یہ جا وہ جا۔

تمہیں تو اپنے پلنگ کی پائیں سے اپنا پتنگ بچا کر نکلنے میں جتنی دیر لگتی تھی اتنی دیر بھی نہ گوارہ تھی۔ کتنے ہی بار جست لگا کر تم نے ابا کا پلنگ پھلانگ لیا تاکہ تمہارا ایک منٹ بھی ضائع نہ ہو۔ تم تو اپنی پتنگ بازی کے وقت کو اس طرح اپنی مٹھی میں رکھ لینا چاہتے تھے جیسے تم نے ہاتھ کھولا اور پھر سے اڑ گیا وہ

آج جان گئی ہوں نیپر کہ تم کم سے کم وقت میں زندگی کی زیادہ سے زیادہ خوشیاں کیوں لوٹ لینا چاہتے تھے۔

کتنے ہی پتنگ صحن میں آج بھی کٹ کٹ کر گرتے ہیں جان
کتنے اوپر ہی اوپر سے صحن کی ویرانیوں پر نظر ڈال کر آگے نکل جاتے ہیں

میں سوچتی ہوں میرا بھیا تو کسی کٹے ہوئے پتنگ کے پیچھے نظریں آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے بھاگتا بھاگتا دور نکل گیا ہے۔ پتنگ کو بلندیوں تک لے آنے کی آرزو میں خود عرش تک جا پہنچا ہے۔ اس عرش پر جس پر سنتی ہوں اللہ میاں رہتے ہیں۔ وہی اللہ میاں جو ہم سب کے بڑے چہیتے تھے۔ اور ان سے تمہاری چاہت تو کچھ ہماری چاہت سے بھی سوا تھی۔ تم تو ان کا نام لیے بغیر کتاب کھولتے تھے۔ نہ پنسل کی نوک باریک کرتے تھے

تم جب سے سدھارے ہو نیپر۔ امی تو بس پاگلوں کی طرح تمہارے اللہ میاں کی ہو کر رہ گئی ہیں۔ وہ سجدہ کرتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دنیا بھر کی نظروں سے اپنے آنسو چھپا چھپا کر تمہارے اللہ میاں کو دے رہی ہیں وہ ان موتیوں کو تم تک پہنچا دے

ایک بات تمہیں بتا دوں فیسرو۔ تم بُرا تو نہیں مانوگے

باباکرامی کی نمازوں سے شائد کچھ وحشت سی ہوتی ہے۔ انھیں تو اپنا دکھ درد اللہ میاں کے سامنے رکھنا بھی گوارہ نہیں ہوتا۔ تم تو جانتے ہو نا۔ وہ ہر بات چپ چاپ سہہ جاتے ہوئے ہیں ہمدردیوں کی تلاش کرتے رہنا ان کے نزدیک غموں سے بے وفائی کے مترادف ہے۔ اپنے دکھ کی کڑی دھوپ کو سکھ کی چاندنی کی طرح پیار کرنے والا میں نے ان جیسا تو نہیں دیکھا۔ امی کو پھر اللہ میاں کا سہارا تو ہے۔ ایک تقویت تو ہے۔ ایک قوت تو ہے۔ یہاں تو وہ بھی نہیں ہے نانیسرو۔ تم چلے گئے تو وہ یک بیک یکلخت خاموش ہو گئے تھے۔ پھر اس خاموشی نے انھیں یہ احساس دلایا کہ لوگ اس خاموشی کے سہارے ان کے دل تک پہنچ رہے ہیں۔ اس دل تک جس میں انھوں نے تمہاری یادوں کی ایک انجمن سجا رکھی ہے۔ اس تک جس میں انھوں نے تمہیں بسا رکھا ہے ان کے دل کی اس دنیا تک کسی اور کا چلے آنا بھی شائد انھیں گوارہ نہیں انھوں نے اس چپ سے بھی ہاتھ اٹھا لیا۔ اور کچھ اس طنطنے سے زندگی کی رہا ہی میں شامل ہو گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔

اب یہ بات میں سوائے تمہارے کس سے پوچھ سکتی ہوں فیسرو

وہ آنکھیں جو صرف تمہیں دیکھتی رہیں وہ کان جو صرف تمہیں سنتے رہے۔ وہ دل جس نے زندگی کے ہر لمحے میں سب سے زیادہ تمہیں محسوس کیا۔ تم ہی بتاؤ تم سے ان کی دیوانہ وار محبت پر خود مجھے کتنی ہی بار رشک نہیں آیا۔ اولاد تو ہم بھی تھے میں، نذر، نشو، لیکن تم نے اپنے مختصر سے قیام کا کبھی بابا کو احساس تو نہیں دلا دیا تھا۔ آفس سے گھر تک پہنچتے پہنچتے راستے ہی میں ان کی نظریں تمہیں کچھ اس طرح تلاش کرتیں جیسے تم ان کے ساتھ چل رہے ہو لیکن نظر نہیں آ رہے ہو۔ گیٹ میں داخل ہوتے ہی ان کی آنکھوں کو بس ایک چیز کی تلاش ہوتی اور تم انھیں نظر آ جاتے آنکھوں کی وہ ٹھنڈک جو تمہیں دیکھ لینے کے بعد انھیں نصیب ہوتی اور اس کو چھین لینا تو خدا کے بس کی بات بھی نہیں ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن تمہارے اللہ میاں کے ہاتھ میں تو سب کچھ ہے۔ مگر فیسرو میں تم سے کہوں کہ تمہارے اللہ میاں ایک دن میرے ابا کا دل نکال کر اپنے سینے میں رکھ لیا۔ تب جانوں۔ ایک دن صرف ایک دن

میں جانتی ہوں کہ شاید یہ ایک بات عنبر میاں کے بس میں بھی نہ ہو گی ،

تم جو تو پہلے ہی کتنے بے سہارا ہے ابا کہ اس کے آنسو اس کی اپنی پلکوں تک صرف پاس نہیں سکتے کہ ان آنسوؤں تک کسی دامن کی پہنچ بھی اہانت آمیز معلوم ہوتی ہے۔ میں نے اپنے قدموں کے مقابلے میں اتنا سفاک آدمی نہیں دیکھا، وہ آدمی جو اپنی خوشیوں کی تقسیم کرنے کیلئے نئے نئے ڈھنگ تلاش کرتا رہا ہے۔ آج اپنے غموں کے معاملے میں اس قدر بخل سے کام لیتا ہے کہ مجھے وحشت ہوتی ہے۔ کبھی جی چاہتا ہے اس کے سینے پر سر رکھ کر خوب روؤں اتنا جھنجھوڑ کر اس سے کہوں کہ ایک بار ہم سب سے چمٹ کر رو لو۔ ایک بار اپنے سینے کا درد مجھی آنکھ کر ہیں کر دیں دو ہم اپنے آنسوؤں سے تو اسے ٹھنڈا کر لیں لیکن وہ تو راکھ کے نیچے نہیں پتھر کی سل کے نیچے اپنی آگ کو اس جتن سے چھپائے بیٹھا ہے۔ جیسے یہی گرمی حیات ہے جان۔ نشو کو چومتے چومتے اس طرح چھوڑ دیتا ہے جیسے کسی نے اس کے ہونٹوں پر بجلی کی قاشیں رکھ دی ہیں۔ پھر جدھر نظر پھر جاتی ہے بس ادھر ہی گھومتا رہتا ہے۔ اور اس عالم میں اگر وہ جان لیتا ہے کہ میں اسے تک رہی ہوں یا امی ہی کنکھیوں سے اسے دیکھ رہی ہیں اور اس کے دل تک پہنچ رہی ہیں تو وہ لپک کر نشو کو پکڑ لیتا ہے اور اپنے بے جان ہونٹ نشو یا نندو کے گالوں پر رکھ دیتا ہے۔ تم تو اپنے نشو کو کتنا چاہتے تھے نا فیروز۔ اس کو چھوڑ چھوڑ کہتے تھے تمہاری زبان سوکھتی تھی

اپنے نشو کا پیار۔ نندو کا پیار۔ میرا پیار، اپنے پاپا کو لوٹا دو میری جان ۔

اپنے آنسوؤں کو خاک میں ملا دینے کیلئے بھی تنہائیاں تلاش کرنا، غم کی عظمت ہو تو ہو ہم سے ناانصافی تو ہے ۔۔ نشو اور نندو عمر کی اس منزل میں ہیں کہ غم بانٹ لینے کا سوال ہی ان کے لئے پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن میں تو بچی نہیں ہوں مجھے تو یہ احساس کھائے جاتا ہے میرے بھیا! میرے دل کی چھوٹی سی دنیا میں جھانک کرا لینے یہ پتہ لگا لیا کہ اس کی اپنی غموں سے بھری ہوئی دنیا سے دل کی پرچھائیاں میری اس چھوٹی سی دنیا پر بھی پڑ رہی ہیں سو وہ اسے اپنے سینے سے لگائے ہوئے کسی راز کے افشا سے ڈرتا ہے۔ اور میں چاہتی ہوں کہ وہ مجھے برابر کا شریک ستم سمجھے۔ اسی لئے تو میں نے بات اس طرح شروع کی تھی فیروز کے منہ کے

گھر نہ سے نوحہ جائیں تو انھیں دیکھ کر کوئی بھی تو یہ نہیں کہتا کہ ایک چھوٹی سی دنیا اجڑ گئی ہے۔

—— (۲) ——

اقبال متین

لوگ کہتے ہیں بستیاں جتنی جلد اجڑتی ہیں اتنی جلد آباد نہیں ہوتیں۔ شاید لوگ سچ ہی کہتے ہیں۔ اگر غلط کہتے تو میرے دل کی بستی بھی اجڑی اجڑی نہ رہتی اس میں بھی آرزوؤں کے گل دگلزار کھلتے، خواہشوں کے پرند چہچہاتے۔ امنگوں کے جھرنے اپنے مدھر سنگیت سے دنیا کو موہ لیتے لیکن رابعہ بھیا جب سے تو گئی ہے۔ ریگستان زندگی میں ایک بھی ٹھنڈا میٹھا چشمہ نہیں پھوٹا۔ ایک بھی الھڑ مسافر اس چشمے کی تلاش میں زندگی کا راستہ پوچھنے نہیں آیا اور اب میں سوچتی ہوں دشت گیرے کی طرح آخر کب تک منڈلاتی رہوں گی۔ بکھروں کے موتی، نراشا کا اندھیرا اور ایک موہوم مبہم تاریکی سمیٹے، ایک ڈر، ایک کسک ایک جلن چھپائے ہوئے ایسی اداس پرچھائیاں سے لگتے ہیں۔ نشو سدا کھلونوں میں الجھا ننھے ننھے جتنے تو نے جو جگہ خالی کی ہے وہ اسے بے جان کھلونوں سے پر کرنا چاہتا ہے۔ ندو تو جیسے سیماب کا دوسرا نام ہے۔ جب یہ خلش سمجھنے کے قابل ہوگا، تو میں اسے کیا جواب دوں گی۔ ابھی تو وہ گھر کی دیواریں اور پڑوس پھلانگتا رہتا ہے۔ جب اپنی قمیص کے دامن میں کچے پکے امرودوں اور املیوں کے ڈھیر جمع کر کے لاتا ہے۔ تو حصہ بٹانے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ بظاہر وہ مطمئن ہے لیکن میں خوب جانتی ہوں اس کی روح پیاسی اس کی آنکھیں متلاشی ہیں۔ پہلے تو ان امرودوں کو کترتا جاتا، رنگتا ہے پھر ٹھوک دیتا ہے۔ پھر ان کی ننھی سی ڈھیریاں چارپائی یا انگنائی میں انڈیل کر چپ چاپ گھر سے باہر نکل جاتا ہے محلے کے بچے اپنے بہن بھائیوں کا ہاتھ تھامے جب اس کے سامنے سے گزرتے ہیں تو وہ ایک کنارے میں شامل ہو جاتا ہے۔ پھر کسی نہ کسی کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دیتا ہے۔ مٹھائیوں، کھلونوں، رنگ برنگی پتنگوں کا لالچ دیتا ہے۔ فیروزا جا۔ کیا تم جانتی ہو۔ یہ سب کیوں اور کس لئے۔

یہ تمہاری خواہش ہے رابعہ، جب تم اس کی چیزیں کھسوٹ لیتی تھیں۔ بڑی محنت سے توڑے ہوئے پھلوں میں حصہ بٹانے دھاندلی کیا کرتی تھیں۔ تب اماں آنکھیں غصے سے لال کرتی تھیں لیکن اس غصے کے پیچھے تمہاری بڑائی اور بزرگی کا جو احساس چھپا رہتا تھا

وہ آخرکار اسے حصہ بٹلنے پر مجبور کر دیتا تھا اور پھر بڑے پیار سے تم سب کچھ لوٹا دیتے۔ لیکن آج —

اگر تم دیکھ سکتے ہو تو دیکھو، ندو کی آنکھیں کیسی بے بس اداس خالی خالی نظر آتی ہیں۔ ان میں وہ چمک مفقود ہو گئی ہے جو تم سے جھگڑتے وقت پیدا ہوا کرتی تھی، جو لمحہ بہ لمحہ تیز تر ہو کر یہ جتلایا کرتی تھی کہ میں چھوٹا ہوں اور چہیتا بھائی ہوں اور تم میرے محافظ ہو —

اور جن ہستیوں پر ہمیں اختیار رہتا ہے یا جنکی نگرانی سے ہم خود اعتمادی اور تو انائی کا احساس اور جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اگر دور چلی جائیں یا ہٹالی جائیں تو آدمی خود کو کتنا بے کار اور بے مصرف سمجھنے لگتا ہے۔ یہ ندو کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے۔

راجہ بھیا — بابا کہتے ہیں " رومت" جب یہ کہتے ہیں تو امی اور زیادہ رونے لگتے ہیں اور میں ہنس پڑتی ہوں، اب تمہیں کس طرح بتاؤں، یہ کہتے ہوئے بابا خود کو کتنا کمزور اور ناتواں محسوس کرتے ہیں انھوں نے اس کمزوری کا بدل مصروفیت کو ٹھہرایا ہے۔ شاید یہی اس کا صحیح علاج ہو، لیکن شاید بابا نہیں جانتے، جو دل میں جھانکنے کی طاقت رکھتے ہیں یہ چہروں سے انسان کا حال پڑھ لیتے ہیں وہ یہ محسوس کر لیتے ہیں کہ زندگی ایک زہر کی بوند کی طرح آہستہ آہستہ ان کے دل میں اپنی تندی اور تلخی بکھیر رہی ہے۔ تم دیکھنا ایک دن وہ سب کمزور ثابت ہو جائیں گے، تب یک بخت پھوٹ کر رو پڑیں گے۔ اور کبھی نہیں کہیں گے "رومت" رو کیونکہ یہ کھوئے ہوئے قدر دانوں کے ملنے تک انھیں اس کھوئی ہوئی زندگی کے نقش مل جائیں گے جو منزل پر پہنچ کر ان کا راستہ کھوٹا کر گئے۔ اور بابا سمجھتے ہیں میں بچی ہوں۔ میں ان کا حال نہیں جانتی۔ میں آنسو پیتا دنیا کے بھید بھاؤ اور زندگی کا بوجھ سہانا نہیں جانتی صرف ہنسنا مسکرانا جانتی ہوں۔

کل اماں نے تمہارے سارے کھلونے ندو کی الماری میں جوڑ دیئے، تو اب تعین جکنا چور کرنے کیلئے یہ جین نظر نہیں آتا اور ندو خود گھنٹوں بیٹھا محویت سے انھیں دیکھا کرتا ہے جیسے وہ اپنے بھیا فیرو کی خواہشوں کے اہتمام میں اس کی ایک ایک چیز سنبھال کر جوڑ جتن سے رکھ رہا ہو شاید اس کا بھولا بھٹکا بھیا کبھی آجائے۔ چپکے سے آ کر سامان کی حفاظت کیلئے سابقی دینے جائے

بیچارا ندو —

جب ایک چراغ بجھتا ہے تو لازماً دوسرا سلگایا جاتا ہے۔ لیکن امی کے دل میں ہونٹ اندھیرے ہیں اور پرچھائیاں۔ میں سوچتی ہوں اب محض آنسو بہاتے رہنے سے کام نہیں چلے گا، امی کو زندگی کی طرف واپس لانا ضروری ہے۔ اگر کہیں اسی طرح فاصلے کی آگ میں جلتے جلتے وہ اپنا تن من جلا بیٹھیں تو —؟

تم سوچ نہیں سکتے کہ ممتا میں وہ محبت بکھر جائے گی لیکن اگر اس گھر میں یا اس دنیا میں ان تمام افراد کے دل میں جو امی سے وابستہ ہیں، کیسی کیسی تباہیاں اور بلائیں آ سکیں گی اس لئے اگر تم دیکھ سکتے ہو تو دیکھو میں مسکرا رہی ہوں، میں نے اپنے آنسو پونچھ لئے ہیں میں اب قہقہے لگاؤں گی، میرے بھیا یہ تم سے امی کی گہری محبت کی جلن نہیں خود اپنے آپ سے انتقام اور امی کے زخمی احساس پر ایک تازیانہ ہے۔ وہ یقیناً خفا ہوں گی ڈرائیں گی دھمکائیں گی مجھے اپنی بڑھتی ہوئی عمر بے حسی اور حالات کا احساس دلائیں گی۔ تب ان کی خاموشی دفعتاً ٹوٹ جائے گی، ان کا احساس پھیلتا اور بڑھتا جائے گا۔ دنیا یکایک انھیں اپنے شکنجے میں کس لے گی، پھر ان کی نئی زندگی شروع ہو گی، جس میں ان کے باقی بچے ہیں ان کا گھر ان کی زندگی ہے۔ اس دن شاید یہ اندھیرا مہلک سے چلے جانے سے ہر سو پھیل گیا ہے کچھ کچھ چھٹ جائے میرے بھیا — یہ دنیا ہے۔ یہاں رنگ آتے اور جاتے ہیں ٹوٹتے ہوئے گھروندوں کے نیچے تلے اگر زندگی منتشر کردہ جائے پھر کر چپ چاپ کھڑی ہو جائے تو اللہ میاں بیچارے کیا کریں۔

آمنہ ابوالحسن

• • •

— (۳) — زینت ساجدہ

گھر کی ڈیوڑھی میں روشن چوکی بیٹھی ہے۔ اور شہنایاں پنجم سروں میں بج رہی ہیں راگنیاں بابل کے گیت گا رہی ہیں۔ ہر طرف روشنی ہے۔ یہاں ہیں رنگ برنگے کپڑوں کی بہار ہے۔ اور پھول مہک رہے ہیں۔ اور میں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ عمر کی کس منزل میں ہوں۔ دس سال کی الھڑ لڑکی یا ساٹھ برس کی بڑھیا۔ یا سترہ سالہ دلہن۔ گریشیم

کہ الجھے الجھے کی طرح سب کچھ الجھ گیا ہے۔ اور یہ سمجھنے سلجھنے کی بات مجھے تم سے پوچھنی ہے۔ میرے بھیا تمہارا نام ہونٹ لینے کیلئے تو سب کچھ بھول بیٹھے مگر اب معلوم ہوا کہ اور سب تو بھلا دیا صرف تم ہی تم یاد ہو۔

ڈیر بھیا آج کتنے دنوں بعد تم سے مخاطب ہوں۔

مگر نہیں، تمہاری جدائی کے اتنے ماہ و سال چپ چاپ گزر گئے۔ یہ پل پل تمہاری یاد ہی میں گزر رہے ہیں۔ تم جا کر بھی نہیں گئے تھے۔ بابا کے دل میں امی کی آنکھوں میں، ندو اور نشو کی لڑائی جھگڑوں میں، صحن، چھت، دالان میں تم مجھے ہر جگہ نظر آتے تھے۔ میری تو ہر طرح مشکل تھی۔ ندو، نشو تو اتنے چھوٹے تھے کہ ان کی یادیں ایک بھنور پڑا اور غائب بابا اور امی بڑے تھے۔ اور اتنے بڑے کہ ایک نے غم سے پیار کرنا سیکھ لیا تو دوسرے نے خدا کا آسرا ڈھونڈ لیا۔ مگر میں سمجھ اور ناسمجھی کے منجدھار میں تھی اور اس وقت سے جو ڈولتی ابھرتی چلی آرہی ہوں تو آج تک وہی حال ہے۔ بھیا تم تو جاتے جاتے میرا بچپن بھی لوٹ لے گئے وہ عمر جو گڑیاں کھیلنے، رنگ برنگے کپڑوں سے خوش ہونے اور چھوٹے نگوں کے چمکدار گہنوں کے لئے ضد کرنے کی ہوتی ہے۔ وہ بس سہمی سہمی گزر گئی، گڑیاں کھیلنے میں پھر دل لگا نہ مزہ آیا۔ مزا تو جب آتا جب تم دندناتے آتے اور میری گڑیا کی چٹیا پکڑ کر اچھال دیتے تو میں جھپٹ کر گڑیا کو سینے سے چمٹا لیتی رنگین کپڑوں کے لئے جب ہی مچلنے کو جی چاہتا تھا جب بابا تم سے پوچھتے تھے۔ "نبیر! تم میلے میں کیا لوگے۔"

اور پھر پہنتا بھی کس کو تھا! تمہارے جانے کے بعد تو ہمارے گھر میں عید آئی ہی نہیں بس وہ آخری عید تھی جب تم اپنی ریشمی شیروانی جلدی سے اتار کر پلنگ پر ڈال گئے۔ امی آوازیں دیتی ہی رہ گئیں اور تم پتنگ چرخی ہاتھ میں لے کر کوٹھے پر چڑھ گئے۔ بہت دیر تک اودھم مچاتے رہے۔ اور نیچے اتر کر دوڑتے ہوئے آئے اور پلنگ پر لیٹ گئے اور ایسے لیٹے کہ پھر تمہیں کوئی جگا نہ سکا

گھر میں ہر طرف عطر کی مہک تھی، پھول تھے، رنگین کپڑوں کی بہار تھی۔ سجاوٹ تھی مٹھائی اور پان تھے۔ عید ملنے کیلئے جو لوگ آئے تھے وہ سب بھی بنے سجے تھے اور

بتیں دے گئے تو امی نے کہا دیکھو دولہا کی برات جا رہی ہے۔
تم تو چکرا دے گئے۔ میں نے تو دیکھا تھا بہنیں اپنا آنچل بھائی کے سر پر ڈالتی ہیں تو وہ دولہا کہلاتا ہے۔ نندیں بھابی سے گلہ شکوہ کرتی ہیں تو بھیا کا گھر بستا ہے۔ نیگ کے لئے کوئی نہ جھگڑے نیوستے کے لئے کوئی نہ روٹھے تو پھر کیسی بارات گئی۔ تم کیسے دولہا بن گئے تم نے میرا حق بھی مجھے لینے نہ دیا۔

بس پھر عید آتی تو ہم گھر پڑی نہ رہتے۔ ہمارے کیلنڈر سے وہ دن ہمیشہ کیلئے غائب ہو گیا مگر بابا کی بڑھتی ہوئی سنجیدگی اور ان کے بلبلاتے ہوئے آنسوؤں نے ایک دم میری کایا پلٹ دی یا تو ایسی چپ لگی تھی کہ پالا مار گیا ہو۔ یا پھر ایک دم بدل گئی۔ اوروں کے لئے تو شفاف نیلے آسمان کے نیچے اڑتی ہوئی پتنگوں میں سے کوئی ایک کٹ گئی تھی۔ مگر ہمارے لئے زندگی کی ڈور الجھ گئی تھی تا میں نے اچانک جان لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ نہیں معلوم کیسے میں نے سب کچھ سمجھ لیا کہ بٹیا رانی اپنے بابا کو سنبھال لو، اپنی امی کو چھوڑو اور اندر نشو کو بہلا لو، ورنہ تم پاگل ہو جاؤ گی۔

پھر تو میں کچھ نہ کچھ ایسا کام کر بیٹھتی کہ امی جھلا اٹھتیں۔ ڈانٹ ڈپٹ کرتیں اور مجھے یاد دلاتیں کہ وقت کی نزاکت کو سمجھوں۔ جسے میں نہیں سمجھ رہی تھی۔ اس سے یہ تو ہوا کہ گھر کی مفلوج زندگی میں حرکت پیدا ہوئی۔ دھیرے دھیرے اس گھر میں بسنے والے اس قابل ہوئے کہ دل میں غم کو محفوظ کریں اور زندگی کے رکے ہوئے کام چل پڑیں۔ ابا کے دل کو ہر طرح سے میں نے گھیرنے کی کوشش کی، میں ننھی گلہری کی طرح ان کے آس پاس ہی تاک لگائے بیٹھی ہوتی کہ، پیار کا ایک دانہ بھی ملے تو جھپٹ لوں۔ تمہارا نام ہم دونوں میں کسی نے نہیں لیا مگر دونوں ہی جانتے تھے کہ ایک ہی خلا کو پر کرنا ہے۔ تم ہوتے تو میں شاید بابا کو کبھی اتنا سمجھ پاتی نہ وہ مجھ سے اتنا قریب آتے۔ اب تم ہی بتاؤ میرے بچپن نے کیسی لمبی جست لگائی کہ میں نے اپنے بابا کو ناداں بچہ سمجھ لیا۔ جوتی کا کھلونا ٹوٹ جائے۔ تو سب کچھ روٹھ جاتا ہے۔ اور اسے منانے کیلئے ماں کا جی چاہتا ہے۔ گگن سے چاند اتار لائے۔ اور آج میں اسے چھوڑ کر پرائے گھر جا رہی ہوں۔ دولوں پہلے سے میں نے دیکھ لیا ہے۔ کہ پھر ان کا چہرہ دھندلا گیا ہے۔ میرا بس چلتا تو میں کہیں نہ جاتی مگر دنیا کے کچھ دستور ہیں وہ سب کے لئے یکساں ہیں۔ ان ہی میں یہ بھی ہے کہ

بیٹیاں جلد یا بدیر چلی جاتی ہیں کہ انھیں پرائے گھر جانا ہے تم ہوتے تو آج مجھے جاتے ہوئے اتنا دکھ کاہے
کو ہوتا۔ عورتیں بدائی گیت گاتیں تو میں ضرور روتی۔ پر وہ آنسو کچھ اور ہوتے پھر تم ہوتے تو بابا کو
اتنی فکر کہ ان بٹیا لے جانے والا اسے سمجھے گا بھی کہ نہیں۔ نہ میرا دل ہول کھاتا کہ میں کیسے جا رہی ہوں۔ بیاہ بابٹ
لینا ہر ایک کے لئے آسان نہیں ہوتا۔ تم میری آنکھوں سے آنے والے کو مجھ سے پہلے دیکھتے۔

بھیا میرے میں آج تو جا رہی ہوں مگر ساون میں کس کا نام لے کر گیت گاؤں گی کون میرے
لئے دوڑ دوڑ کر آئے گا۔ ساون آیا میرے بھیا کو بھیجو جی۔ گھوڑی چڑھ میرا بیرن جب آئے
میں رستے پھول بچھا دوں۔ بھیا میرے وہ سپنے کا گنگنا میرا ہے اپنے بچوں کو میں جھولا جیسے
دکھاؤں گی۔ افوہ میرے ترنج ہزاری۔ لے اللہ یہ سب میں کیوں کہہ رہی ہوں۔ مگر یہ باتیں
پھر کس سے کہوں اور تم سے یہ سب کہتے جھجک کیسی؟ آج دل کھول کر باتیں کر لینے دو۔ رو لینے
دو۔ سب یہی سمجھیں گے کہ بیٹیاں یونہی رو دیا کرتی ہیں۔ آج گھونگھٹ کی اوٹ میں میرے
آنسو بابا کی نظروں سے چھپے رہیں گے۔ ورنہ تم جانتے ہو وہ بنا کہے دل کی بات کو جان لیتے ہیں۔ آج
میں دل کو ہلکا کر لینا چاہتی ہوں۔ آج میں تمہاری بہن کو بہلا پھسلا کر یہیں چھوڑ جانا چاہتی ہوں
ورنہ مزید اس خول کی حفاظت مجھ سے مشکل ہے۔ ابھی تک میں نے اس کو خول میں بند رکھا

اور تم کتنے ظالم ہو -- آج جب شہنائیاں بج رہی ہیں تمہاری آواز کہیں سے
نہیں آتی۔ میرا بڑا بھائی اس گھر کا بڑا بیٹا کہاں ہے۔ ایک ننھا سا لڑکا چھت پر بیٹھا ہنس
رہا ہے۔ بہن گڈی پتنگ اڑانے میں مصروف ہوں۔ مگر تم، تم بڑی ہو گئی ہو نا۔ بیاہ
جا رہی ہو۔ بہن بوڑھی ہو جاؤ گی، نانی اماں --- میں تو وہی بارہ سالہ فقیر رہوں گا۔ دنیا
سے لینے والا نہیں بلکہ شہر میں لڑاکا۔ جیسے گزرتے ہوئے دن کبھی نہ بدل سکیں گے جو ہنستا کھاتا
دھوم مچاتا، اچانک ایک دن چاند پر جا بیٹھا۔ جیسا ہے تم نے وقت کو جیت لیا۔

بابا آپ فرض ادا کر رہے ہیں۔ امی ایک کاج کر رہی ہیں۔ مگر دونوں ان کی
طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی ایسے موقعوں پر بیتے دن بہت یاد آتے ہیں۔ اور جب
بابا نے سر سے ہنسے تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کہ ابھی ابھی بابا سے سمدھی سے
کہا، بھیا تم بیٹی دے ——————

نہیں ہے ہو۔ میں تمہیں پلا پلایا، بٹیا تیرے بابا ہوں اسے اپنا فیصلہ ہی سمجھنا۔ شاید وہ آج اتنا بڑا ہوتا۔ لوگ بھی تسکین دینے کیلئے کیسے شعلے بھڑکاتے ہیں۔ کیسی بے رخی ہے یہ گر مٹی کے گھروندے ڈھہ جائیں تو کیسے پتہ چلتا ہے کہ ایک پوری دنیا اجڑ گئی ۔۔ اور کیسی عجیب بات ہے کہ ان ویران کھنڈروں میں انھیں نئی عمارت کی نیو نظر آتی ہے۔ مگر اس ملبے میں دل کے کتنے ٹکڑے ہیں کاش وہ ان سے انجان ہی گزر جائیں۔

لو وہ چھوٹی سی لڑکی آج بدل گئی کیوں کہ ڈیوڑھی پر روشن چوکی بیٹھی ہے اور شہنائیاں پنچم سروں میں بج رہی ہیں۔ (زینت ساجدہ)



(۴) جمیلانی بانو

گھر کی ڈیوڑھی پر روشن چوکی بیٹھی تھی اور میں شہنائیوں کے ساتھ بہت دور چلی آئی۔ نئے گھر کی دہلیز پر میں نے پہلا قدم رکھا تو سارا گھر جگمگا اٹھا۔ میں نے اپنے سامنے دو گھبرائی ہوئی آنکھیں دیکھیں، جو سوچ رہی تھیں میں اگلا قدم کہاں رکھوں گی۔ بابا کی سسکیاں میرے ساتھ ساتھ چلی آئی تھیں۔ جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ نبیرہ کے بعد آج تم بھی اس گھر سے وداع ہو گئیں ہمیشہ کیلئے اس گھر سے چلی گئیں۔ اب میرا دکھ بانٹنے والا کون ہے۔ جب ساون کی اندھیاری چھا جائیگی، تو میں سسرال سے تمہیں بلانے کسے بھیجوں گا، وہ بہادر نڈر نبیرہ کہاں ہے جس کے رعب سے تمہارے شوہر کی چیخیں دبی پڑ جائیں گی۔

یوں لیے سہارا اپنی تیز ہوا میں کانپنے والے پتے کی طرح میں چپ چاپ بیٹھی تھی، وہ بابا مجھ سے کیا کیا کہنا چاہتے تھے۔ کیا کیا سننا چاہتے تھے۔ لیکن میرے دل میں تو اس وقت بھی تیرے سوا کچھ نہ تھا۔

میں ان سے کہہ گئی۔

میرا نبیرہ کیسا ہوتا تو آپ دیکھتے کہ برات کس شان سے رخصت ہوتی، میرے جہیز میں کتنا سونا چاندی آتا، آپ کی کیسی کیسی گت بنتی ــ اللہ قسم وہ آپ کو پھولوں کی چھڑیوں سے خوب پیٹتا۔ آپکے جوتے چھپا دیتا۔ آپ اتنی آسانی سے ہمارے گھر میں نہ چلے آتے

"اونہہ چھوڑو اس ذکر کو" انھوں نے اکتا کر کہا۔
ذرا کھڑکی سے باہر تو دیکھو ۔ آج چاند ہمارے من پر کتنا خوش ہوری
نہیں ۔ میں کانپ اٹھی ۔ اب ہم لوگ چاند نہیں دیکھتے۔ چاند دیکھ کر مجھے اپنا چلبلا جیسا بھائی یاد آجاتا ہے۔ امی انہیں چندہ ہی تو کہتی تھیں۔

میری نظروں میں گرمیوں کی ایک سلگتی ہوئی وحشتناک رات آبسی، جب ہم سب بہن بھائی ایک پلنگ پر لدے مارکٹائی میں مصروف تھے۔ دوسرے پلنگ پر امی چپ چاپ لیٹی پنکھا جھل رہی تھیں، جیسے ہمارے لڑائی جھگڑوں کی انھیں کوئی پروا نہ ہو۔ وہ اکثر مسکرا کے کہتیں ۔ بہن بھائی کی لڑائی جیسے دودھ کی بالائی، اس دن آسمان کتنا گہرا تھا بے حد سیاہ اور خوفناک، اگر آسمان پر چاند نہ ہو تو ۔ امی اگر آسمان کا چاند ٹوٹ کر گر جائے تو ۔؟ ہم نے امی سے پوچھا تھا اور امی چونک پڑیں۔
ہائیں! چندا، بری باتیں نہیں کہتے۔ چاند ٹوٹ گیا تو پھر دنیا کیسے باقی رہے گی۔ ہر چیز ختم ہو جائے گی۔

پھر میں نے گھبرا کے ان سے کہا ۔ چاند کہاں ہے۔ وہ تو ٹوٹ کر گر پڑا ۔ اب تو آسمان پر گھور اندھیرا ہے بابا کے دل کی طرح۔

آخر جھنجلا کر انھوں نے کھڑکی بند کردی اور سر تھام کر بیٹھ گئے۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ بھی میری طرح اپنے درد کی دوا ڈھونڈ رہے ہیں۔ ان سے بھی کوئی وعدہ کرکے پھر گیا ہے لیکن یہ مرد بھی کتنا احمق سمجھتے ہیں اپنے دل کے ٹکڑے کسی لوہار کی دوکان پر جڑوا آنے کی بجائے ایک عورت کے پاس لے کر آتے ہیں۔ کیونکہ ایک عورت کا لگایا ہوا گھاؤ دوسری ہی عورت بھر سکتی ہے۔

ان کی باتیں سن کر میں رو پڑی۔ یا اللہ مجھے ہر طرف لٹے ہوئے گھروندے ہی ملتے ہیں جیسے میرا کام صرف لٹے دلوں کو جوڑنا ہے۔ لیکن میرا وہ نشتر تو کھو گیا۔ تم مجھ سے کیا بچھڑے کہ میں ہر چیز بھول بیٹھی۔ میں ابا کی مسکراہٹ واپس نہ لا سکی، امی کی کھوئی ہوئی لوریاں مجھے نہ ملیں۔ اپنے جیون ساتھی کے ہاتھ تھام کر نہ کہہ سکی کہ میرے جنم مرن کے ساتھی آپ کے

تمہارے دکھ میں مدد کر سکتی ہوں — کیسے کہتی — میرے دل کی کوٹھری میں تو صرف تمہاری یادیں بھری پڑی تھیں۔ وہاں تو اتنی جگہ بھی نہ تھی کہ میں کبھی اپنے آپ کو ڈھونڈ نکالتی میں تو تمہاری کٹی ہوئی پتنگوں میں الجھ کر رہ گئی تھی میرے بھیا۔ مٹی کے ٹوٹے گھروندے میرے چاروں طرف بکھرے پڑے رہتے۔ اور میں سوچ رہی تھی کہ تمہارے بغیر اب یہ کیسے بنیں گے۔

بعض وقت بیٹھے بیٹھے مجھے یوں لگتا ہے۔ جیسے تم بالکل اسی طرح پتنگ اور ماجھا لئے بھاگتے ہوئے آ رہے ہو۔ ابھی بابا کے پلنگ پر سے چھلانگ لگا کر مجھ پر آ گرو گے، ہٹو تا بیچ میں سے راستہ کیوں روکتی ہو، — ایک بار — کاش ایک بار پھر ایسا ہو اور میں اس لئے کہ کبھی بھی تمہیں باہر جانے کیلئے بالکل راستہ نہ دوں سامنے بہت سے ٹوٹے گھروندے دکھا دوں۔ بولو میرے چندا۔ کیا تم ان سب کو روندتے ہوئے جا سکتے ہو۔ کاش ایک بار تو پھر ایسا ہو کہ بابا تمہیں سینے سے لگا کر جی بھر کے رولیں۔ اتنا روئیں کہ ان کے آنسو ختم ہو جائیں — امی تمہیں جی بھر کے دیکھ لیں۔ ان کا سجدے میں جھکا ہوا سر اوپر اٹھ جائے۔ اور بابا مان لیں کہ امی کا خدا ان کی سن رہا تھا۔ یہ وقت کیسا بے رحم ہوتا ہے قیصر — ہوا کے جھونکے کی طرح سن سے گزر گیا، مگر پھر نہیں گزرتا۔ تم کتنی تیزی سے اندر دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ اور اتنی ہی تیزی سے چلے گئے۔ پھر وہ وقت جسے پکڑنے کے لئے ہم سب روتے چلاتے رہے، پل بھر میں گزر گیا — مگر کہاں گزرا۔ ؟ ہم سب تو اسی لمحے کے حصار میں مقید ہیں، جیسے اس سے آگے ماہ و سال کا سلسلہ ختم ہو چکا ہو۔ پھر بابا کی مسکراہٹ ہمیشہ کیلئے کھو گئی۔ امی کے قہقہے اور میرا بچپن۔ ہر چیز اس لمحے سے چمٹی ہوئی ہے۔ جب تم نے ہم سے منہ موڑا۔ اس کے بعد کیا ہوا اب میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ مجھے جانے کیا ہوا جا رہا ہے۔ جب کبھی آنکھیں کھول کر دیکھتی تو سامنے بیٹھے وہ نظر آتے۔ کھوئے کھوئے سے میری طرح کسی گزشتہ ہوئے لمحے کے حصار میں جکڑے ہوئے۔ اور میں سوچتی اندھیرا کیسا بھیانک ہے — اب کیا ہو گا — ؟

پھر ایک رات ہمارے گھر میں اچانک اجالا پھیل گیا۔ اس رات میں کتنی بار مر مر کے زندہ ہوئی۔ مجھے یقین تھا کہ اب میں نہیں بچوں گی۔ تمہارے پاس آ جاؤں گی اپنے قیصر کو ملوں گی

پاس وقت کتنے اداس تھے جیسے وہ اپنی زندگی کی آخری کرن کو ڈوبتے دیکھ رہے ہیں
پی ساکت ہو گئیں ۔ جیسے وہ بے جان پتھر کی مورتی ہوں ۔ اور وہ ۔ وہ سوچ رہے
تھے کہ اب کس سہارے کو پکڑ کر اندھیرے کا یہ دریا پار ہو گا ۔
لیکن اچانک کسی کی ننھی ننھی چیخوں نے سارا گھر اچھال دیا تھا ۔ ہائے اللہ میرا دل خوشی
کے مارے ڈوبنے لگا ۔ کسی ناممکن خوشی کا پورا ہونا بھی کیسا اذیت ناک ہوتا ہے ۔
پاپا اسے سینے سے لگائے یوں رو رہے ہیں جیسے آج ان کے سینے کی آگ بجھ گئی ہو
جیسے آج کے سارے آنسو ختم ہو جائیں گے ۔ صرف ہنسی کا خزانہ باقی رہ جائے گا ۔ امی کے
چہرے پر آج کتنے دنوں بعد مسکراہٹ آئی ہے ۔ وہ تمہارے کھلونے جھاڑ پونچھ کر چھوٹے
میں سجا رہی ہیں ۔ ان کے لبوں پر ایک پرانی لوری لوٹ آئی ہے ۔ آج ان کی آنکھوں میں کیسی
چمک ہے ۔ کتنا فخر ہے ۔
ندوا در تنو میرے بستر کے پاس کھڑے خوشی سے چلا رہے ہیں ۔ پاپا یہ تو
بالکل ہمارا بھیا ہے ۔ امی ہمارے بھیا ہمیں مل گئے ۔
نیرو ۔ میں تمہارے پاس آرہی تھی ۔ مگر تم مجھے کیسے مل گئے ۔ ؟ تمہارے ننھے
روپ کو سینے سے لگائے میں سوچ رہی ہوں کہ اب مٹی کے سارے ٹوٹے گھروندے ہم بنا
لیں گے ۔۔۔

(جیلانی بانو)

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد)

بقیہ پردہ اٹھنے کے بعد

پھر وہ پڑا تھا ۔ جس نے اسے اتنی حسین و دلکش بنا رکھا تھا ۔ اس نے نفرت سے زمین
پر تھوک دیا ۔
گھر آ کر اس نے جلدی جلدی ماں کو خط لکھا ۔۔۔ "وہ شادی کرنے کو تیار ہے
کوئی لڑکی پسند کر کے نسبت طے کر لیں ۔"

ستیہ پال آنند

نہالا گارڈ

پینتالیس برس کا ہو چلا تھا۔ جس نے زندگی بھر کبھی سگریٹ اور شراب کو چھوا تک نہ تھا جسے عورت کے نام سے ہی چڑ تھی۔ جسے دفتر کے آدمیوں کے بار بار چائے پینے سے بھی کوفت ہوتی تھی جس نے عمر بھر کنوارہ رہ کر برہم چریہ پالن کرنے کا حلف اٹھایا تھا جسے ریلوے کی نوکری کے دوران ہی اپنی گاڑی کی بریک وین سے محبت تھی اور اب ورما صاحب کی ملازمت میں صرف اپنی کرسی پر بیٹھ کر اونگھنے سے والہانہ عشق تھا —— آج ان کی نئی پرسنل اسسٹنٹ کی تقرری کی خبر سن کر کچھ اداس سا تھا ——

ورما صاحب نے کہا تھا کہ ان کی نئی پرسنل اسسٹنٹ جب آئے گی۔ تو صرف دفتر کے کام کو کیا ساری فیکٹری کے کام کو یوں ٹھیک کر دے گی . . . یوں . . . اور اس کے بعد ورما صاحب کی چٹکی کی آواز تھی۔ جس کا مطلب سبھی سمجھتے تھے —— اور اسی لئے فیکٹری کے دفتر کے سبھی لوگ آج گوش بر آواز اور چشم براہ تھے۔ رام لعل ٹائپ کی مشین پر کام کرتے کرتے رک جاتا۔ دروازے کی طرف دیکھتا۔ پھر پیشانی سے پسینہ جھٹکتا ہوا کام میں مصروف ہو جاتا۔ جیکر ورتی . واؤچروں کو رجسٹر پر چڑھاتا ہوا آنکھیں

سے کھڑکی کے باہر دیکھتا جہاں سے بڑا پھاٹک اور سڑک کا کچھ حصہ صاف نظر آتے تھے اور کسی کو آتا نہ پاکر ایک لمبا سانس لیتا۔ پھر سرخ۔ نیلی اور سبز سیاہیوں کے مختلف قلموں سے مختلف میزان کرنے لگ جاتا۔ لالہ لال چند ہیڈ کلرک ڈاک چھانٹتے ہوئے یکایک رک جاتے اور پھر عینک اتار کر چند لمحوں کے لئے دروازے کی طرف دیکھنے۔ جب انہیں یقین ہو جاتا کہ ابھی زنانہ سینڈلوں کی کھٹ کھٹ ان کے اپنے واہمے کی پیداوار ہے تو وہ پھر دس بار کی چھانٹ کر رکھی ہوئی چٹھیوں کو الٹنے پلٹنے لگتے۔ گیتا، شرما اور نہال چند اپنی اپنی جگہ پر اس کی آمد کے منتظر تھے

ورما صاحب نے کہا تھا، مہندرا سریندرا اینڈ مہندرا کے مینجنگ ڈائرکٹر نے مس مہرہ کی جن لفظوں میں تعریف کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب مجھے زیادہ سردرد نہیں ہوگا۔ میرا تو سارا کام ہی وہ سنبھال لے گی . . . اور لالہ لال چند جی جو کام اب آپ کا اسٹاف دس دنوں میں نہیں کر سکتا۔ وہ اسے دو دنوں میں ختم کروائے گی۔ اس کا مجھے یقین ہے!"

یہ بات سن کر لال چند تو چپ رہے تھے لیکن نہال چند نے اپنی کرسی پر سے بیٹھے بیٹھے ہی کہہ دیا تھا۔ کام تو کبھی ختم نہیں ہوتا سیٹھ جی چاہے مس مہرہ آئے یا نہ!"

ورما صاحب کی چشک اگر ہر بات کا جواب نہیں تھی تو اس بات کا یقیناً نہیں تھی لیکن چشک بھا کر انہوں نے کہا تھا "نہال لے! تو چپ رہ۔ چپ رہنے سے تیری گاڑی پٹری سے نہیں اتر جائے گی ـــ"!

اس لئے آج نہال چند دفتر سے باہر کرسی پر بیٹھا مس مہرہ کا انتظار کر رہا تھا صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ جس عورت کے ذکر سے ہی دفتر کا اسٹاف اتنا مرعوب ہو گیا ہے، وہ کیسی ہو گی۔ عمر کا اسے کھلا اندازہ تھا۔ پرسنل اسسٹنٹ قسم کی لڑکیاں یقیناً ستائیس اٹھائیس سے زیادہ عمر کی نہیں ہوتیں۔ شکل کے بارے میں بھی اسے یقین تھا۔ باریک سیاہ تاروں کی طرح بندھے ہوئے بال چٹا سپید گندمی مائل رنگ . . . ساڑی یا اسکرٹ۔ اچھا ناک نقشہ انگریزی

پڑھنے اور بولنے میں مشاق ـــــ ۔

لیکن جب وہ آئی تو جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ رنگ توے کی طرح سیاہ تھا۔ چہرے پر کسی قسم کا میک اپ نہیں تھا۔ جسم میں بالکل جاذبیت نہیں تھی۔ سفید سادہ ساڑی میں ملبوس تھی۔ اسے دیکھ کر کسی ہسپتال کے سادہ صاف ستھرے وارڈ کا تو خیال آسکتا تھا لیکن ایک عورت کا نہیں ـــــ ۔

ورما صاحب نے حسب عادت نیم مزاحیہ انداز میں سب کا تعارف کروایا لیکن اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہ آئی۔ نہال چند کی باری آنے پر جب انہوں نے کہا "مس مہرہ"۔ ۔ اور اس دفتر کا وی آئی پی ہے نہال چند عرف نہالا گارڈ! آپ کے سامنے کھڑا ہے۔ اس نے دس برس تک گاڑیوں کو سبز جھنڈی دکھا کر روکنے اور سرخ جھنڈی دکھا کر چلانے کا کام کیا ہے۔ ریلوے بورڈ نے اس کی خدمات سے ممنون ہو کر جب اسے تین ماہ کی تنخواہ پیشگی دے کر ریلوے اسٹیشن کے باہر لا کھڑا کیا۔ تو یہ میرے پاس آگیا۔ اب پچھلے پندرہ برسوں سے میرے پاس ہی ہے۔ ۔ اس سے کام لینے کا ڈھنگ آپ کو سیکھنا پڑے گا!"

اس نے ایک نظر نہال چند کی طرف دیکھا۔ اچٹتی ہوئی ایک ایسی نظر سے جیسے کوئی شخص گرتی ہوئی موم بتی کی روشنی میں اندھیری دیوار کے نقوش کی ایک جھلک دیکھے پھر نہال چند کو یکایک یہ احساس ہوا کہ چاہے نفرت ہو یا محبت۔ دونوں میں سے کوئی بھی جذبہ پہلی ہی نظر میں پیدا ہو سکتا ہے اور جڑ پکڑ سکتا ہے۔ مس مہرہ کے تئیں اس کے دل میں نفرت کا ایک ایسا ولولہ اٹھا کہ اسے فوری طور پر باہر جا کر تھوکتے ہی بن پڑا۔

پندرہ برس کی عمر میں پہلا اپدیش یہ ملا تھا، "نہالے بیٹے! عورت ایک ہے فنکار اس سے جتنا بچو گے اتنا ہی پھلو پھولو گے!"

یہ نہ جانتے ہوئے کہ پتاجی کا یہ اپدیش صرف ان کے اپنے ذاتی تجربے پر

بی ہے اس نے اس پر عمل کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ویایام شروع کیا بدن پر ہر روز آدھ آدھ
سیر سرسوں کے تیل کے مالش کی بھبھن گائے۔ اسکول میں ڈنڈ نکالنے کا ریکارڈ توڑ کر ہیڈ
ماسٹر صاحب سے سرٹیفکٹ حاصل کیا۔ پھر مہابیر دل کی شاکھاؤں پر جاکر پرانایام پر
عبور حاصل کیا۔ لاٹھی اور گتکا چلانے کا فن سیکھا۔ لنگوٹ کس کر اکھاڑوں میں اترا۔ مہابیر
کی مورتی کے سامنے ماتھا جھکا کر اور ہنومان چالیسہ کا ورد کر کے حساب کے سوال حل کرنے
بیٹھا اور پانچ برس کی کڑی مشقت کے بعد جب میٹرک کے سرٹیفکیٹ کے ساتھ ہیڈ
ماسٹر، سیوا سمتی، مہابیر دل وغیرہ کے ان گنت مان پتر لئے وہ گھر میں داخل ہوا تو جیسے
اس کے پتا جی نے صرف یہی دن دیکھنا تھا ــــــ وہ چل بسے۔ ماں نے بیٹے کا سہرا دیکھنے
کی بہت کوشش کی۔ مگر وہ اسے ایک ہی جواب دیتا، "ماں جی! میرا بیاہ تو میرے لکش
سے ہو چکا ہے۔" اس کا لکش کیا تھا، یہ وہ آج تک کسی کو نہیں سمجھا سکا تھا۔ ریلوے کی
نوکری ملنے کے بعد ایک دن اس کی ماں بھی چل بسی اور جب ڈنڈ اور بیٹھکوں کا ریکارڈ
توڑنے کے سرٹیفکٹ ہنومان جی کی مورتی کے ساتھ اس کے کمرے کی دیواروں پر آویزاں ہو
گئے اور گلے سے لگے اس کے ساتھ ہر ایک ڈبے میں بھی جانے لگے تو جیسے لوگوں کو اس
کے بہالاگارڈ ہونے کا احساس ہو گیا ــ وہ عورت مسافروں سے نظر جھکا کر بات کرنے
کا عادی تھا۔ اس سے اسے "جتی" کا خطاب دیا گیا۔ وہ ہنومان کا بھگت تھا اس رعایت
سے اسے "پون پتر" کہا جانے لگا۔ وہ گوشت سگریٹ اور شراب سے نفرت کرتا تھا اس
لحاظ سے اسے وشنو کہہ کر پکارا جانے لگا۔ ورزش۔ ڈنڈ۔ بیٹھکوں اور جسمانی کرتبوں کے
سرٹیفکٹوں کی بنا پر اس کا نام "گھٹوت کچ" رکھا گیا ــــ اور جب اس پر بھی بس نہ ہوئی
تو کسی منچلے نے "بہالا گارڈ" کہہ کر جیسے ان سب ناموں کا نچوڑ پیش کر دیا۔ پانچ سات
برسوں میں ہی جب پندرہ ایسے مسافروں سے سر پھٹول ہو چکی جو ریل کے ڈبوں میں سگریٹ
پینے سے باز نہیں آئے تھے اور دو تین افسر اس لئے پٹ گئے کہ انہوں نے مسافر عورتوں
سے بد کلامی کی تھی۔ اور ریلوے پولیس کے ایک حولدار کا بازو اس لئے ٹوٹ گیا کہ اس
نے ایک بوڑھے مسافر کو گرا کر پیٹا تھا تو ریلوے افسران نے اسے ہری جھنڈی دکھا کر اسٹیشن

کی حدود کے باہر کر دیا۔ ۔ ریلوے کی نوکری کے کئی قصے مشہور تھے ۔ ان میں دو تین اس کی انگریزی قابلیت کے بارے میں تھے۔ سہالہ اور چک لالہ کے درمیان گاڑی کے پٹڑی سے اتر جانے پر جو پیغام اس نے راولپنڈی کے اسٹیشن ماسٹر کو بھیجا تھا۔ وہ ریلوے کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل تھا۔

" لیمپ واز بجھنگنگ بٹوین سہالہ اینڈ چک لالہ .... واٹ کڈ ڈو گارڈ نہالا!"
وہ خود اس پیغام کی تصنیف سے انکاری تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی اور ہی زرخیز دماغ کی پیداوار تھا۔

محکمۂ ریلوے سے چھٹی کے بعد نہالا گارڈ نہ معلوم ہو لکے کون سے ریلے میں میں اڑتا ہوا آیا اور ورما صاحب کی جھولی میں پڑ گیا۔ ورما صاحب نے اس کی قدر کی اسے اچھی تنخواہ دی اسے اعتباری ملازم گردان کر اس سے وہ سب کام لیا جو ایک ذاتی مددگار سے لیا جا سکتا تھا۔ اور اس نے بھی انھیں شکایت کا موقع نہیں دیا ۔لیکن اب یہ نئی پرسنل اسسٹنٹ!

" چھی چھی ! " جیسے اسے پتا جی کا اپدیش یاد آگیا۔ عورت جو جھگڑے فساد کی جڑ ہے

اس نے پھر ایک بار تھوک دیا۔

داقعی ایک ہفتہ میں دفتر کا نقشہ ایسا بدلا کہ پہچاننا مشکل ہو گیا۔ جہاں پہلے ایک دن میں آٹھ آٹھ بار چائے آتی تھی وہاں اب دو پہر گیارہ بجے اور شام کو ساڑھے تین بجے صرف دس منٹ کی چھٹی ہونے لگی۔ جہاں فائلیں فرش پر کھلی پڑی رہتی تھیں وہاں اب چار نئی الماریاں لاکر رکھدی گئی تھیں۔ اور حکم تھا کہ رشتے کے بغیر کوئی فائل میز پر پڑی نظر نہ آئے۔ جہاں پہلے رام لعل، چکرورتی اور رلا لال چند سگنے بنیے ننگے پاؤں اور میلے کپڑوں میں دوڑتے ہوئے گھر کا کوئی پیغام پہنچانے یا فیس کے روپے مانگنے آجاتے تھے وہاں سب حکم دے دیا گیا کہ دفتر میں کوئی نہ آنے پائے۔ ورما صاحب کے ملاقاتیوں کے اوقات مقرر کر دیے گئے۔ دفتر کے کارکنوں کی ورما صاحب تک رسائی کا راستہ مسدود

کر دیا گیا۔ وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لئے دفتر آتے پھر چلے جاتے۔ فیکٹری کا ڈریس وہاں بھی
باقاعدگی سے وردی کا انگریزوں کی پوسٹ دیے جانے کا حکم دیا گیا کہ فیکٹری کے مختلف
سیکشنوں میں سے حاضری کے رجسٹر پونے ساڑھے دس بجے مس مہرو کی میز پر پہنچ جائیں۔
تاکہ دیر سے آنے والے اپنے تعدد کر پائیں۔

مس مہرو کا منفی سا وجود ہر جگہ اور ہر وقت موجود تھا۔ اور گھنٹی سسٹم بدل گیا کہ
وہ ہر وقت سب سے بات چیت کرنے کیلئے مستعد رہتی اس کی حکومت میں کیا مجال کوئی ایک
پتہ بھی اس کی مرضی کے بغیر ہل جائے۔

رام لال مس مہرو کی تقرری کے چھ مہینے بعد ایک بلنگ اسٹیٹمنٹ میں غلط ہندسے ٹائپ کرنے پر
بڑے صاحب سے بڑی جھاڑ ملی اور وہ جب روہانسا ہو کر ان کے کمرے سے باہر نکلا اور کام فلائنگ
کلرکی کی کرسی پر بیٹھ گیا تو سب نے اس کی طرف ہمدردانہ نظروں سے دیکھا۔ حفیظ اور عفر مٹلانے
کی خاطر اس نے مس مہرو کے کیبن کی طرف دیکھ کر ردی کی ٹوکری میں تھوکا۔ اور قدرے اونچی آواز میں
کہا۔ "ڈومنی نیچ"

اس کی گالی کو کسی نے سنا یا نہیں سنا اس کا احساس کسی کو نہیں تھا لیکن آدھ گھنٹے کے
بعد اس کی برطرفی کا حکم، ایک ماہ کی تنخواہ کے ساتھ اس کی میز پر آ گیا تو جیسے سبھی کے ہوش اڑ گئے
پہلی بار سب لوگوں کو اپنی ملازمت کے غیر مستقل ہونے کا احساس ہوا اور جیسے سارے ماحول پر
خشکی سی، اداسی اور خاموشی چھا گئی۔ رام لال زرد چہرے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے
بڑے صاحب کے پاس گیا۔ اور پھر بھاری بھاری قدموں سے اپنے لنچ کا ڈبہ اٹھائے ہوئے
باہر چلا گیا۔

لال چند بولے: "اب تو اس سے بچنا مشکل ہے۔"

چکرورتی نے ٹھنڈی سانس لے کر زیر لب کہا۔ اس سے عشق بھی تو نہیں ہو سکتا
رام لال کی جگہ جو ٹائپسٹ لڑکی آئی وہ مس مہرو کا پاکٹ ایڈیشن تھی۔ قبول صورت
ہونے کے باوجود وہ ناک بھوں چڑھائے رکھتی۔ چکرورتی نے اس سے دوستی کی کوشش کی تو اس
نے دو دن میں اسے چپ کر دیا۔ لال چند نے اسے بیٹی کہہ کر بلایا تو اس نے خشک ذرا اونچی

کر کے انھیں یوں دیکھا جیسے ان کی عمر کا اندازہ لگا رہی ہو۔ اور پھر ان سب کو شک ہوا کہ وہ مس مہرہ کی جاسوس ہونے کا فرض ادا کر رہی ہے۔ اور دفتر کی ہر چھوٹی بڑی بات شام ہوتے ہوتے مس مہرہ کے کانوں تک پہنچ جاتی ہے۔

چکرورتی عشقیہ ناول پڑھتے پڑھتے ذہنی طور پر ہر عورت کو محبوبہ کے روپ میں دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ سنیچر کی شام کو اس نے ڈرتے ڈرتے سینما دیکھنے کی دعوت دی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ کسی اچھے ہوٹل پر ڈنر کا سامان کرنے کو بھی تیار ہے۔ خلاف توقع نئی ٹائپسٹ نے پہلے تو تیز نظروں سے دیکھا پھر پیر پٹختی ہوئی اندر مس مہرہ کے پاس چلی گئی۔ چکرورتی کی موقوفی کا پروانہ موصول ہو گیا پر کسی کو حیرت نہ ہوئی اس دوران میں لال چند بھی اپنی ملازمت کیلئے کہیں اور ہاتھ پاؤں مارنے کی فکر میں تھے۔

نہال چند گا رہا ہو یا نہ رہا ہو، لیکن اس میں ڈاک گاڑیوں کی سی تیزی ضرور تھی شاید دا صاحب کی فہمائش کی وجہ سے ہی مس مہرہ اس سے کم تحکم سے پیش آتی اور وہ بھی اس کا ہر کام خوشی سے کر دیتا۔ یہاں تک کہ مس جی کہہ کر بلاتا اس لئے ایک دن تو دفتر کے باقی ماندہ تین پرانے آدمیوں کو شک ہوا کہ وہ مس مہرہ کے ساتھ مل گیا ہے۔ یہ شک یقین میں تب بدلا جب انھوں نے ایک شام مس مہرہ اور نہال چند کو اکٹھے دفتر سے باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ دونوں کسی گہری گتھی کو سلجھانے کی فکر میں تھے۔ گیٹ پر جا کر وہ الگ ہوئے تو نہال چند کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ اس نے کہا، "ہاں مس جی! آپ نیدرہ لال بلڈنگ میں رہتی ہیں نا؟ میں وقت پر پہنچ جاؤں گا!"

"ہاں...!" جواب ملا۔ "بالو نہال چند جی! ذرا وقت سے پہلے ہی آ جائیے گا باتیں کریں گے۔" اور وہ پرس جھلاتی چلی گئی۔

شام کے دھندلکے میں مس مہرہ کی سیڑھیوں کا دروازہ کھٹکایا گیا تو وہ لپکتی چلی آئی۔ "آئیے، آئیے نہال چند جی میں آپ کی راہ دیکھ رہی تھی۔" اور وہ سامنے سے راستہ دینے کیلئے خود دروازے میں سے ہٹ گئی۔ نہال چند آج سوٹ پہنے ہوئے تھا اس لئے

بال بھی سنوار رکھے تھے۔ اور اس کے بوٹ بھی پالش سے چمک رہے تھے۔ "آئیے آئیے"۔ وہ کہتی گئی اور اس کے آگے آگے اندر بڑھتی گئی۔

"کھانا میں نے خود تیار کیا ہے اس فن میں تو میں ماہر ہوں ...... سمجھئے میں ہمیشہ کسی نوکر کے بغیر رہتی ہوں۔" اور پھر اس نے اپنی تیز نظروں سے اپنے کمرے میں بچھے ہوئے قالین کی طرف دیکھا۔ یا شاید ان سے بوٹ صاف کئے بغیر ہی نہال چند سیدھا چلتا چلا گیا تھا۔

"دفتر میں وقت ہی کہاں ملتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو جان سکیں۔"

"ہاں مس جی!" نہال چند صوفے پر دھم سے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "دفتر کا ہے کو ہے سب ایک جیل خانہ ہے!"

مس مہرو نے اسے مزاحیہ انداز میں قبول کرتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں .... جی ہاں!"

"اور پھر دیکھئے نا ...." وہ دم بھر کو رکا اور پھر اس طرح منہ بنایا، جیسے ہچکی آتے آتے رک گئی ہو۔ "جیل میں بھی ایسا برا سلوک نہیں ہوتا جتنا یہاں ہوتا ہے۔ ورما صاحب کو تو اپنی بری عادتوں سے ہی وقت نہیں ملتا۔"

وہ چونکی۔ "بری عادتیں؟ یقیناً نہال چند جی ... آپ تو مذاق کرتے ہیں۔" بس کے اس نے ہچکی لی۔ "مذاق ... ہاہا ...." وہ زور سے شرابیوں کی طرح ہنسا۔ "آپ اتنا بھی نہیں جانتیں۔ ورما صاحب کا جو رخ آپ جانتی ہیں وہ تو دکھانے کے دانتوں والا ہے۔ وہ ناچ گانا، شراب، کلب میں جوا، اور راتیں گئے تک ...!" اس نے ایک ہچکی لی۔ "ذرا ماچس تو منگوائیے۔" اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔

"نہال چند جی!" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "آپ سگریٹ پیتے ہیں!"

"ہاں کیوں؟ کیا ہوا؟" اس نے تپائی کھینچ کر پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا۔ "ماچس لاتے اور مہربانی کرکے تھوڑا سا سادہ پانی مع گلاس کے ..... سوڈا ہوتا تو کیا بات تھی لیکن آج آپ سے کہنا بھول گیا تھا۔" دوسری جیب سے اس نے شراب کا ادھا نکال کر تپائی پر رکھ دیا! ورما صاحب کی کیا بات ہے بس یوں سمجھئے کہ بھیڑئے کے لباس میں بھیڑیئے!

مس مہرو کو بات سمجھنے میں پورے پانچ منٹ لگے۔ پھر اس نے غصے سے کانپتی ہوئی

آواز میں کہا : نہال چند جی آپ جائیے فوراً چلے جائیے ! !

ارے چھوڑو میری جان ! نہال چند شرابیوں کی طرح بولا۔ ادھر آؤ میرے ساتھ صوفے پر بیٹھو کچھ اچھی طرح باتیں کریں۔ اسی لمحے ہچکی لی اور تب مس مہرا کو شراب کی بو کا بھبکا آیا
: نہال چند گیٹ آؤٹ ! اور میں یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی وہ چلائی ۔
: اسے بے عزتی کون کہتا ہے۔ میری بلبل ! وہ بالکل بازاری انداز میں بولا : ایک ہی تو زندگی ہے اسے لڑ جھگڑ کر گزار دینے سے تو بہتر ہے ۔۔۔ کہ ۔ ۔ ۔"

گیٹ آؤٹ ! وہ چیختی ۔ نہ ۔ نیچے چلے جاؤ ! وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی ۔
اس نے آگے بڑھ کر مس مہرا کا ہاتھ پکڑ لیا ۔ ۔ ۔" لے جان من بیٹھو نہیں آؤ میرے پاس بیٹھو ۔ ۔ ۔ بس یوں ۔ ۔ ۔ ہاں ۔ ۔ اور اس نے غصے سے آگ بگولا ہوئی مس مہرا کے نرم جسم کو باہنوں میں بھرنا چاہا۔ لیکن اسی دم دروازہ کھلا اور مس مہرا کی نئی دوست ایک سٹینو لڑکی داخل ہوئی

" ایڈیٹ راسکل ! " وہ چیخی : میں ورما صاحب سے کہہ کر کل ہی ڈسمس کراؤں گی : وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگی اور اپنے دوست تک پہنچ گئی ۔: میں ورما صاحب کو ابھی ٹیلیفون کرتی ہوں ۔ ۔
اتنی دیر میں نہال چند سیڑھیوں تک پہنچ چکا تھا۔ نیچے اترتے ہوئے اس نے کہا : ورما صاحب بچے ہیں ۔ وہ مجھے کیا ڈسمس کریں گے ۔" اور وہ دھڑا دھڑ سیڑھیاں اتر گیا ۔

لال چند ہیڈ کلرک اور دفتر کے کافی ملازم پرانے آدمی حاضر تھے۔ جب دوسری صبح نسوانی اور دھمکیوں کا یہ لاسے مہر پور ایک منظر کے بعد جب ذرا سکون ہو چکا تو ورما صاحب نے مس مہرہ کو مخاطب کر کے کہا

" مس مہرہ میں نے آپ کو ہندوستان اینڈ ہندوستان کے ڈائریکٹر کے کہنے پر یہ جگہ دی تھی اس لئے نہیں کہ آپ میرے سب سے پرانے اور اعتباری ملازم پر بہتان تراشتی رہیں - نہال گارڈ ہیں اور چاہے ہزاروں نقص ہوں لیکن محسن کشی اسگریٹ شراب در عورت ۔ ۔ ۔" انھوں نے مس مہرہ کی طرف ایک مرد کی نظروں سے دیکھا ۔ ۔

میں سورج کے مغرب سے طلوع ہونے پر ایمان لا سکتا ہوں۔ لیکن اس بات پر نہیں... اور بائی دی وے لگتا ہے کہ بے چارے مکند جی اور رام لعل بھی دونوں آپ کی زیادتی کا شکار ہوئے۔ انھوں نے دھیرے سے چٹکی بجائی... آپ دونوں جا سکتی ہیں۔ نوٹس کے بھیجنے کی تنخواہ کے چیک لال چند جی سے لیجئے"۔ انھیں پھر کچھ یاد آیا۔

"نہالے، تو اکثر کہا کرتا تھا اپنے پتا جی کے اپدیش کے بارے میں؟

نہال چند نے ایک آنکھ میچ کر لال چند ہیڈ کلرک کو دیکھا۔ عورت ذات کے بارے میں تھا وہ صاحب!

"آپ پوچھ کر کیا کریں گے۔؟"

خواب ہمارا ماضی

اکرام جاوید

بدنام بازار کے چوراہے پر پہنچ کر اس نے رکشا رکوا دی اور بڑی بے دلی سے نیچے اتر گیا۔ پورے
چاند کی خنک اور خوشگوار رات جوان تھی۔ وہ جوان تھا۔ اجلی چمکدار چاندنی میں اس کا ادھ جلا ہوا چہرہ
بدن خوابوں کی پرچھائیں کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ بہار ... میں اس کے خوبرو تمتمائے چہرے کے نقوش
انی دلاویز اور جاذب نظر بن گئے تھے۔ جس طرح وقت، موسم اور ماحول سب کے سب
کسی خواب کی طرح حسین دکھائی دے رہے تھے۔ بدنام بازار کی ہر گلی روشن تھی ہر کوچہ
تھا۔ فضا میں گلاب، سیوتی اور موگرے کی خوشبو مہک رہی تھی۔ تاریکی نے روشنی کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ ہوائی
نے مجبوٹ کے تنگے مستانہ ڈال دیے تھے۔ بدنام بازار پھر مصر کا بازار بن گیا تھا۔۔ ۔ خون دل مشغول
ہالا انس نے ... ساری محنت بیکار گئی۔ بت سکل ہے اس دنیا کا سونا قیصر۔ یہ دنیا ۔۔ یہ دنیا

بدنام بازار کی جانی پہچانی سڑکوں پر چلتے ہوئے اس کا دل بوجھل تھا۔ اور ہر قدم نڈھال۔ زندگی کی
کھٹ پٹ اس نے ایک تجربہ کیا تھا۔ اور اس کے کرے کا وہ شیش محل ٹوٹ کر چور چور ہو کر رہ گیا تھا!

روشنی کا بھرپور ریلا سلطانہ کے دو منزلہ بنگلے پر چمک رہا تھا! دو منزلہ بنگلے کی دوسری منزل میں اس
سب کی روشنی بتا رہی تھی کہ سلطانہ کا کمرہ ملاقاتیوں، گاہکوں اور نذر والوں سے آباد ہے!
سلطانہ پھر بازار میں آگئی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ خریداروں کے ہجوم میں اس نے
خود کو لٹا رہی تھی۔ قیصر کا دل ڈوب سا گیا۔ اس نے جو کچھ سوچا تھا، خواب تھا اور اب اس کے
سامنے حقیقت تھی۔

سلطانہ کے دو منزلہ مکان کے چوبی زینے طے کر کے جب وہ اوپر پہنچا تو ٹھٹھک کر رہ گیا
کمرے میں ٹھنڈی سبز روشنی تھی اور چاندنی کے سفید فرش پر سازندے تھے۔
درمیان سلطانہ بیٹھی ہوئی تھی گہرے گلابی رنگ کی دراز قد، باوقار اور پرکشش جوان
لڑکی ۔ سیاہ ریشمی ساڑی اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اندھیاروں میں اُس کے حسن کا شعلہ تیز لو میں جل رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر باقی سب کچھ موجود تھا صرف معصومیت اور حیا کے رنگ اُڑ گئے تھے پھول دہی تھا۔ مگر خوشبو اڑ گئی تھی۔ کمرے میں سیٹھ بنسی لال بھی تھے۔ اور نواب عزت علی خاں بھی۔ اعلیٰ عہدیدار بھی تھے اور شریف اور باعزت شہری بھی۔ حاضرین میں اُس مشہور اخبار کا ایڈیٹر بھی تھا جس نے بدنام بازار کی تجارت کو موقوف کرانے کے لیے پر زور اداریے لکھے تھے۔ اور ہر قدم پر قیصر کا ساتھ دیا تھا۔ اس کے حوصلے بڑھائے تھے۔ اور قیصر اپنے مشن میں کامیاب بھی ہو چکا تھا۔ بدنام بازار کی تجارت بند ہو گئی تھی۔ بدنام بازار کی عورتوں نے محنت اور شرافت کی زندگی بسر کرنے کا عہد کر لیا تھا۔ بدنام بازار ایک بہت بڑے ویلفیئر سنٹر کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ صنعتی مراکز جگہ جگہ قائم ہو چکے تھے جہاں عورتیں باعزت روزگار کماتی تھیں۔!

سلطانہ اس مہم میں اس کا دست راست ثابت ہوئی تھی۔ وہ باتیں خواب کی باتیں تھیں۔ اور وہ خواب اب ٹوٹ چکا تھا۔ وہ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح سلطانہ کی محفل میں آیا تھا۔!

اس کی آمد سے محفل کا رنگ بگڑ گیا۔ بھاری بھرکم سیٹھ بنسی لال نے ایک طنزیہ ہنسی سے اُس کا سواگت کیا۔ اور کوہ پیکر نواب عزت علی خاں فلک شگاف قہقہہ لگایا اور نعرہ بھی "تم پھر آگئے یہاں؟"

اور سارا کمرہ زوردار قہقہوں سے گونج اُٹھا۔ عین اُسی وقت سلطانہ کے خوبصورت چہرے پر ایک عجیب سی چمک ابھر کر غائب ہو گئی۔ اور اس نے بڑی لگاوٹ بھری نظروں سے اخبار کے ایڈیٹر کی طرف دیکھا اور بولی۔ "اخلاق صاحب یہ کیا بر ہندی کس بلا کو کہتے ہیں؟"

اخلاق صاحب نے طنز بھری نظروں سے قیصر کو دیکھا اور پر اخلاق لہجے میں کہا "یہ تو قیصر صاحب بہتر بتا سکتے ہیں۔" کہتے ہوئے وہ زور زور سے ہنسنے لگے۔ ان کی ہنسی میں سلطانہ کی ہنسی بھی شامل ہو گئی۔ قیصر ایک دم سناٹے میں آ گیا۔ ساری محفل اس پر ہنس رہی تھی۔ ساری دنیا اس پر قہقہے لگا رہی تھی۔ مہذب انسانوں کا سماج اس کی حماقت پر قہقہہ زن تھا۔ اس کی حماقت یہی تھی کہ اس نے سماج کے گندہ گھناؤنے گوشوں سے نفرت کی تھی۔ زندگی کے حسن کی بقا کے لیے جدوجہد کی تھی۔ محبت، معصومیت، پاکیزگی اور لطافت کیلئے ہر قسم کی قربانی دی تھی

عورت کی عظمت اور تقدس کی حفاظت کے لئے اس نے جان کی بازی لگا دی تھی۔ اور اس کی حماقت پہ دنیا قہقہے لگا رہی تھی۔ قیصر کے دل و دماغ میں شعلے سے بھڑک گئے۔ وہ کانپ سا گیا۔ اس کی بدلی ہوئی حالت کا اندازہ کرتے ہوئے اخبار کے ایڈیٹر اخلاق صاحب نے جلدی سے کہا: "بھئی قیصر۔ بیٹھو بھی جاؤ۔ سنو سلطانہ غالب کی ایک لاجواب غزل سنانا چاہتی ہیں۔"

سلطانہ نے بڑی سنگدلی کا مظاہرہ کیا: "اخلاق صاحب معصومیت اور لطافت کے پرستار کو موسیقی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اپنے دوست سے کہئے کہ کسی ویرانے کا رخ کریں اور فطرت کی معصومیت اور چاندنی کے تقدس سے اپنا دل بہلائیں۔"

سیٹھ بنسی لال اور نواب عزت علی خاں کے قہقہوں سے کمرہ سارا لرز گیا۔ قیصر نے تیز جلتی ہوئی نگاہوں سے سلطانہ کو گھور کر دیکھا۔ اس کے پتلے پتلے سرخ ہونٹ کپکپائے۔ چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ مگر وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔

اخلاق صاحب نے ہنسی روک کر پوچھا: "اچھا تو بھئی قیصر۔ سنا ہے آپ سینی ٹوریم گئے تھے۔ کب آئے وہاں سے۔ اب صحت کیسی ہے؟"

اس پر جیسے سیٹھ بنسی لال کو موقع کی نزاکت کا احساس ہوا۔ "وہ۔ تو قیصر بالو ٹی بی ہو گیا تھا میں کہتا ہوں ہمارے نوجوانوں کو خوش رہنا چاہئے لیکن ہماری کون سنتا ہے۔ دیکھو بابا۔ اچھے خاصے آدمی کو اس عمر ہی میں یہ موذی مرض لگ گیا۔"

نواب عزت علی خاں نے بھی کچھ کہنا ضروری سمجھا۔ بڑے تاسف بھرے لہجے میں بولے: "قیصر میاں آپ کے والدِ مرحوم کا شمار شہر کے رئیسوں میں ہوتا تھا۔ آپ کو کس بات کی کمی تھی۔ ساری دولت تو آپ نے ایک فضول مہم میں جھونک دی۔ دنیا بھر کی بدنامی مول لی۔ نواب سرفراز کی صاحبزادی بھی آپ کے ہاتھ سے نکل گئیں۔ وہ آپ سے منسوب بھی تھیں نا؟"

قیصر کی زبان پر مہرِ خموشی لگ گئی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سلطانہ نے ایک تیر اور چھوڑا: "اسی غم نے تو انہیں سینی ٹوریم پہنچا دیا بھئی فرہاد نے بھی کیا محبت کی ہر گلاب وہ جیسے مرجھا کر رہ گئی۔ عشق میں ناکامی کی بدولت ...."

قیصر کی آنکھوں کے آگے ایک تاریک غبار ابھر آیا۔ ذہن میں بے شمار آوازیں گونج اٹھیں۔

"طوائف کا وجود سماج کا جز لاینفک ہے طوائف کے بغیر سماج کا تصور تک ممکن نہیں"
"بدنام بازار سوسائٹی کیلئے ناگزیر ہے۔ ہم اسے ختم نہیں کر سکتے"
"تم کو ان حالات پر بالکل اختیار نہیں جو عورت کو بدنام بازار میں لیتا تے ہیں۔"
"تم دیوانے ہو۔ پاگل ہو جوانوں کا۔ دنیا میں رہتے ہو بہت مشکل ہے قیصر۔ بدنام بازار کا بند ہونا بہت مشکل ہے۔"

آوازوں کی تیز تند موجوں پر بہتا ہوا قیصر انکے دھندلاتے ہوئے جزیرے پر پہنچ گیا تھا۔ دنیا بھر کی مخالفتوں کے باوجود وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ سخت جدوجہد کرتا رہا۔ بدنام بازار کی ایک معصوم اور سمجھدار لڑکی سلطانہ نے اس کا بڑا ساتھ دیا۔ اور پھر بدنام بازار کی عورتوں نے عہد کیا کہ وہ باعزت زندگی بسر کریں گی۔ محنت اور شرافت سے روزگار کمائیں گی۔ پھر ان عورتوں کیلئے موزوں کام فراہم کیا گیا۔ صنعتی مراکز قائم کئے گئے۔ اس دوران میں وہ امتحانی وقت آیا۔ جب بدنام بازار کے گلی کوچوں سے آوازیں بلند ہونے لگیں۔ "تم نے ہمیں عزت اور شرافت کی زندگی دے دی لیکن ہم عورتیں بہت کمزور ہیں۔ ہمیں مرد کے مضبوط بازو کا سہارا چاہئے۔ مگر ہم سے شادی کون کرے گا"؟

سلطانہ کی خوبصورت آنکھوں میں بھی یہی سوال ابھر آیا تھا ہاں۔ کون شریف آدمی ایک طوائف زادی سے شادی کرے گا۔ کس میں اتنی ہمت ہے جو طوائف کو سماج میں ایک عورت کی جگہ دے دے!

ستیا اور مریم کے تقدس کی خاطر کون اپنی سماجی پوزیشن کی قربانی دے سکتا ہے؟ قیصر سخت کشمکش کا شکار ہو گیا۔ ایک طرف اس کی منگیتر تھی۔ نواب سرفراز کی اکلوتی اور حسین و جمیل لڑکی اور دوسری طرف سلطانہ تھی۔ ایک طوائف زادی۔ کیا وہ سلطانہ کی خاطر نواب سرفراز کی نور نظر شکیلہ کو چھوڑ سکتا ہے۔؟ قربانی۔ ایثار۔ عمل۔ عمل۔ ہر تحریک ہر اصول ہر جذبہ اپنی تعاون ترقی کیلئے قربانی، ایثار اور عمل کا محتاج ہوتا ہے۔ اس نے کافی غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا شکیلہ بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ اسے کوئی بھی اچھا بر مل سکتا ہے اور سلطانہ ..... اس لئے سلطانہ میری بیوی بنے گی۔ قیصر نے جب فیصلہ کیا تھا۔ اکیلا تھا۔ فیصلہ کرنے کے بعد وہ اکیلا

نہیں رہا۔ بے شمار آوازوں نے اس کی آواز کا ساتھ دیا۔ اور آندھیوں اور طوفانوں میں بھی اس کا روشن کیا ہوا چراغ جلتا رہا۔!

اور پھر سب کچھ — ہاں — نائلہ — نائلہ اسے ٹی۔بی ہو گیا تھا۔ وہ سینیٹوریم چلا گیا تھا اور اس وقت سلطانہ نے وعدہ کیا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کے روشن کئے ہوئے چراغ کی حفاظت کرے گی۔ اور آج وہ چراغ گل ہو گیا تھا۔ اس کا مشن بری طرح ناکام ہو گیا۔ اور اس کی ہونے والی بیوی حسین و جمیل سلطانہ سولہ سنگھار کئے، پاؤں میں پائل باندھے سرِ محفل رقص کر رہی تھی اور لہک لہک کر گا رہی تھی۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب — دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

سلطانہ رقص کر رہی تھی۔ سارا کمرہ رقص میں تھا۔ کسی تیز رفتار برقی پنکھے کی طرح یہ سارا منظر اس کی نگاہوں میں گھومنے لگا۔ اور دوسرے ہی لمحے وہ چکرا کر دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔ اور بے ہوش ہو گیا۔ اور جب اسے ہوش آیا تو وہ حجلۂ عروسی میں مسہری پر دراز تھا۔ پھولوں اور عروسی خوشبوؤں سے سارا کمرہ مہک رہا تھا۔ اور کھلی ہوئی کھڑکی سے صبح کی اجلی کرنیں کمرے میں پھیلی آئی تھیں۔

قیصر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"کیوں کیا ہوا۔ ؟ ۔ کوئی خواب دیکھا ہے آپ نے" ؟ اس کے تجربے کا تاج محل اس کے سامنے تھا۔ سلطانہ اس کی نئی نویلی دلہن اس کے سامنے کھڑی پیار بھری آواز میں پوچھ رہی تھی: "کوئی خواب دیکھا ہے۔ آپ نے" ؟

"خواب"۔ وہ گہری نظروں سے اپنی شریکِ حیات کو دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ اس کی آنکھوں میں ٹوٹے ہوئے خواب کے سائے رینگ رہے تھے حقیقت سامنے تھی۔ بدنام بانا ختم ہو چکا تھا۔ سلطانہ نے نواب سرفراز کی اکلوتی بیٹی کی جگہ لے لی تھی۔ عورت نے اپنی عظمت۔ اپنے تقدس اور اپنے مقام کو پا لیا تھا۔۔۔ ہاں۔ وہ خواب تھا لاشعور کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں چھپے ہوئے میرے اندیشے وسوسے اور شکوک جن کے بارے میں کبھی بھی میں نے نہیں سوچا، خواب بن کر میرے سامنے آئے تھے قیصر نے سوچا۔ اور سلطانہ کے خوبصورت ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر پرسکون لہجے میں بولا۔ "ہمارا ماضی ایک خواب تھا۔ وہ خواب اب ٹوٹ گیا آؤ اسے بھولنے کی کوشش کریں" جواب میں سلطانہ نے احسان مندی اور ممنونیت سے بوجھل نظروں سے اس کی طرف گھوم کر دیکھا۔ اور مسکرانے لگی۔ ایک پیاری، دلفریب اور پرعزم مسکراہٹ۔!



ناخن

بشیر پرویز
ایم اے ایس ایس سی

اور آج پھر ناخنوں کی وجہ سے اسے رسوا ہونا پڑا

یہ ناخن لمبے لمبے مخروطی سوکھے ہوئے تھے۔ اول تو آسانی سے تراشتے ہی نہ جاتے اور اگر وہ بعض تراشتا تو تیسرے ہی چوتھے دن پھر اپنی اصلی حالت میں آجاتے، یوں تیزی سے بڑھتے جیسے داڑھی کے بال! داڑھی صاف کرنے سے تو چہرہ نکھر آتا ہے لیکن اس کے ناخنوں کے متعلق یہ بات نہ تھی۔ تراشنے کے بعد اس کی انگلیاں اور بھی بھدی دکھائی دیتیں۔ یوں معلوم ہوتا جیسے آگے سے گھس دی گئی ہوں۔ دراصل ناخنوں کی یہ لمبائی ہی اس کی انگلیوں کو متناسب شکل دیتی تھی پر اس کا کیا علاج کہ کوئی بھی دیکھنے والا اس کے ناخنوں کو دیکھ کر ٹھٹکے بغیر نہ رہ سکتا تھا! اور آج بھی یہی ہوا تھا۔۔۔

وہ تو اس پارٹی میں جانا ہی نہ چاہتا تھا۔ وہ ہمیشہ ایسی پارٹیوں سے، ایسے مجمع سے کتراتا تھا۔۔۔

لیکن آج رمیش اسے لے جانے کیلئے بضد تھا اور وہ بھی جانے کیلئے تیار ہو گیا۔ یہ سوچ کر آخر کب تک وہ دنیا سے الگ تھلگ رہے گا۔ اس کے ناخن ہی تو بھدے سے ہیں نا۔ اور تو کوئی نقص نہیں ہے ویسے اپنے اس نقص کو اسے خود اتنی اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔ لوگ ریمارک کستے ہیں تو کستے رہیں۔ اسے بھی ان کی ہنسی میں شامل ہو جانا چاہیئے۔ اور پھر لوگوں کی نظر میں یہ ناخن بھی اس کے جسم کا ایک فطری حصہ نظر آنے لگیں گے۔ اور یہی سوچ کر وہ رمیش کے ساتھ چلا گیا۔ آج وہ دو ہاتھوں کو پتلون کی جیبوں میں نہیں ڈالے ہوئے تھا۔ وہاں کو چھپا کر نہیں رکھنا چاہتا تب تک چھپا رہے گا، لیکن ہاتھوں کو جیب میں چھپے رہنے کی عادت پڑ گئی تھی وہ بار بار پتلون کی جیبوں میں چلے جاتے۔ اور اسے انہیں زبردستی باہر نکالنا پڑتا۔ اس وقت بھی اس کے ہاتھ جیبوں ہی میں تھے جب رمیش نے پارٹی میں اس کا تعارف مسٹر محمود سے کرایا۔

"آپ ہیں مسٹر محمود ہوتے ہوالی آرٹس اینڈ کرافٹس نمائش" کے چیف آرگنائزر۔ اور آپ ہیں میرے دوست مسٹر ونود۔ ایک آرٹسٹ۔ نمائش کیلئے آپ بھی تصویر بنائیں گے اور اگر خدا نے چاہا تو ان کی یہ تصویر ایک نئی چیز ہوگی، ایک شاہکار!"

اور اس نے مصافحہ کیلئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس سے پہلے کسی سے متعارف ہونے وقت بھی وہ ہاتھوں کو پتلون کی جیبوں میں ڈالے رہتا۔ اور سر جھکا کر ملنے والے کا استقبال کیا کرتا اور بہت ملنے والے کو کچھ لمحے اپنا ہاتھ آگے بڑھائے رکھنے کے بعد کھسیا کر ہاتھ پیچھے ہٹانا پڑتا۔ یہ تہذیب کے خلاف ہوتا لیکن وہ مجبور تھا۔ آج مسٹر محمود سے ملتے وقت اسے اپنا تھوڑی دیر پہلے کا ارادہ یاد تھا۔ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہی محمود کی نگاہیں اس کے ناخنوں پر پڑیں اور وہ متعجب سا ہوا۔ ونود نے جب اس کے چہرے پر حیرت کے جذبات ابھرتے دیکھے ایسے جذبات جن سے وہ آشنا تھا جن سے وہ گھبرایا کرتا تھا۔ تو "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی" کہتے جھٹ ہاتھوں کو جیبوں میں لے گیا۔ لیکن ایسی پارٹی میں وہ ہاتھوں کو کہاں تک چھپا سکتا تھا جہاں بہت سی نگاہیں اس کے ناخنوں کو تعجب اور غیر معمولی دلچسپی سے دیکھا کرتی تھیں اگرچہ وہ صرف اس وقت ہاتھ باہر نکالتا جب بہت ضروری ہوتا مثلاً کھانا کھاتے وقت لیکن پھر بھی وہ انہیں چھپا نہ پاتا۔ جب بھی محمود کی نگاہیں اس کے ناخنوں پر پڑیں وہ گھبرا سا گیا۔ وہی ہوا جب

اسے شوق تھا۔ مجھ سے پوچھ ہی لیا۔
"گستاخی معاف۔ آپ نے یہ ناخن اس طرح کیوں پال رکھے ہیں۔؟"
اور اس کا یہ سوال اس کے دل میں اتر گیا۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا
"یہ ناخن۔؟۔۔ یہ ہی، ہی ہاں ہاں اس لئے کہ اگر کسی سے لڑائی ہو جائے تو۔۔۔۔۔"
کتنا بے ہودہ جواب ہے۔ اس کا احساس اسے اسی وقت ہو گیا اور وہ اپنا جواب ادھورا چھوڑ کر
مسکرانے لگا۔ ایک زخمی مسکراہٹ۔ پاس کھڑا ہوا سرینواستو بول اٹھا۔
"جی ہاں۔ ٹھیک فرمایا آپ نے۔ اب کی بار جو جنگ ہوگی، تو اس میں ایسے ناخنوں والے فوجی
بھرتی کئے جائیں گے۔"
اور اس پر ایک زور دار قہقہہ ابل پڑا اور وہ کٹ کے رہ گیا۔ چند سیکنڈ بعد سری واستو
پھر بولا۔
"دیکھو ونود! تم ان ناخنوں پر نیل پالش لگا لیا کرو۔ اس طرح تم باقاعدہ ان کی نمائش کر سکتے
ہو۔" ۔۔ گرم ہوتا ہوا قہقہہ پھر ابھرا اور اس وقت اس کا دل چاہا کہ وہ اپنے ناخن کر اس کے
ہونے پیٹ میں گاڑ دے۔ اور اس نے ایسی ہی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا بھی، سری واستو
سہم گیا۔ لیکن سہمے ہونے کے باوجود پھر بولا۔
"ارے بچاؤ مجھے! محنت سے پالی ہوئی میری اس توند کو یہ ناخن اڑا نہ دیں۔"
اور اب کی بار سب کے ساتھ وہ ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن اس کی ہنسی ایک ہارے ہوئے
جواری کی ہنسی تھی۔ جو اپنی شکست پر ہنسی کا پردہ ڈالنا چاہ رہا ہو۔ وہ جتنی دیر پارٹی میں رہا اس
کا احساس دل اسے ملامت کرتا رہا۔ وہ آیا ہی کیوں ایسی جگہ، اسے کیا ضرورت تھی اس
جگہ آنے کی۔؟ اور مذاق اڑانے کی۔! اور وہ بھول گیا کہ وہ کیا سوچ کر اس جگہ آیا تھا۔!
"ان ناخنوں کی وجہ سے وہ بچپن ہی سے پریشان تھا۔ اسکول میں جب ماسٹر صاحب لڑکوں
کو اپنے ناخن کٹوا کر آنے کیلئے کہتے تو اس کی ماں بہت مشکل سے اس کے ناخن تراش پاتی۔
اتنے سخت تھے اس کے ناخن! جسمانی صفائی کے اچانک معائنے کے وقت جب ہیڈ ماسٹر صاحب
لڑکوں کو قطاروں میں کھڑا کر کے ان کے دونوں ہاتھ الٹے پھیلانے کیلئے کہتے تو وہ ہمیشہ

ناخنوں کے بڑھے ہونے کی وجہ سے قطار سے الگ کر دیا جاتا۔ تمام لڑکے ہیڈ ماسٹر صاحب اشارے پر اسے گندا لڑکا۔ "گندا لڑکا کہتے اور وہ شرمندہ ہوتا آخر تو وہ بچہ ہی رہ پڑتا۔ اس دن وہ اپنی ماں سے ناخن نہ تراشنے کی وجہ سے خوب جھگڑتا۔ "دیکھو ماں! اگر تم روزانہ میرے ناخن نہ کاٹو گی تو میں اسکول نہیں جاؤں گا۔ بس۔"

چند روز تو اس کی ماں جیسے تیسے اس کے ناخن کاٹتی لیکن اس کے ناخنوں کے سخت ہونے کی وجہ سے کچھ وہ سستی کر جاتی۔ اور کچھ یہ لاپروا ہو جاتا۔ اسکول میں تمام لڑکے اس کے ناخنوں کے لمبے اور بدنما ہونے کی وجہ سے اس سے کتراتے تھے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایک دفعہ ایک لڑکے سے لڑائی کے دوران اس نے اپنے ناخنوں سے اسے زخمی کر دیا تھا۔ اس وقت کلاس ٹیچر نے اس کے ہاتھوں پر بید مارتے ہوئے کہا تھا۔ "بدمعاش! تم نے اسی لئے یہ ناخن بڑھا رکھے ہیں۔ اسی لئے انھیں کٹوا کر نہیں آتے۔ لیکن میں تمہاری انگلیاں توڑ کر رکھ دوں گا۔"

اسے مار پڑتی دیکھ کر تمام لڑکے خوش ہوئے تھے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ سزا اسے یہ ملی کہ اب صفائی کے معائنے کے وقت اس کے ہاتھ دیکھے ہی نہ جاتے اسے ہیڈ ماسٹر نے سب کے سامنے کہہ دیا۔

"تمہیں تو ناخن کٹوا کر آنے کیلئے کہنا ہی بیکار ہے۔ تم پر کہنے کا کچھ اثر نہیں ہوگا۔ تم اس قطار میں کھڑے ہی نہ ہوا کرو۔ سمجھے۔"

اور تمام لڑکوں کو معائنے کیلئے قطار میں باہر لے جایا جاتا۔ اس دن تو اس کا دل چاہتا کہ وہ اسکول سے بھاگ جائے! پڑھائی میں بھی اس کا دل نہ لگتا۔ وہ تو یہ جانے اسے ڈرائنگ کے مضمون سے اتنی دلچسپی کیوں تھی۔ کہ وہ ڈرائنگ سے جدا ہونا چاہتا تھا اور اسی وجہ سے اسکول نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ورنہ وہ کب کا اسکول چھوڑ بیٹھا ہوتا۔ ڈرائنگ کے ماسٹر صاحب ہمیشہ اسے سراہتا۔ ہمیشہ اسے جماعت میں سب سے زیادہ نمبر دیئے تھے۔ جس دن ڈرائنگ نہ پڑھائی جاتی ہو وہ اسکول ہی نہیں جاتا۔ اس دن گھر سے تو اسکول جاتا لیکن اسکول نہ پہنچتا۔ شہر کے کسی غیر آباد، سنسان علاقے کی طرف چلا جاتا اور وہاں کوئلے سے پتھر سے یا چاک سے تصویریں بنایا کرتا۔ لیکن یہ تصویریں اس کی تعلیم کی تصویر کو بگاڑ رہی تھیں۔ وہ امتحان میں فیل

اور تیسری نے کہا
دیکھئے یہ بدنما کی تصویر! کتنی معصوم ہے ہماری بیٹا ۔ اسے ان ناخنوں سے ڈرلیے گا نہیں
۔ اور اس پر ایک زور کا قہقہہ پڑا ۔ اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے ہاتھوں کو
پکڑ کر اسی کے ناخنوں سے اس کا دل زخمی کر دیا ہو ۔

وہ کتنی ہی دیر تک اس نئے زخم سے کراہتا رہا ۔ جب بھی وہ تصویر کی طرف دیکھتا اسے
اپنے ناخن اور بھی بدنما دکھائی دیتے ۔ بدنما اور بھیانک اور اس وقت اسے یوں محسوس ہوتا
جیسے سچ مچ وہ تصویریں ناخنوں سے خوف کھا رہی ہوں ! وہ رات بھر سو نہ سکا اور ابھی صبح
ہونے میں کچھ وقت باقی تھا کہ وہ گھر چھوڑ چکا تھا ۔

دوسرے دن وہ اس شہر میں پہنچا جہاں اس کی ملاقات رمیش سے ہوئی ۔ رمیش جو بہت
بڑے پیمانے پر کمرشیل آرٹس کا بزنس کرتا تھا ۔ رمیش جو آرٹسٹ کم اور آرٹ کا قدردان
زیادہ تھا ۔ اس نے بہت سے آرٹسٹ ملازم رکھے ہوئے تھے ۔ اسے ونود میں بھی ایک آرٹسٹ
نظر آیا اس نے اسے بھی اپنے اسٹوڈیو میں ملازم رکھ لیا ۔ پہلے پہل اس کا کام اسٹوڈیو کے چیتر کاروں
کی مدد کرنا تھا ۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد رمیش نے اسے بھی اپنی صلاحیت دکھلانے کا موقع
دیا اور اس نے کچھ اچھے اچھے چیتر بنائے بھی ۔ لیکن نہ جانے اس کی ہمت آگے بڑھتے بڑھتے جواب
کیوں دے جاتی ۔ وہ ابھی تک اسٹوڈیو کا دوسرے درجے کا آرٹسٹ تھا ۔ ابھی تک کامیابی
اس سے دور تھی ! ہاں البتہ اس کی نیک خصلت نے اس کی محنت نے رمیش کو ضرور اپنی طرف کھینچ
لیا تھا اور اس وقت وہ اسٹوڈیو کا ملازم نہ تھا رمیش کا عزیز دوست تھا ۔

یہ تو رمیش نے پہلے ہی دن جان لیا تھا کہ ونود کو اپنے ناخنوں کے بھدے ہونے کا بہت
زیادہ احساس ہے ۔ اور ایک حساس دل کی کمزوری کو سمجھتے ہوئے اس نے کبھی اس کے ناخنوں
کے متعلق بات نہ کی تھی ۔ لیکن اب کچھ عرصہ سے وہ جیسے اس احساس سے باہر نکالنے کی
کوشش کر رہا ہو، کچھ اس طرح کی باتیں کیا کرتا ۔

" ابھی ابھی ایک عجیب بات پڑھی ہے ونود! بی تھوون (BEE THOVAN) جرمنی کا ساز
سنگیت کا ماہر ہو گزرا ہے ۔ وہ ایک عجیب طرح کے بہرے پن میں مبتلا تھا ۔ یعنی یہ کمزوری

ہونے لگا۔ صرف ڈرائنگ کا مضمون اسے پاس نہ کرا سکتا تھا اور ایک دن باپ کے ڈانٹنے پر اس نے صاف کہہ دیا۔

"میں نہیں پڑھوں گا پتا جی مجھے اسکول اچھا نہیں لگتا۔"

اور باپ نے اسے اسکول سے اٹھا لیا۔ اس وقت وہ نویں درجے میں پڑھتا تھا۔

وہ میٹرک بھی نہ کر سکا۔

اسکول سے اٹھانے کے بعد باپ نے اسے اپنے لکڑی کوئلے کے ڈپو پر بٹھا لیا۔ لیکن اس کا دل، وہاں بھی نہ لگا، روزانہ کے لین دین میں وہ کئی غلطیاں کرتا اور کئی بار باپ سے ڈانٹتا

آخر تم کون سا کام کرنا چاہتے ہو۔ اچھی ملازمت تم کو ملنے سے رہی۔ میٹرک بھی تو نہیں ہو جو تم کہو وہی کام تمہیں کھول دوں ۔؟

"میں یہی کام کروں گا یہی ٹھیک ہے پتا جی۔"

اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ وہ کیوں اتنا بے چین رہتا ہے۔ وہ اسی کام پر اسی طرح کھویا کھویا۔ اس سے بیوپار میں غلطیاں ہوتی رہیں۔ اور وہ باپ کی ڈانٹ ڈپٹ سہتا رہا۔

"لڑکا جوان ہے تم اس کی شادی کر دو۔ خود بخود سدھر جائے گا۔"

اس کے باپ کو کسی دوست نے رائے دی۔ اور یہ سمجھاؤ اس کے باپ کو پسند آگیا۔ اس کی شادی کے پیغام آنے لگے۔ اور ایک جگہ اس کی بات پکی ہو گئی۔ لیکن ونود کو تو جیسے کچھ معلوم نہ تھا اسے واضح طور پر اس دن پتہ چلا جب اس کی ماں نے اسے بتایا کہ آج اس کے ہونے والے سسرال کی چند عورتیں آئیں گی۔ اس کی سالیاں، اس کی بیوی کی سہیلیاں اور کچھ رشتہ دار عورتیں۔ اس کے گھر والے بہت خوش تھے اس دن، لیکن ونود کو کوئی خوشی نہ تھی۔ وہ تو اسی طرح گم سم تھا۔

"ارے! انھوں نے تو لڑکیوں کی طرح اپنے ناخن بڑھا رکھے ہیں!"

ایک لڑکی مسکرائی

"پدما کو جانتے ہی بتانا ہوگا کہ تم بھی ناخن بڑھا لو۔"

دوسری بولی

وہ اچھی طرح سے جانتا تھا لیکن اس نقص کو اس نے اپنے راستے کی رکاوٹ نہ بننے دیا۔ اس نے اپنی اچھی صفات پر اپنے مستقبل کی بنیاد رکھی، لوگ بھول گئے کہ وہ بہرہ ہے!

اور کبھی اس کی یوں ہمت بڑھاتا۔

"انسان اپنے جسمانی نقص کو فائدے میں بدل سکتا ہے دوست! سینما کے کئی مزاحیہ اداکاروں کا موٹاپا ہی ان کا سرمایہ ہوتا ہے!"

اور یا کبھی —

"بھئی یہ تو انہونی بات ہے کہ کوئی بھی آدمی صرف اپنی جسمانی خوبصورتی کیلئے قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اگر دیکھا جاتا ہے تو اس وجہ سے کہ وہ سماج کو کیا فائدہ پہنچا رہا ہے!"

اور ان سب باتوں کا اثر ضرور ہوتا لیکن عارضی طور پر۔ اور وہ نود پھر اسی طرح احساس کمتری کا شکار ہو جاتا۔ آج بھی رمیش اسے اس احساس سے باہر نکالنے کیلئے اس پارٹی میں لے گیا تھا۔ اور آج بھی وہ اپنے اندر ہمت پیدا کر کے گیا تھا۔ لیکن جب پارٹی میں چند دوستوں نے اس کی اس کمزوری کی طرف اشارہ کیا۔ تو اس کی ہمت پھر جواب دے گئی۔ وہ پھر کھسیل گیا لیکن رمیش کے یہ الفاظ جیسے اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کر رہے تھے!

"اگر خدا نے چاہا تو ان کی وہ تصویر ایک نئی چیز ہوگی! ایک نیا تجربہ۔"

پارٹی سے آنے کے بعد وہ اسی سوچ میں مبتلا ہو گیا۔ ہاں اسے اس نمائش میں دکھا دینا ہوگا کہ وہ بھی ایک بہت بڑا آرٹسٹ ہے۔ اس کی یہ کوشش ضرور ایک نئی چیز ہوگی! ایک نیا تجربہ!

وہ یہی سوچ رہا تھا کہ رمیش اسٹوڈیو میں داخل ہوا اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا۔

"یہ لو ونود! تمہارے لئے ایک تحفہ لایا ہوں۔"

"کیا —؟"

اس نے پیکٹ لے لیا اور کھولنے لگا۔

"دیکھو — کھولنے سے پہلے وعدہ کرو کہ تم میرے اس تحفے کو کوئی اور معنی نہ لوگے۔"

"کیا مطلب —؟"

"مطلب یہ کہ جو چیز میں لایا ہوں وہ اسے تم یہ سمجھوگے کہ میرا مقصد کسی طرح سے تمہارا

مذاق اڑاتا ہے۔"

"کھول لئے تو دو سب"

اور اس نے پیکٹ کھول لیا۔ سفید دستانوں کا ایک جوڑا تھا خوبصورت قیمتی۔ وہ ایک لمحہ انھیں دیکھتا رہا دوسرے لمحہ اس کا چہرہ اتر گیا۔

دوست! اگر کسی کی آنکھ جاتی ہے تو وہ مصنوعی آنکھ لگوا کر اپنا نقص چھپا لیتا ہے۔ کسی کی ٹانگ چلی جاتی ہے تو وہ لکڑی کی ٹانگ لگوا لیتا ہے۔ کسی کے کان بہرے ہو جائیں تو وہ سننے کے آلے سے مدد لیتا ہے تاکہ وہ اس دنیا میں زندہ رہ سکے۔ ہر نے ہی کیا ہے اگر تم ان دستانوں کی مدد سے اپنے ناخن ..... "

"تو کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ دستانے میرے احساس پر پردہ ڈال سکیں گے۔۔؟"

"تمہارے احساس پر نہ سہی، لوگوں کو تو تمہاری اس کمزوری کا فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملے گا"

اور اس نے وہ دستانے لے لئے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ دوست کی ہمدردی نے بھی آج اسے اپنی اس کمزوری کا احساس دلا دیا تھا۔

وہ اس وقت تصویر بنا رہا تھا۔ دستانہ پہنے اس کا ہاتھ بار بار برش کو رنگوں میں ڈبوتا تھا لیکن جب بھی اس کی نگاہ تصویر سے ہٹ کر دستانوں پر پڑتی اس کے سامنے اس کے ناخن ابھر آتے اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ دستانے انھیں ڈھانپنے کے بجائے اور بھی زیادہ نمایاں کر رہے ہوں۔ اور پھر جیسے مور اپنے پاؤں دیکھ کر ناچنا بھول جائے۔ وہ تصویر بنانا بند کر دیتا اس کا جی چاہتا وہ دستانوں کو اتار پھینکے۔ انھیں پھاڑ دے۔ یہ پردہ مصنوعی ہے۔ اس پردے سے وہ اپنے ناخن چھپا سکے گا!

لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دستانے پہنے رہا۔ تصویر بناتا رہا۔ واٹر کلر میں تصویر! تصویر کا چہرہ مکمل ہو گیا۔ ایک خوبصورت لڑکی کا چہرہ لیکن وہ چہرہ اسے پسند نہ آیا۔ اور اس نے وہ ادھوری تصویر پرے پھینک دی۔ پھر اس نے آئل پینٹنگ (oil painting) میں وہی چہرہ بنایا لیکن وہ بھی اسے نہ جچا۔ اس نے اسے بھی ادھورا چھوڑ دیا۔ پھر اس نے پنسل لی اور کاغذ پر جھک گیا اور صرف پنسل سکیچ میں تصویر بنانے لگا۔ ۔ اف، پنسل سکیچ سے بنا چہرہ بھلا اچھا نہیں۔

[illegible] ! ان ہاتھوں کو، ان انگلیوں کو دستانوں کی قید میں رکھ کر وہ تصویر میں وہ اثر نہیں
ڈال پایا۔ ایسے جیسا کہ وہ چاہتا ہے۔ انگلیوں کے لمس اور تصویر کے درمیان یہ دستانے
ایک دیوار کا کام کر رہے ہیں ۔ اور اس نے دستانے اتار پھینکے۔ اسی وقت اس کی نگاہیں ناخنوں
پر پڑیں اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس خوبصورت چہرے کے سامنے ایک اور تصویر ابھر آئی
دو ہاتھوں کی تصویر ! انگلیاں کھولے لمبے لمبے ناخنوں والے دو ہاتھ، اس چہرے کی طرف
بڑھتے ہوئے۔ اور جیسے کسی نے اسکے دماغ کو گرم لوہے سے داغ دیا ہو۔ وہ کلبلا اٹھا
اس کے دل میں انتقام کا جذبہ ابھر آیا۔ خوبصورتی سے انتقام لینے کا جذبہ اور اس نے اپنے
ناخن اس چہرے پر گاڑ دیئے۔ اور ان ناخنوں نے تصویر پر کاغذ پر جگہ جگہ ادھر ادھر لکیریں
ڈال دیں۔ ان گنت بے تحاشا۔ لگاتار۔ جب وہ بہت سی لکیریں کھینچ چکا تو وہ نیا سا
اس تصویر کو دیکھنے لگا۔ بگڑے ہوئے اس چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ بے اختیار غصہ سے
اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔ اور اب وہ صرف ان لکیروں کو دیکھ رہا تھا۔ گہری گہری لکیریں۔ ابھرے
ابھرے نشان اور اچانک اس کے دماغ میں ایک خیال ابھرا اسکی نگاہوں میں ایک چمک
آگئی۔ ان چمکتی ہوئی نگاہوں سے اس نے اپنے ناخنوں کی طرف دیکھا اور پھر لکیروں کی طرف
پھر ناخنوں کی طرف اور پھر لکیروں کی طرف اور پھر اس نے جلدی سے پاس پڑے ڈرائنگ پیپر
کو اٹھایا۔ اس کے ناخن الٹے سیدھے اس کاغذ پر دوڑنے لگے۔ تیز تیز، آہستہ آہستہ
تیز تیز ! لکیریں بنتی گئیں۔ نشان ابھرتے گئے اور پھر لکیریں اور نشان ملکر ایک تصویر
بن گئے۔ صرف ناخنوں کی مدد سے بنائی ہوئی تصویر۔ کاغذ کے بجائے اس نے موٹا کارڈ
بورڈ اٹھایا اور تھوڑی دیر بعد اس کے ناخنوں نے کارڈ بورڈ پر بھی وہ تصویر بنا دی اور کچھ عرصہ
بعد۔ ان سخت ناخنوں نے پلائی ووڈ پر چمڑے پر۔ اور قیمتی دھاتوں کے پتلے پتلے
پتروں پر بھی تصویریں بنا ڈالیں، بناتے رہے۔ بناتے رہتے ہیں اور آج وہ لمبے لمبے
سوکھے ناخن ایک نیل آرٹسٹ (NAIL ARTIST) کے ناخن ہیں۔!



موہن بہادر

ڈی لائیٹ میں انگریزی دھنوں کے ساتھ ریکارڈ بج رہے تھے نیلے پیلے قمقموں کی نیلی پیلی روشنی میں ہر چیز رنگین نظر آ رہی تھی۔

رام نے نیس کیفے کے چار کپ بنا کر نظریں دیپ کے چہرے پر گاڑ دیں۔

دیپ تھری فائیو (۵۵۵) کا خوشبودار دھواں اڑا رہا تھا، کرشن، پرکاش اور کانت کافی کی چسکیاں اپنے مخصوص انداز سے بھر رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تینوں ....

کسی کے تپتے ہوئے ہونٹ یاکس رٹ سے تھے۔
ایک لمحے کے بعد دلیپ نے انداز بے نیازی کے ساتھ سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر کہا
"بس، چار۔"
"مطلب" ۔ رام نے پوچھا
اور دلیپ نے نیا سگریٹ سلگا کر دھواں اڑانا شروع کر دیا۔
"کوئی پیئو ہینہ
ریڈ لیمپ کہیں کا" ۔ رام نے کہا۔
"بالکل وہی حرکت"
—— اور چاروں کے ہاتھوں سے کانچ کی بھری ہوئی پیالیاں چھوٹ گئیں اور ان کے کھلکھلاتے قہقہوں سے سارا ہوٹل گونج اٹھا ۔ مگر دلیپ یا ریڈ لیمپ تو کھلا گیا
ریڈ لیمپ کے قریب ٹیبل پر بیٹھی ہوئی شوخ و شنگ نرس نے اپنے گھنے بوسے
بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیکر ایک ادائے خاص سے اپنے فرینڈ سے پوچھا۔
ڈارلنگ لافٹر (LAUGHTER) میں لائف (LIFE) ہوتی بات ہے۔ ورنہ فاقد
سمرا ادراک ہو گئی۔"
اور اس کے فرینڈ نے اپنی کلارک گیبل کٹ مونچھوں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔
"ڈارلنگ! آخر ہم بار میں بیٹھے ہیں ۔ اپنے بنگلہ میں تو نہیں ۔"
جب شوخ و شنگ نرس کو یہ معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے اپنے ایک مسخرے دوست
کا نام ریڈ لیمپ رکھا ہے تو اس نے فوراً غصہ تھوک دیا اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور جیسے
وقت وہ اور زیادہ حسین نظر آ رہی تھی ۔ اور سب ادھر ادھر دیکھ رہے تھے کہ موتی،
کہاں مر گرے ہیں۔
"سوری ڈارلنگ ۔ ریڈ لیمپ بجھا نہیں ہے مگر یہ گولڈ فلیک کیوں نہیں ۔"
اور نرس کی حسین آنکھیں اپنے ڈارلنگ کی طرف دیکھتی رہیں مگر اس کا ڈارلنگ وجہ
بتانے سے قاصر رہا۔

کرشن اپنی مخصوص ہنسی ہنسا "ریڈ لیمپ آ ہا ہا ہا ہا —"

پرکاش کے چہرے پر شکنیں ابھر آئیں

"ریڈ لیمپ ۔ اتنا چیپ سگریٹ ۔"

کانت نے سگریٹ کا دھواں اڑا کر کہا

"میں مان گیا ۔ رام نے ولیج کا نام ریڈ لیمپ کیوں رکھا ہے؟"

"کیوں رکھا ہے بتاؤ تو سہی ۔" کرشن نے پوچھا ۔

کانت نے اپنی نازک اور کمزور سی انگلیوں میں دم توڑتے ہوئے سگریٹ کا آخری کش کھینچ کر بیرا کو آواز دی — "بیرا"

"حضور —" بیرا حاضر تھا ۔

"ایک پیکٹ ریڈ لیمپ ۔"

"جی —" بیرے نے حیرانی سے جی کو لمبا کھینچتے ہوئے پوچھا "سگریٹ ۔"

"سنا نہیں ۔ ایک پیکٹ ریڈ لیمپ ۔" کانت نے بیچ کر کہا ۔

"سر، تھری فائیو ۔ تھری نائن ۔ تھری کیسل ، گولڈ فلیک ، کیپٹن ، کیپسٹن نگر دی لاسٹ میں ریڈ لیمپ ....."

"ریڈ لیمپ کے نیچے" کانت گرجا ۔

"یس سر" اور یس سر کا بچہ مودبانہ کھڑا ہو گیا ۔

"باہر سے ریڈ لیمپ کا پیکٹ لاؤ ۔"

"بہت بہتر جناب —"

کرشن اور پرکاش دونوں بہت خوش تھے ۔ چلو آج سب کا مسخرا اڑانے والا بھی تماشا بن گیا ۔ اور ریڈ لیمپ پریشان تھا (یا الہٰی یہ ماجرا کیا ہے)۔ مگر چندر کانت کچھ بھی نہ بتا سکے گا ۔ انجام کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ..... (لیکن یہ تو نفسیاتی تجزیے کا کمال تھا) بیرا شرماتے شرماتے آیا اور میز پر ریڈ لیمپ کی ڈبیہ رکھ کر چلا گیا ۔

کانت نے ڈبیہ سے ایک ایک سگریٹ سب کو دیا ۔ پھر یہ سگریٹ لائیٹر سے سلگا گئے

پہلے ہی کش پر سب کو جان کے لالے ولیبی کہ کھانسی کے دورے پڑ گئے
ایک بار پھر ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے
دوسرے لمحہ سگریٹوں کو توڑ مروڑ کر ایش ٹرے میں پھینک دیا گیا
"کانت — یہ مذاق ہے —؟" کرشن نے اپنے گلے کو ملتے ہوئے کہا۔
"میرے دوست — یہ مذاق نہیں۔ اگر تھری فائیو کے سگریٹ کا ریشمی دھواں اڑا کر تم دلوں کی باتیں کر سکتے ہو تو اس تلخ سگریٹ کا ایک کش لے کر اس کی بیوفائی کا ماتم بھی کر سکتے ہو —"
"بڑے بدتمیز ہو —"
ہاہا — واہ تمیز والے — ہاہا — کانت ہنستا رہا — ہاہا —
"ہاہا ... میں کہتا ہوں یہ خرافات بند کرو اور عقل مندوں کی طرح ہنسو
اور کانت نے عقل مندوں کی طرح ہنسنا شروع کر دیا۔" ہاہا"
پھر وہ خود بخود چپ ہو گیا اور کہنے لگا
"بات معمولی ہے۔ جیسے ریڈ لیمپ نے ہم سب کے نام ایجاد کر رکھے ہیں، مثلاً پرکاش انگوروں کے رس کا بہت دلدادہ ہے۔ ریڈ لیمپ اسے "لال پری کا نگہبان" کہہ کر خوش ہوتا ہے اور جیسے کرشن کو گورے رنگ سے نفرت ہے۔ سفید لباس سے، دودھ سے، حتیٰ کہ اس کی محبوبہ کا رنگ بھی سیاہ ہے۔ اور ریڈ لیمپ فوراً نام چن لیتا ہے۔ کرشن کنہیا سانورے ریڈ لیمپ ہمیشہ کسی نکتہ کی تلاش میں رہتا ہے۔ کانت کافی بہت پیتا ہے۔ شاید اپنی کو دیتاؤں سے بھی زیادہ۔ کویتا وقتی راحت عطا کرتی ہے اور کافی ایک تخیل ابھارتی ہے۔ وہ تخیل جس کے طفیل وہ اپنے دوستوں میں خلاسفر کہلاتا ہے۔ مگر ریڈ لیمپ کانت کو سنکی کہہ کر پکارتا ہے۔ مگر ہم سوچتے ہی رہے کہ ریڈ لیمپ کا نام کیا رکھا جائے۔ تاکہ آئندہ کیلئے باز آ جائے۔ اور مسخر اڑانا چھوڑ دے لیکن رام کے ذہن کی داد دو، جس نے اس مسخرے کا نام ریڈ لیمپ رکھا ہے۔ یہ سگریٹ بہت کڑوا بھی ہے اور عجیب بھی جیسے ہمارے ریڈ لیمپ کی باتیں کڑوی اور عجیب ہیں —"

پرکاش نے کہا "یہ کیا بات بنی کانت یار تم بھی نرے گاوڈی ہو۔ میں بتاتا ہوں کان کھول کے سنو۔"

"اچھا گاوڈی کے بھائی۔ تم بھی اپنی بڑ ہانکو۔"

اور گاوڈی کے بھائی نے بڑ ہانکنا شروع کر دیا۔

"ریڈ لیمپ کے معنی ہیں۔ سرخ اشین اور سرخ نشان ہے خون کا یعنی کہ محنت کشوں کا"

"بکو مت۔ یہ کیا سیاست لے بیٹھے۔" رام نے پوچھا

اور پرکاش نے بکنا شروع کر دیا۔ "اچھا اب تم بکو۔"

رام نے کہا

تم لوگ کبھی نہ مان سکوگے۔ کہ میں نے دلیپ کا نام ریڈ لیمپ کیوں رکھا ہے۔ تم لوگوں کو یہ معلوم ہی ہے کہ ریڈ لیمپ ایک ایسا سگریٹ ہے۔ جو تلون مزاج بھی ہے اور سستا بھی۔ بالکل ہمارے ریڈ لیمپ کی طرح۔ جب تک ریڈ لیمپ ہونٹوں میں دبا رہے گا۔ جلتا رہے سلگتا رہے گا۔ اور اگر ہونٹوں سے نکال کر انگلیوں میں رکھ لوگے تو ظالم بہت جلد روٹھ جائے گا۔ پھر ماچس کی تیلی سے اسے منانا پڑے گا۔ تب جا کے کہیں مانے گا۔

"خوب کیا فلسفہ ہے۔" کانت کی باچھیں کھل گئیں۔

"ابے یار سنو تو سہی۔ یوں ہی چلائے جا رہے ہو۔ اور یہی حال ہمارے ریڈ لیمپ کا ہے اس کی ہاں میں ہاں ملا دو تو کافی کی پیالی آ جائے گی۔ اور ہاں میں ہاں نہ ملاؤ گے تو ناراض ہو جائے۔ اس سے کہہ دو کہ ریڈ لیمپ بھائی تم بہت سجیلے ہو۔ یہ شارک سکن کا سوٹ پہن کر تم دیو آنند نظر آتے ہو تو پھولا نہ سمائے گا۔ (اور شاید منہ بھی چوم لے) اور اگر یہ کہہ دوگے بلکہ نے تمہیں دیکھ کر ناک سکوڑ لیا تھا تو روٹھ جائے گا۔ اور اگر یہ کہہ دو کہ ریڈ لیمپ صاحب آپ بڑے رنگین مزاج ہیں تو کھل جائیں گے۔ اور اگر یہ کہہ دو گے کہ سنتوش کہتی ہے کہ ریڈ لیمپ [illegible] کا کارٹون ہے تو خفا ہو جائے گا۔ اگر ریڈ لیمپ بار میں رم پی رہا ہو تو آپ کہئے یہ بس پی جا رہی ہے تو آپ کے لئے سولن کا آرڈر کر دیا جائے گا۔ ورنہ۔۔۔"

اور سب ہنسنے لگے۔

ایک بار پھر سبھی لوگ اپنے اپنے ماحول اور اپنی اپنی زبان کو بھول کر ان کی طرف کھنچ گئے
اس شور و غل و شنگ نذیر سنے نے شیمپین پی کر تے ہوئے ان باتوں کو تین چار خفیف سے
جھٹکے دیکر پوچھا
ڈارلنگ اب کیا ماجرا ہے کیا اب یہ لوگ —؟
رام نے ریڈ لیمپ کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا
”مادام، ایرا و غیرا کچھ بھی نہیں — آپ سے ملئے — آپ ہیں مسٹر ریڈ لیمپ —“
اور مسٹر ریڈ لیمپ کافی کا پیالہ رام پر پھینک کر تیزی سے ”ڈی لائٹ“ سے
باہر نکل گیا۔





جوان جسم کی خوشبو

عابد ضمیر

نئے مکان میں مجھے ہر طرح کا آرام تھا۔ پرانے مکان میں صرف تین کمرے تھے جو بجید کشادہ تھے دو کمروں کے بعد نئی اینٹوں کی ایک دیوار اٹھا دی گئی تھی جسے دیکھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا تھا کہ کسی وجہ سے دوسرے اور تیسرے کمرے کے درمیان دیوار کھڑی کر کے تیسرے کمرے کو علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ مجھے ذرا سی تلاش کے بعد تیسرا کمرہ کرایہ پر مل گیا تھا۔ اور اس طرح میں نئے شہر میں تلاش مکان کی کٹھن پریشانیوں سے بچ گیا تھا۔ میرے کمرے میں دو کھڑکیاں تھیں ایک کھڑکی جنوب کی طرف کھلتی تھی۔ جس کے سامنے والے مکان میں ایک بنگالی کنبہ آباد تھا اور دوسری کھڑکی مغرب کی طرف کھلتی تھی۔ جدھر شفق گوں آسمان پہ آفتاب کی آخری کرنیں

سونا لی تیتیں۔

اس سے پہلے میں کئی اور مکانوں میں رہ چکا تھا لیکن جو آرام اور سکون مجھے اس مکان میں ملا وہ کہیں اور میسر نہیں ہوا۔

گھر کی مالکن ایک بوڑھی اور بیوہ عورت تھی۔ اس کی ایک جوان اور کنواری لڑکی تھی جس کا نام وحیدن تھا۔ وحیدن سے ایک بڑا لڑکا جو درزی کا کام کرتا تھا اس کی کمائی سے اور مجھ سے جو کرایہ ملتا تھا اسے ملا کر ان کا گزارہ ہوتا تھا۔

وحیدن بہت اچھی لڑکی تھی اسمیں کوئی برائی تھی تو صرف یہ کہ لاوڈ اسپیکر پر بجتے ہوئے فلمی ریکارڈوں کی وہ نقل کیا کرتی تھی۔ اور موقع ملنے پر گھر کی اور دروازے سے باہر تاک جھانک کیا کرتی تھی۔ اسے اکثر اپنی بوڑھی ماں سے ان عادتوں پر کڑوی کسیلی سننی پڑتی تھیں لیکن اس سے اس کے معمول میں کوئی فرق نہ پڑتا۔ اس کے علاوہ وحیدن میں ایک عیب یہ بھی تھا کہ وقت بے وقت شاعری کیا کرتی تھی۔ جس کی وجہ سے میں اور اس کے گھر والے سبھی پریشان تھے اس کا معمول تھا کہ وہ جب بھی کوئی غزل یا نظم پوری کرتی فوراً میرے سر پر مسلط ہو جاتی اور اسی وقت اصلاح کرا کے جان چھوڑتی۔ اس کی شاعری کیا ہوتی تھی محض واہی تباہی ہوتی تھی۔ جیسے کوئی دیوانہ جو جی میں آئے بکنے لگے، اس کے گھر والوں نے اسے لاکھ سمجھایا کہ جوان لڑکی کا غیر مرد کے ساتھ کمرے میں اکیلی جانا اچھا نہیں۔ لیکن اس اللہ کی بندی پر اس کا کچھ اثر ہی نہ ہوتا تھا اور دندناتی دھڑلے سے میرے کمرے میں چلی آیا کرتی تھی۔ اسے دیکھ کر میرے جذبات سلگ اٹھتے تھے۔ دل بے قابو ہو جاتا تھا اور میں چاہتا تھا کہ اٹھ کر اس کا آنچل تھام لوں۔ لیکن اس وقت ضمیر کی آواز کانوں میں گونج اٹھتی:

"اپنے ہاتھوں کو گندہ نہ کرو ورنہ اس پر تیرا کوئی حق نہیں۔!"

اور میں گھبرا کر نظریں نیچی کر لیتا۔ تب وہ میرے اور قریب آکر کہتی،

"آپ رک کیوں گئے۔؟ اصلاح کر دیجئے نا۔ میں نے کتنی جانفشانی سے نئی غزل کہی ہے"

اور میں اس کے کنوارے جسم کی مدہوش کن خوشبو سے متاثر ہوتے ہوئے کہتا۔

"وحیدن غزل گوئی تمہارے بس کی بات نہیں۔ جاؤ کلام پاک کی تلاوت کرو، یا دل لگا کر امور خانہ داری انجام دینے کی کوشش کرو۔ تاکہ شادی کے بعد نئی زندگی کی تکمیل میں دشواری پیش نہ ہو۔"

وحیدن کا چہرہ یہ سن کر شفق گوں ہو جاتا ۔ اور اس کی آنکھوں میں تیز چمک آجاتی ۔ لیکن جلد ہی اس کے حیا آلود چہرے پر حزن و ملال چھا جاتا ۔ اور وہ لرزتی ہوئی آواز میں کہتی ۔

"حیدر صاحب ! مجھ جیسی بدنام لڑکی سے شادی کون کریگا !؟"

وحیدن ! یہ کیا کہتی ہو ؟ تم جیسی خوبصورت لڑکی سے شادی کرنے سے کون انکار کرسکتا ہے تم تو وہ حسین چاند ہو کہ اپنی ٹھنڈی چاندنی سے اپنے دولہا کی زندگی کو تابناک بنا دوگی ، اور تمہارے دم سے شوہر کے آنگن میں مسرت کے پھول کھل اٹھیں گے ۔"

میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا ۔ لیکن مسکرانے کی بجائے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا ۔

"آپ نہیں جانتے ؟ میں بہت بری ہوں ! میں شاعری کرتی ہوں اور فلمی گیت گنگناتی ہوں ؛ اس لئے محلہ والے سمجھتے ہیں کہ میں بہت بری لڑکی ہوں اور اس لئے وہ ہمیشہ یہی کوشش کرتے ہیں کہ کہیں میرا رشتہ نہ طے ہو سکے ، اور کبھی اس گھر سے میری ڈولی نہ نکلے اور میں اسطرح ان کی آنکھوں کی پیاس بجھاتی رہوں ۔

وحیدن کے اس المیہ سے مجھے بے حد صدمہ پہنچا ۔ میں نے اس کے زخموں پر پھاہا رکھتے ہوئے کہا ۔

"وحیدن ! زندگی جہد مسلسل کا نام ہے ، زندگی کی تیز دھوپ سے ہمت ہار کر بیٹھ جانے والا کبھی اپنی منزل نہیں پا سکتا ۔ اگر ہنستی کھیلتی زندگی چاہتی ہو ، تو مایوسیوں کو چھوڑ کر ایک نئے عزم کے ساتھ تمہیں منزل کی طرف بڑھنا ہوگا ۔

"حیدر صاحب ! آپ ــــ"

وحیدن نے کہنا چاہا ۔ لیکن اس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے ۔ اور وہ عجیب انداز سے میری طرف دیکھنے لگی ۔ وحیدن کی یہ ادا دیکھ کر میرا دل دھڑک اٹھا ۔ اور میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا

"وحیدن ! اب جاؤ مجھے آرام کرنے دو ۔"

اور وہ جاتے ہوئے مڑ مڑ کر میری طرف دیکھتی رہی ۔

ایک دن جب میں دفتر سے آیا تو دیکھا وحیدن میرے کمرے کا فرش صاف کر رہی ہے ــــ

میں نے اس سے کہا ۔
" وحیدن! مجھے شرمندہ نہ کرو ۔ تمہارے اوپر میرا کوئی حق نہیں کہ تم سے کوئی خدمت لوں!"
" حمید صاحب! اسی بات کا تو افسوس ہے کہ آپ تک مجھے غیر سمجھتے ہیں ۔ میں خود ہی بے شرم کی طرح آپ کے کمرے میں گھسی رہتی ہوں!"
اس دن پہلی بار اس معصوم لڑکی نے میرے اوپر اپنے دل کا راز ظاہر کر دیا ۔ اور میں اس اظہار حقیقت پر سہم اٹھا ۔ میں نے دیکھا اس کا حسین چہرہ حیا کی سرخی میں ڈوبا ہوا تھا ۔ اور اس کی نیم وا آنکھوں سے ۔ ایک عجیب سی خواہش کا اظہار ہو رہا تھا ۔ اس کی اس سادگی پر میرا دل تڑپ اٹھا ۔ اور میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا ۔
" وحیدن! میں اس قابل نہیں کہ تمہارا حسین دامن تھام سکوں، میری زندگی شہناز کی امانت بن چکی ہے!"
" مبارک ہو "
وحیدن نے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا اور اس کی پلکوں پر آنسوؤں کے شفاف قطرے آکر لرزنے لگے ۔ میں نے اسے دلاسہ دینا چاہا لیکن اسی وقت اس کے گھر سے کسی نے اسے آواز دی اور وہ آنسو پونچھتی ہوئی آہستہ آہستہ میرے کمرے سے نکل گئی ۔
اس واقعہ کے بعد وہ کئی دنوں تک مجھ سے نہیں ملی ۔ لیکن جب میں دفتر چلا جاتا وہ میرا کمرہ صاف کر دیتی ۔ اس کی اس بے اعتنائی سے میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی ۔ حالانکہ وہ میری کوئی نہ تھی ۔ اور مجھے اس کے بارے میں سوچنے کا کوئی حق نہ تھا ۔ پھر بھی اس کے نہ ملنے سے میرا اضطراب بڑھتا گیا ۔
ایک دن میں دفتر سے کچھ جلدی چلا آیا اور جیسے ہی اپنے کمرے میں داخل ہوا دیکھا وحیدن دروازے کی طرف رخ کئے ہوئے کسی کا خط پڑھ رہی ہے ۔ آہٹ پاتے ہی اس نے خط چھپالیا اور اٹھ کر بھاگ جانا چاہا ۔ لیکن میں نے جلدی سے بڑھ کر غیر شعوری طور پر اس کی کلائی تھام لی اور اس کے ہاتھ سے خط چھین لیا ۔
یکایک وحیدن میرے سر سے اوپر اٹھے ہوئے ہاتھ سے خط لینے کے لئے زور کر اچھلی اور

اس کوشش میں وہ میرے سینے سے ٹکرا گئی اور مجھے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے بے خیالی میں کوئی برقی جھٹکا لگ گیا ہو، اور سارے جسم میں تیز سنسنی سی ہونے لگی۔ میں نے دیکھا وحیدن کا گلابی چہرہ اس جلد جلد سے سرخ ہو گیا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں نشہ سا چھا گیا تھا۔ اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی، جس سے اس کے سینے کا تموج اور حسین اور جذبات انگیز ہو گیا یہ دیکھ کر میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ اور جذبات سے بیخود ہو کر اس کا آنچل تھام لیا۔

اسی وقت اس کی ماں اچانک میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری نظروں کے سامنے بجلی کوند گئی ہو۔

"تم فوراً میرا مکان خالی کر دو۔ تم جیسے ذلیل اور کمینے آدمی کی یہاں ضرورت نہیں!"

وحیدن کی ماں نے میرے اوپر اپنی تمام نفرت انڈیلتے ہوئے کہا اور اسے گھسیٹتی ہوئی کمرے سے لے گئی۔ میں حیران اور ششدر رہ گیا۔ شدید ندامت کے بوجھ سے میرا دل جا رہا تھا۔ اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے منہ پر کسی نے تھوک دیا ہو۔ لیکن جو کچھ ہوا غیر اختیاری طور پر اس میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہ تھا۔ اگر میرے ارادے میں کوئی کمزوری ہوتی تو میں بہت پہلے وحیدن کی اس پیاس کو بجھا دیتا جو اس کی آنکھوں میں جھلکتی رہتی تھی اور جو اس کا ماحصل ہو کر عمر کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے وحیدن کی مجبوریوں کا شدید احساس تھا اگر میں تہنا زر کے ہاتھ نہ تھام چکا ہوتا تو وحیدن کو ضرور اپنا لیتا۔ لیکن حالات نے ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔ جہاں سے مڑ کر دوسری عورت کی طرف دیکھنا بھی گناہ تھا۔ میں بے بس نڈھال سا ہو کر کرسی پر گر پڑا۔ اسی وقت میری نظر وحید اللہ کے خط پر پڑی جو میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا تھا۔ میں نے جلدی سے جھک کر خط اٹھا لیا اور بے تابی سے دیکھنے لگا۔ لکھا تھا

وحیدن صاحبہ!

دور کی ملاقات سے جی بھر گیا۔ اب صبر نہیں ہوتا۔ جب چاند مغرب کی طرف جھکنے لگے گا تو میں آپ کی کھڑکی کے نیچے آ جاؤں گا اگر آج بھی آپ نے التفات سے محروم رکھا تو میں زہر کھا کر ہمیشہ کیلئے اس نامراد زندگی کا خاتمہ کر ڈالوں گا۔

آپ کا دیوانہ — ۔ س

خط پڑھ کر ایک انجانے خوف کا احساس ہوا۔ رات کی تاریکی میں اس طرح کا کھیل کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ میں اس بات سے واقف تھا۔ اس لئے میں نے تہیہ کر لیا کہ رات ڈھلتے ہی وحیدن کے اس دیوانے سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ اور اسے سمجھاؤں گا کہ چوری چھپے اس طرح کا کھیل کھیلنے کی بجائے وہ وحیدن جیسی خوبصورت اور سگھڑ لڑکی سے شادی کر لے۔

اس خیال کے ساتھ ہی مجھے تھوڑے سکون محسوس ہوا اور میں کمر سیدھی کرنے کے لئے چارپائی پر لیٹ گیا اور پھر اس وقت آنکھیں کھلیں جب کوئی بے تحاشہ زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔ میں ایکا ایک خوف سے کانپ اٹھا اور ہمت کر کے سوئچ دبا دیا۔ کمرے میں ساٹھ پاور کی روشنی پھیل اور اس روشنی میں مجھے کھڑکی میں وحیدن کی ماں کا چہرہ نظر آیا جو غصہ اور نفرت سے سرخ ہو رہا تھا

"آپ! ؟" میں نے حیرت سے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ذلیل! تیری یہ ہمت ؛ دروازہ کھول ابھی تیرے کمینے پن کا مزہ چکھاتی ہوں ۔!"

وحیدن کی بوڑھی ماں نے غصہ سے کانپتے ہوئے کہا۔ اور میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرت سے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی وحیدن کا بڑا بھائی بڑی لاٹھی لئے ہوئے دندناتا ہوا کمرے میں گھس آیا۔ اور آتے ہی میری قمیص کا کالر تھام لیا۔ میری آنکھیں خوف سے بند ہو گئیں۔

"وحیدن کہاں ہے !؟"

اس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا اور دوسرے ہی لمحے 'استغفار' کہہ کر کالر چھوڑ دیا۔

میں نے ہمت کر کے آنکھیں کھول دیں۔

وحیدن کی ماں کے ہاتھ سے چپل چھوٹ کر فرش پر گر پڑی اور دونوں ماں بیٹے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے۔ کمرے سے نکل گئے۔ ان کے چہرے بالکل زرد اور ویران نظر آ رہے تھے

صبح دفتر جاتے وقت میں نے دیکھا، وحیدن کے گھر کے سامنے چائے خانے میں لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

کسی نے کہا ۔

"وحیدن آوارہ سلیم کے ساتھ بھاگ گئی !"

"جوان لڑکی کو گھر میں بٹھا کر رکھنے کا انجام اور کیا ہو سکتا تھا!!"
چائے خانے کے دوسرے کونے سے آواز آئی اور یکایک مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا وحیدن چلی گئی۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ اپنے جوان جسم کی خوشبو یہیں چھوڑ گئی ہے اور چائے خانے میں بیٹھے ہوئے بیکار لوگوں کو ایک دلچسپ موضوع مل گیا ہے



ڈاکٹر [illegible] بھاگلپوری

خیراتی ہسپتال

"یہ خیراتی ہسپتال ہے، یہاں روپیہ پیسہ دے کر علاج کرانا منع ہے!"
ہسپتال کی دیوار پر آویزاں ہندی میں لکھے ہوئے اس بورڈ کو اس نے پڑھا اور آہستہ سے مسکرا دیا۔ اس کی اس مسکراہٹ سے پورا طنز ظاہر ہو رہا تھا۔

"ارے! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ خیریت تو ہے؟"

اس اچانک آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ مڑا۔ اس کا دوست پرکاش اس کی جانب بڑھا چلا آ رہا تھا

"کہو کیسے ہو؟ ہسپتال کیسے آنا ہوا؟ کیا کوئی بیمار ہے؟" پرکاش نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے پھر پوچھا۔

"بیمار ——— بیمار تو کوئی نہیں ہے، لیکن تھا ضرور!" اس نے سرد آہ کے ساتھ کہا۔

"کیا مطلب؟!"

"مطلب اس بورڈ سے پوچھو۔ شاید یہ کچھ بتا سکے!" اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

"بھلا بورڈ کسی کو کیا بتا سکتا ہے!" پرکاش نے ایک نظر بورڈ پر ڈالی۔ "یہ تو محض ایک بورڈ ہے"

"تم غلط سمجھ رہے ہو پرکاش! یہ محض ایک بورڈ ہی نہیں ہے، یہ میری کہانی کا ترجمان ہے میری کہانی ——— میری شریک حیات کی کہانی ——— اور اس ننھے سے وجود کی کہانی، جو اس دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ہی دوسری دنیا میں پہنچ گیا ——— اور ——— جس نے مجھے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بے سہارا کر دیا ——— مجھ سے میرا چین اور سکون چھین لیا۔ میری زندگی کی ساری بہاروں کو نذر خزاں کر دیا ہے پرکاش! ———

پرکاش! تم اسے غور سے دیکھو تو اس میں میری پوری کہانی پڑھ لوگے۔ اس چھوٹے سے بورڈ میں۔"
اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلنے کیلئے بے تاب ہو رہے تھے جنہیں وہ ضبط کرکے روکے
ہوئے تھا۔

"تم بہت پریشان ہو دوست! آؤ میرے ساتھ چلو۔" پرکاش نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ
میں لے کے چلنا چاہا۔

"لیکن کہاں؟"

"شہر سے باہر ندی کی طرف۔ وہاں تمہیں کچھ سکون مل جائے گا۔ اور میں تمہاری کہانی بھی تمہاری
ہی زبانی سن سکوں گا۔ دل کی بات کسی سے کہہ لینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔" پرکاش اس
کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے چلنے لگا۔ اس نے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی اور پرکاش کے ساتھ ہو لیا۔
جون کا ڈھلتا سورج جلتے درختوں، تپتی سڑکوں، جھلستے پودوں اور گرمی سے پریشان حال لوگوں
کو سکون و اطمینان کا پیغام دیتا خود کسی گوشے میں چھپا جا رہا تھا۔ سڑکوں پر چہل پہل بڑھنے لگی تھی
جگہ جگہ مالی کیاریوں کو سینچ رہا تھا۔ پھولوں کی کیاریوں سے اڑتی ہوئی سوندھی سوندھی خوشبو
دن بھر کے پریشان حال لوگوں کو مسرت بخشنے لگی تھی ——— اور دن بھر کے جھلسے ہوئے پودے
دوبارہ جیون پا کے پھر اپنی بہاریں لٹانے لگے تھے۔

وہ پرکاش کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا ——— پانی سے بھیگی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو
سے بے نیاز ——— پھولوں کی بہاروں اور مسرت بخش خوشبوؤں سے بے خبر۔ دونوں برابر قدم
ملائے چل رہے تھے، لیکن خاموش خاموش سے وہ اپنی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور پرکاش اس
کی الجھن بھری کہانی کا کلائمکس اپنے ذہن میں کرید رہا تھا۔ دونوں چلتے ہوئے شہر سے دور جھیل
وہ ندی کنارے آگئے ——— اور شمشان گھاٹ کے نزدیک پتھر کی چٹان پر بیٹھ گئے۔ ہر چند
کہ پرکاش شمشان گھاٹ سے اتنا قریب بیٹھنے کیلئے تیار نہیں تھا۔ لیکن اپنے دوست کی ضد
کے آگے اس کی ایک نہ چلی اور وہ مجبور ہو کے بیٹھ گیا تھا۔

دونوں خاموش سے تھے وہ شمشان گھاٹ کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھے جا رہا تھا۔ اور
پرکاش ہاتھ میں کنکر اٹھا کے پانی کی خاموشی اور سطح پر پھینکتا، اس دائرے میں جو لکڑ کے

پانی پر گرنے سے بن رہا تھا، اس کی کہانی پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر اسی طرح گذری۔
پھر اس موت کی سی خاموشی سے اکتا کر پرکاش ہی نے پھر سکوت توڑی ـــــ
"ہاں! تو تم نے بتلایا نہیں کہ واقعہ کیا ہے؟"
"اگر میں اپنی کہانی تمہیں سنا دوں تو جیسا کہ تم نے کہا ہے، کیا میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا؟" اس نے پوچھا۔
"بے شک"
"تو ٹھہرو! دل کا بوجھ ہلکا کر لینے کے لئے پہلے اپنا دھڑکتا ہوا کلیجہ تو تھام لینے دو۔" اس نے ایک سرد آہ بھری اور پرکاش خاموشی سے اس کا منھ تکنے لگا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں اور ہونٹ لرزنے لگے ـــ لیکن ـــ لیکن اس نے اپنی آنکھوں میں آنے ہوئے ان آنسوؤں کو بہہ جانے دو دوست! ان کی گرمی میں کیوں سُلگ رہے ہو! جب تک یہ آنسو بہہ نہیں جائیں گے تم اپنے دھڑکتے ہوئے کلیجہ کو نہیں تھام سکتے!!"
پرکاش کے ان ہمدردانہ جملوں کا اثر اس کے دل کی گہرائیوں تک پہنچ گیا۔ اور اس کی آنکھوں میں رکے ہوئے آنسو اس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔ ہونٹوں میں لرزش ہوئی اور وہ سسکنے لگا۔ پرکاش نے اٹھ کے اسے اپنے سینہ سے لگا لیا اور تھپکیاں دیتے ہوئے صبر کی تلقین کرنے لگا۔ کچھ دیر اسی طرح وہ پرکاش کے سینہ سے لگا سسکتا رہا ـــ بلکتا رہا۔ پھر آنسوؤں کو خشک کیا۔ اور پاس کی چٹان پر بیٹھ گیا۔
سورج ڈوب چکا تھا۔ اس کی تمازت ختم ہو چکی تھی۔ گیارہویں کے چاند میں ملاحت دھیا لئے ہلکی ہلکی روشنی آنے لگی تھی۔ اس نے ایک غائر نگاہ چاند پر ڈالی اور پھر پرکاش کی طرف مڑتے ہوئے کہنے لگا۔
"اسی چاند کی گواہی میں ہمارا پیار پروان چڑھا تھا پرکاش!"
"لیکن تم چاند کی باتیں کیوں کرنے لگے؟" پرکاش نے حیرت سے پوچھا۔
"میں چاند کی باتیں کر رہا ہوں! ـــــ نہیں تو۔ ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ اسی چاند کو گواہ بنا کر ہمارا پیار پروان چڑھا تھا۔ ساوتری کو تو تم ضرور جانتے ہوگے ـــ اور جانو گے کیوں نہیں،

ہماری شادی میں تم بھی تو شریک تھے ـــــ ساوتری صرف میری ہی نگاہوں میں نہیں، دنیا کی نگاہوں میں فطرت کا حسین اور معصوم مجسمہ تھی۔ وہ قدرت کا حسین بے مثال شاہکار تھی ـــــ اور میں وہ خوش نصیب تھا جسے قدرت کا وہ شاہکار ملا تھا۔ میں اس پر ہزار جان سے فریفتہ تھا اور وہ ـــــ جیسا اس کا ظاہر معصوم اور حسین تھا۔ اسی طرح اس کا باطن خوبصورت تھا۔ اس کی چاہت میں سچائی تھی۔ اور خلوص تھا۔ اُسے میرے ساتھ فاقے سہنے پڑے پھر بھی خوش رہتی تھی ـــــ حد سے زیادہ خوش! وہ ہر حال میں اپنی ساری خوشیاں مجھ پر نچھاور کئے رہتی تھی۔ اکثر ہم گھنٹوں اسی چاند کی نرم و گداز اور سبک چاندنی میں بیٹھے خوش گپیوں میں کھو جاتے۔ اسی چاند کی دلنواز، خوبصورت دودھیا چاندنی میں ہم لوگوں نے پیار کی قسمیں کھائی تھیں اور کبھی ساتھ نہ چھوڑنے کے وعدے کئے تھے۔ ہاں! اسی چاند کو گواہ بنا کر ہمارا پیار پروان چڑھا تھا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد ہم نے شادی رچالی۔ وہ دلہن بن کر کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن تم سے کیا کہنا ـــــ تم نے بھی تو اسے دیکھ کے مجھ سے کہا تھا۔ "چودھویں کا چاند ہے، تمہاری دلہن!" اور اب ـــــ اور اب وہ چاند ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھیانک کالی گھٹاؤں کے پیچھے چھپ گیا ہے۔ اب میں اس کی چاندنی سے کبھی لطف اندوز نہیں ہو سکوں گا۔" پرکاش نے دیکھا، وہ پھر سسکیاں بھرنے لگا تھا۔

"تو کیا ساوتری مر گئی؟" پرکاش کے سوال میں حیرت و استعجاب تھا۔

"ہاں مر گئی! ـــــ نہیں، بلکہ مار دی گئی!" اس کے چہرہ پر غصہ کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔

"آخر واقعہ کیا ہے؟ ذرا تفصیل سے بتاؤ۔"

"بتا رہا ہوں ـــــ سنتا ہی ہوگا۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ تقریباً چھ ساڑھے چھ مہینہ پہلے کی بات ہے، میں آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اچانک ساوتری میرے کمرہ میں تبسم دکھاتی داخل ہوگئی اور جب میں نے اُسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ اس وقت بے حد حسین معلوم ہو رہی تھی۔ اتنی حسین اتنی حسین کہ اس کی وضاحت کیلئے دنیا کی کسی بھی زبان میں اتنے حسین الفاظ نہیں مل سکتے تھے جو حقیقت کے عکاس ہوتے۔ میں بھونچکا سا رہ گیا۔ اچانک مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے بڑھ کے اسے اپنی آغوش میں لے لیا ـــــ اور وہ پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح میری آغوش سے نکل گئی اور بولی۔

تم بے حد خوش ہو؟" آنند پرکاش! میں کیا بتاؤں اس کی اس ادا میں کتنی دلکشی اور کشش تھی!! میں اس کی ا
ادا سے بے خود ہو جایا کرتا تھا۔ وہ اس وقت اور بھی خوبصورت اور حسین معلوم ہونے لگی تھی۔ اس کے
رخسار پر ایک عجیب سرخی دوڑ گئی تھی۔ میں نے بے تاب ہو کے پوچھا۔ "کیوں؟" اور وہ اپنے
آنچل کا کونہ انگلی میں لئے اور انگلی منہ میں دبائے نیچی نگاہ کئے مسکرانے لگی جب میں نے مزید
اصرار کیا تھا تو اس نے دیوار پر لگے ہوئے ڈابر کے کلینڈر کی طرف اشارہ کیا میں نے دیکھا، را
دشینت کی بیوی شکنتلا اپنے نوزائیدہ بچے بھرت کو اپنے پہلو میں لئے بیٹھی تھی پھر جب م
نے دوبارہ ساوتری کی جانب دیکھا تو وہ ایک ادا سے مسکرا دی اور اس کی خوبصورت بڑی بڑی
آنکھوں میں خوشی پھیل گئی۔ مجھ پر جیسے نشہ طاری ہو گیا۔ اور میں نے بڑھ کے اسے اپنے سینہ سے چمٹا
ہوئے زمین سے اوپر اٹھا لیا۔ "اوہ مائی ڈیر ساوتری! کیا سچ مچ ....؟" اور اس نے ا
آپ کو مجھ سے چھڑاتے ہوئے "ہوں" کہا اور بھاگ کر دوسرے کمرہ میں چلی گئی۔ اس دن
ہماری خوشیاں عروج کو پہنچ گئیں۔ اب روز سویرے جاگتے ہی ہماری نگاہیں اس کلینڈر
جم جاتیں۔ اور میں ہر گذری ہوئی تاریخ پر نشان لگا دیتا۔ اس وقت وہ تین مہینے پورے کر
اب وہ بہت مشغول رہنے لگی تھی کبھی ننھے ننھے موزے بنتی، کبھی چھوٹے چھوٹے
بستر سینے لگتی اور کبھی چھوٹا سا سوئٹر بننے لگتی تھی، اور رک رک کے انہیں الٹ پلٹ کر
بغور دیکھتی ـــــ اور پھر آپ ہی آپ ایک دلنواز مسکراہٹ اس کے لبوں پر آجاتی۔
بھی اس درمیان میں کئی چیزیں خرید خرید کے جمع کر رکھی تھیں ـــ ریل گاڑی، موٹر گاڑی گھوڑا
موٹر سائیکل اور گھوڑے۔ طرح طرح کے بڑے کھلونے اور طرح طرح کے چھوٹے کھلونے
پلانے کیلئے فیڈر اور روتے ہوئے بچے کو چپ کرنے اور دل بہلانے کیلئے سوودر۔

اور ـــــ

اور پھر وہ وقت آگیا، جب ساوتری کو پہلی بار درد زہ اٹھا۔ درد کی شدت سے
کانپ کانپ گئی، پسینہ پسینہ ہو گئی، پھر بھی اس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ کھیل
تھی۔ اس کے اس درد کی شدت کے احساس سے میرا رُواں رُواں کانپ گیا اور پورے
جسم میں لرزش ہونے لگی لیکن وہ فولاد کی چٹان کی طرح سب کچھ برداشت کر رہی تھی اور

میں نے اسے ہمدردی جتائی تو اس نے اپنے مخصوص انداز سے مسکراتے ہوئے جواب دیا ــــــ
"درد ابھی میں برداشت کر رہی ہوں، وہی بعد میں ہمارے لئے ہماری اولاد کے دل میں ہوگا۔
اور اگر ابھی یہ درد برداشت نہ کر کے چیخنے چلانے لگوں، تو؟ گوارا نہ کرے، میرا لعل بے درد
ہو جائے گا!" اُف کتنی بلند تھی وہ! میں اس کی عظمت کا قائل ہو گیا۔ اس کا درد بڑھتا ہی گیا پھر درد کی
شدت سے وہ بے ہوش ہو گئی۔ اور میں گھبرا گیا۔ میں جلدی سے شہر کی لیڈی ڈاکٹر کو بلا لایا۔
اس نے ساوتری کا بغور معائنہ کیا اور کہا ــــــ
"بچہ بغیر آپریشن کرائے نہیں ہو سکتا ــــــ اور آپریشن میں پانچ سو روپے خرچ ہوں گے
جی"! میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اور میری نگاہیں لیڈی ڈاکٹر کے چہرہ پر
مرکوز ہو کے رہ گئیں۔
"جی کیا! دیر نہ کرو۔ اس کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔" مجھے ایسا محسوس ہوا،
جیسے کسی نے میرے سر پر وزنی ہتھوڑا دے مارا ہو۔
"لیکن پانچ سو روپے آئیں گے کہاں سے"۔ میں بالکل بوکھلا گیا۔
"تو پھر اسے خیراتی ہسپتال لے جاؤ۔ لیڈی ڈاکٹر نے اپنا فیصلہ سنایا، اپنی فیس کے
روپے لئے اور واپس چلی گئی۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ لیکن وہ وقت
رونے کا نہیں تھا۔ جلد از جلد خیراتی ہسپتال پہنچ جانے کے خیال سے میں نے ایک ٹیکسی لیا
اور ساوتری کو لے کر ہسپتال پہنچ گیا۔ ہسپتال کی لیڈی ڈاکٹر نے اُسے دیکھا اور پھر اپنا فیصلہ
سنا کے چلی گئی کہ آپریشن کرانا ہوگا۔ اور آپریشن وہ نہیں کرے گی، مرد ڈاکٹر کریں گے۔ ڈاکٹر
اپنے کوارٹر میں تھے میں وہاں سے انہیں بلا لایا۔ وہ آئے، ساوتری کا معائنہ کیا اور مجھ
سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے ــــــ آپریشن کرانا ہوگا۔ اور اس کیلئے مجھے تین سو روپے خرچ
کرنے ہوں گے۔ میرا دماغ چکرا گیا میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی اور ڈاکٹر کا چہرہ میری
آنکھوں کے گرد تیزی سے چکر کاٹتا محسوس ہونے لگا۔

میں نے کہنا چاہا ــــــ "یہ تو خیراتی ہسپتال ہے، پھر روپیوں کا سوال کیوں؟" لیکن الفاظ
میرے حلق تک آ کے اٹک سے گئے۔ میں ان الفاظ کو اپنی زبان سے ادا نہ کر سکا۔ اور غیر ارادی

طور پر میرے منہ سے نکل گیا —— کیا ابھی؟" اور ڈاکٹر نے برجستہ جواب دیا —— بالکل!
بلکہ ۲۵ روپے اور لگیں گے۔ دواؤں کیلئے" مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرا سارا وجود ہوا میں تحلیل
ہوتا جا رہا ہے۔ اور میں اوپر اٹھا جا رہا ہوں۔ فوری طور پر ساوتری کو کچھ دوائیں اور انجکشن دے
دیئے گئے۔ اور میں اسے وہیں چھوڑ کے روپیوں کے بندوبست کیلئے نکل گیا۔ دوستوں
سے ادھار مانگے، لیکن اتنی بڑی رقم دینے کیلئے کوئی بھی تیار نہیں ہو سکا۔ یہاں پردیس
میں اپنے بیگانے کہاں تھے۔ اس وقت مجھ پر کیا کچھ گذری ہے۔ اس کا اندازہ تم نہیں
کر سکتے —— شاید کوئی بھی نہیں کر سکتا ہے۔ میں نے اتنی عمر میں اس وقت پہلی بار اپنے آپ
کو اتنا کمزور، بے بس اور مجبور محسوس کیا تھا۔ لیکن کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اس وقت میری بے بسی
کا سہارا ہو سکتا۔ یہاں تک کہ قدرت نے بھی منہ موڑ لیا تھا۔ منہ موڑنا کیا میں تو کہوں گا۔
قدرت ظلم ڈھانے لگی تھی —— اور ظاہر ہے، جب قدرت ظلم پر آمادہ ہو جائے
تو دنیا کی کوئی ہستی مظلوم کو نجات نہیں دلا سکتی۔ وہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔ آخر میں نے مجبور
ہو کے اپنا ڈرائی بیٹری سیٹ ریڈیو اور ساوتری کی دستی سلائی مشین کو رہن رکھ دینا چاہا
لیکن افسوس ان کے لئے بھی کوئی تیار نہیں ہوا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی، ڈیڑھ گھنٹے بیت
چکے تھے۔ میں گھبرا گیا اور —— اور پھر مرتا کیا نہ کرتا، میں نے ان دونوں چیزوں کو صرف تین
سو روپے میں بیچ دیا۔ اور بھاگا بھاگا ہسپتال پہنچا۔ تین سو روپے ڈاکٹر کے ہاتھ میں دے
دیئے۔ انہوں نے روپے لئے اور ساوتری کو آپریشن تھیٹر میں منگوا لیا۔ آپریشن کی تیاریاں
ہونے لگیں اور جب تیاریاں ہو چکیں تو ڈاکٹر نے مجھ سے کہا کہ کیس سیریس ہے اس
لئے یا تو ساوتری بچ سکتی ہے۔ یا پھر بچہ! میرا دماغ سن ہو گیا۔ اور انہوں نے فیصلہ مجھ پر
چھوڑ دیا۔ میں کشمکش میں پڑ گیا کہ کیا فیصلہ کروں! میں نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا کہ ——
"مجھے دونوں کی ضرورت ہے، مجھے دونوں ہی چاہئیں" ڈاکٹر نے کہا کوشش کروں گا"
اور ایک نسخہ دیا کہ میں یہ دوائیں بازار سے خرید لاؤں۔ ادھر ساوتری کا آپریشن ہو رہا تھا
اور ادھر میں دوائیں خریدنے بازار جا رہا تھا۔ شہر کی لیڈی ڈاکٹر اور ٹیکسی کا کرایہ ادا کر دینے کے
بعد کے بچے ہوئے ۲۵ روپیوں میں سے دواؤں کی قیمت ۲۴ روپے [illegible] پیسے ادا کئے

اور جلدی سے ہسپتال پہنچ گیا۔

آپریشن ہو چکا تھا بچہ نہیں بچ سکا تھا ـــــ مجھے محسوس ہوا کسی نے میرے کلیجہ پر گھونسہ لگا دیا ہو۔ اور قریب تھا کہ میں بے ہوش ہو جاتا کہ اچانک ساوتری کی مردہ سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں اس کی طرف جھک گیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے سہلانے لگا وہ اس وقت اس قابل نہیں تھی کہ آنکھیں کھول سکتی۔ لیکن اس کے ہاتھوں نے میرے ہاتھ کے لمس کو محسوس ضرور کیا اور وہ قدرے مطمئن ہو گئی ـــــ رفتہ رفتہ اسے ہوش آنے لگا تھا۔ ڈاکٹر نے نرس کو ضروری ہدایتیں دیں اور خود چلے گئے۔ ڈاکٹر کی حسب ہدایت ساوتری کو میرے خریدے ہوئے انجکشن میں سے ایک اسی وقت لگ جانا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ نرس انجکشن لگاتی اس نے اپنا ہاتھ میرے سامنے پھیلا ہوا تھا ـــ میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ اور اس نے تقریباً مجھے ڈانٹ دیا ـــ "منہ کیا تکتے ہو؟ محنت میں نے بھی کی ہے!" لیکن میں نے دو روپئے ڈاکٹر...

..... میں اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ وہ بگڑ گئی ـــــ یہ بھی کیا خیراتی ہسپتال ہے، جہاں قدم قدم پر روپیے کی بات ہوتی ہے لیکن یہ وقت سوچنے کا نہیں تھا میرے سامنے ساوتری نیم مردہ حالت میں پڑی تھی۔ میں ڈاکٹر کے کوارٹر کی طرف دوڑا۔ وہ کلب جا چکے تھے۔ ناچار ہسپتال سے نکلا اور اپنی سو روپیوں کی رسٹ واچ صرف تیس روپے میں فروخت کر دی۔ یوں مجھے اس گھڑی کی قیمت دو روپئے سے تین گنا مل سکتی تھی لیکن مجبوری انسان سے کیا کچھ نہیں کرواتی۔

ان روپیوں کو لے کر میں پھر ہسپتال آیا۔ بڑی آرزو منت کے باوجود نرس نے پورے کے پورے تیس لے لئے اور تب انجکشن لگایا۔ ایک گھنٹہ بعد اس نرس کی ڈیوٹی ختم ہو گئی اور اس کی جگہ دوسری آ گئی۔

اچانک ساوتری کے چہرہ کا رنگ بدلنے لگا ـــ زرد ـــ اور زرد ـــ پھر سیاہ ـــ خوفناک حد تک سیاہ! میرے منہ سے ایک دہشتناک چیخ نکل گئی اور نرس نے جو قریب ہی کرسی پر بیٹھی کسی ناول کے مطالعہ میں غرق تھی مڑ کے میری جانب دیکھے بغیر ہی مجھے ڈانٹ دیا۔ کہ اس طرح میرے شور کرنے سے دوسرے مریضوں کو تکلیف ہوتی ہے اس لئے میں باہر چلا جاؤں۔ میں نے نرس کے قریب جا کے ساوتری کی پوری

(نوٹ ـ یہ مبالغہ ہے)

کیفیت اُسے بتائی اور ایک بار اسے دیکھ لینے کی التجا بھی کی ـــــ لیکن جانتے ہو، اس نے کیا
جواب دیا؟ بولی: "لاش مرچکی ہے، اب وہ نہیں دیکھ سکتی۔ ساوتری کو دکھانے کیلئے مجھے انہی لوگوں کو بتانا ہوگا جنہیں میں نے روپے دیئے
ہیں۔ ہم عین گیٹ پر کاش! اس وقت میرا جی چاہا کہ میں اس نرس کی گردن کا گلا گھونٹ دوں۔ لیکن میں
ایسا نہ کرسکا۔ میرے سامنے ساوتری کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ میں اس نرس کے کوارٹر کی طرف
دوڑا، جیسے میں نے روپے دیئے تھے۔ وہ کوارٹر میں نہیں تھی۔ میں نے ڈاکٹر کے یہاں دوڑا ـــــ وہ
اس وقت تک کلب سے واپس نہیں آئے تھے۔ میں پھر ڈیوٹی والی نرس کے پاس آیا اور اس
سے رحم کی بھیک مانگی ـــــ لیکن اس نے جو جواب دیا تم سنو گے تو کانپ جاؤ گے۔ اس نے
کہا، رحم کی بھیک وہ دیتے ہیں، جو بیوقوف ہوتے ہیں۔ اور وہ بے وقوف نہیں ہے۔ میں اس
کے پیر چھونے جھک ہی رہا تھا کہ ساوتری نے پاگل کی طرح مجھے پکارا اور اٹھ کے بیٹھ گئی۔ میں نے
دوڑ کے اسے سہارا دیتے ہوئے پھر لٹا دیا لیکن وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سو گئی ـــــ گہری نیند ـــــ میں
رونے گڑگڑانے لگا لیکن نرس جیسے بھڑک گئی۔ اس نے پہلے تو مجھے باہر نکل جانے کو کہا اور
جب میں نہیں نکلا تو باہر آ کے مہتروں کو آوازیں دینے لگی چند ہی منٹوں میں دو مہتر حاضر ہوگئے۔
وہ انہیں لاش باہر نکال دینے کا حکم دے کر پھر اپنی جگہ پر جاکے بیٹھ گئی۔
میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی نرس کو گھورتا رہا اور کبھی ان مہتروں کو۔ نرس ناول کے مطالعہ
میں غرق ہوگئی اور میری نگاہیں ساوتری کے مردہ جسم پر جم گئیں۔ آخر میں ان مہتروں میں سے ایک
نے مجھ سے پوچھا: "لاش باہر نکال دوں بابو"؟ اور میں نے دیکھا ان کی آنکھیں کہہ رہی ہیں ـــــ
لیکن اس کیلئے بھی پیسے دینے ہوں گے! میں نے آہستہ سے کہا "ہاں" اور پھر مجھے ایسا محسوس
ہوا جیسے ہسپتال کا سارا اسٹاف انسان نہیں، گدھ ہے ـــــ خوفناک گدھ! جو
ہسپتال کے احاطہ میں داخل ہونے زندہ انسانوں کو نوچ نوچ کھانے کیلئے بے تاب رہتا ہے
میرے کانوں سے اس مہتر کی آواز پھر ٹکرائی ـــــ چائے پان کیلئے آٹھ آٹھ آنے دینے
ہوں گے، بابو!" مجھے محسوس ہوا، اگر میں نے کچھ اور تاخیر کی تو وہ لوگ ساوتری کو اور مجھے
نوچ نوچ کر کھانے لگیں گے ـــــ اور میں نے جھپٹ کر ساوتری کی لاش کو اپنے کاندھے
پر اٹھا لیا اور اسی حالت میں اسے شمشان گھاٹ لے آیا۔ میں بہت ممنون ہوں اس گھاٹ والے

تاکہ اس نے اس وقت کے سارے انتظامات اپنی طرف سے کر دیئے۔" اس نے اپنا سر پھر دور خلا میں گھورنے لگا۔

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہوا جب کہ ہسپتال کے ضابطے بنے ہوئے ہیں۔ اور بہت ضابطے ہیں" پرکاش اس کا بیان سن کر حیرت زدہ ہو رہا تھا۔

"یہ درست ہے کہ ہسپتال کے ضابطے بنے لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ان ضابطوں کا ہسپتال کا کوئی بھی اسٹاف پابند نہیں ہے۔"

"یہ کتنے دنوں کی بات ہے؟" "صرف چار دن پہلے"

"تو پھر اب تم کس لئے ہسپتال جاتے ہو؟"

"میں ہر روز جاتا ہوں اور اس لئے کہ اس بورڈ میں اس کی حقیقت تلاش کر سکوں کہ خیراتی ہسپتال کے کیا معنی ہیں؟ وہاں جانے والے مریضوں کا علاج خیراتی طور پر ہوتا ہے یا وہاں کے اسٹاف ان مریضوں سے زبردستی خیرات وصول کرتے ہیں۔"

"خیر اس طرح کب تک جاتے رہو گے؟"

"جب تک اس بورڈ سے اس کی حقیقت نہ جان لوں۔" "لیکن اس سے فائدہ؟"

"میری تسلی ہو جائے گی۔" "پاگل ہو گئے ہو؟"

اگر مریض بن کر یا کسی مریض کو اپنے ساتھ لے کے وہاں جاؤ تو تم بھی پاگل ہو جاؤ گے۔

اس کے اس جواب پر پرکاش اچانک چونک سا گیا۔ اور ہسپتال کی دیوار پر آویزاں وہ بورڈ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ اور پھر پرکاش، جو اپنا ہرنیہ کا آپریشن کرانے کے خیال سے ہسپتال جا چکا تھا۔ اور وہاں سے اپنے دوست کے ساتھ، اس کی دلجوئی کے خیال سے اپنا کام کل پر ڈال کے، گھومنے چلا آیا تھا، نگاہیں نیچی کئے اس بورڈ پر لکھے ہوئے الفاظ کی حقیقت کی کھوج میں غرق ہو گیا۔ وہ بھی یہی سوچنے لگا۔ "یہ خیراتی ہسپتال خیراتی طور پر علاج کیلئے ہے یا وہاں کا اسٹاف جبریہ خیرات وصول کرنے کیلئے؟!" بہت دیر تک سوچتے رہنے کے بعد جب نگاہیں اوپر اٹھائیں تو اس کا دوست غائب تھا۔ اس کی پریشانی اور بڑھ گئی — اور جب اس نے اپنی نظریں ادھر ادھر دوڑائیں تو دیکھا، اس کا دوست شمشان گھاٹ کی طرف بڑھا جا رہا تھا — اور وہ بے تحاشہ چیخنے لگا "نہیں — یہ ظلم ہے۔ اندھیر ہے!! — یہ ظلم ہے!!!"

پردہ اُٹھنے کے بعد

نورا شادی

چندرا سے ملنے سے پہلے نرمل نے جب جب سنا کہ ایک لڑکی ایک لڑکے سے ملی اور پیار ہو گیا مہینوں سے کملا کی تنہائی اور محبت ہو گئی۔ کرشن چندر کی ناولوں سے ہیرو ہیروئن اور ریستورانوں کا کورٹ شپ مل جاتا ہے۔ اس کا ایک دوست نعیم سلمیٰ کو پڑھانے جاتا تھا۔ پڑھاتے پڑھاتے دل کا سودا کر بیٹھا۔ ان کے دفتر میں ایک ٹائپسٹ آتی تھی جس سے اس کا رومان لڑ گیا اور سریش نے روز بس میں آنے جانے والی لڑکی کو پھانسنے کے بعد من میں باندھ لیا۔ طالب علمی کے زمانے میں جب اس کے ساتھی کلاس کے دو دو گھنٹے چھوڑ کر اس لئے بھاگ جاتے کہ کسی اسکول کی لڑکی اس کا انتظار کر رہی ہوگی تو اسے بالکل یقین نہ تھا۔ اس کے ساتھی انسپکٹر ورما نے جب لتا کے بارے میں بتایا کہ لتا مسز اس کی ملاقات اب عشق کی حد میں داخل ہو رہی ہے۔ اور یہ محض ایک اتفاق تھا تو وہ سوچتا یہ سب غلط ہے یہ سب باتیں لوگ محض اپنی شان بڑھانے کیلئے کہتے ہیں۔ ان باتوں میں کچھ حقیقت ہے اسے کبھی یقین نہیں آتا کیونکہ نرمل کی زندگی کے ستائیس سال میں ایک بھی تو ایسا اتفاق نہیں آیا تھا کہ ستائیس بہاریں دیکھنے کے بعد بھی کسی لڑکی کی نظر کرم اس کی طرف نہ دی تھی۔ کہتے ہیں آج کل عورت ملنا آسان ہے اور نوکری ملنا مشکل! لیکن نرمل کو بی اے پاس ساڑھے تین سو روپے کی نوکری مل گئی تھی لیکن عورت شاید اس کی قسمت میں نہ تھی۔ وہ محبت کی شادی میں یقین رکھتا تھا بغیر پہلے سے پرکھے صرف صورت شکل اور لڑکی کے باپ کی دولت دیکھ کر شادی کرنا ٹھیک نہیں تھا اس لئے ماں کے کئی بار کہنے پر بھی اس نے اب تک شادی کیلئے اپنی رضامندی ظاہر نہیں کی تھی۔

لکھنؤ آکر بھی نرمل کے دوستوں کا دائرہ محدود تھا وہ دوستوں کے معاملے میں صرف دفتر کے ساتھیوں سے ہی رسم و راہ رکھتا تھا۔ اور وہ بھی صرف دفتر کے اوقات میں، شام کو گنج کی سیر البتہ

اس کا معمول تھا کبھی کبھی کافی ہاؤس میں بھی بیٹھ جایا کرتا تھا۔ یکجہتی تفریح کا ذریعہ ہے لیکن نرمل کو اس سے دلچسپی نہ تھی۔

اس دن کافی ہاؤس میں داخل ہوتے ہی ورما نے آواز دی۔

"ہلو نرمل ادھر آجاؤ!" اس نے اکیلا دیکھ کر بلایا تھا

نرمل نے دیکھا ورما کے ساتھ دو لڑکیاں اور ہیں تو پہلے وہ جھجکا لیکن ورما کے کہنے پر، ایک خالی جگہ پر بیٹھ گیا۔

"آپ ہیں ہماری فرینڈ مس لتا، یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں۔ آپ مسٹر نرمل کمار۔ میرے ساتھی انسپکٹر!"

ورما نے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ لتا نے جب ہاتھ ملانے کے لئے نا جانے طور پر نہ چاہتے ہوئے بھی نرمل کا ہاتھ بڑھ گیا۔ ہاتھ ملاتے ہوئے لتا نے کہا "سو گلیڈ ٹو میٹ یو" لیکن نرمل اتنا سراسیمہ ہوا کہ وہ کچھ بھی جواب میں نہ کہہ سکا اور ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ لا کر رہ گیا۔

"آپ ہیں مس چندرا لتا کی سہیلی!" اب ورما نے نرمل کے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی سے تعارف کرایا۔ چندرا نے تقریباً شرماتے ہوئے لجائی آواز میں کہا "مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی"

"مجھے بھی" نرمل بمشکل اتنا کہہ سکا۔

نرمل نے کولڈ کافی کا آرڈر دیا۔ کافی آگئی اور باتیں شروع ہو گئیں۔ نرمل نے محسوس کیا چندرا بہت ہی کم گو لڑکی ہے۔ وہ صرف ہوں ہاں اور جی کہہ کر ہی رہ جاتی تھی۔ اور تقریباً یہی حالت نرمل کی بھی تھی۔ ورما اور مس لتا ہی زیادہ باتیں کر رہے تھے۔ یہ دونوں صرف ان دونوں کا ساتھ دے رہے تھے۔

"بھئی نرمل تم اتنے خاموش کیوں ہو" ورما نے کہا۔

"میں آپ لوگوں کی باتوں کا لطف لے رہا ہوں" نرمل نے کہا۔ وہ دراصل چندرا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مس چندرا۔

ورما کا انتخاب قابل داد تھا لیکن چندرا بھی کم حسین نہ تھی، شہابی رنگ گلابی چہرہ

ہونٹ شبنمیوں کی طرح مسکراہٹ لئے ہوئے بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے اس پر چمکیلے گھنے بال اور بھی قیامت ڈھا رہے تھے۔ وہ خاموش تھی لیکن اس کا انگ انگ بول رہا تھا نرمل نظر بھر کر دیکھنا چاہتا تھا لیکن دیکھ نہ سکا پل بھر کیلئے اس کی نگاہیں چندرا کے چہرے کا جائزہ لیتیں اور دوسرے ہی لمحہ ہٹ جاتیں

جب رات گئے گھر پہنچا تو ایک ایک بات چندرا کی ایک ایک ادا اور دلفریب مسکراہٹ یاد آ آ کر اس کی نیند اڑا لے گئی صبح اٹھا تو اس کی آنکھیں خمار آلود تھیں۔

نرمل کو بالکل توقع نہ تھی کہ چند ہی ملاقاتوں میں چندرا اس کے قریب آجائے گی ہوا یہ کہ جو چنگاری نرمل چندرا کے دلوں میں پیدا ہوگئی تھی اسے لتا ہوا دیکر شعلوں میں تبدیل کر رہی تھی دوسری بار جب نرمل ملا تو چندرا اور لتا اکیلے ہی تھیں اس دن بھی لتا ہی بولتی رہی وہ بولی بھی تھی۔ وہ ساری باتیں جو چندرا سے سننا چاہتا تھا۔ لتا ہی کہہ رہی تھی۔

"آپ کی ان نظروں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ کہیں بیچاری چندرا دھوکے میں نہ آجائے آپ بولتی بہت ہیں۔" نرمل صرف اتنا کہہ کر رہ گیا۔

لتا کا اس طرح کی باتیں کہنا اور نرمل کا جھینپ کر مسکرانا ہی اس بات کو ثابت کرتا تھا کہ دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لئے جگہ تھی۔ ایک دن تو لتا نے حد ہی کر دی۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے چندرا کے رشتہ سے نرمل کو جیجا جی کہہ دیا۔ چندرا کے گالوں پر حیا کی ایک سرخ لکیر پھیل گئی تھی، حالانکہ نرمل کے من میں بھی لڈو پھوٹنے لگے تھے لیکن وہ اپنی ساری سنجیدگی چہرے پر سمیٹ کر بولا۔

"مس لتا یہ رشتے ایسے نہیں ہوتے کہ راہ چلتے جوڑ لئے جائیں کون جانے چندرا کے دل میں کیا ہو ــــ تم نے ایسی بات کہدی"

"چندرا کو کیوں دوش دیتے ہو اپنے دل میں جھانک کر دیکھو!" لتا نے کہا

نرمل زیادہ سنجیدہ نہ رہ سکا اور ہنستے ہوئے بولا

"تم سے تو بات کرنا مشکل ہے!"

اس دن جب وہ گھر آیا تو اس کے دل میں گدگدی سی اٹھ رہی تھی وہ سوچ رہا تھا کہ جیسے

اس لئے اتنا مشکل کام سمجھا تھا وہ سب تنی طبعی کیسے ہو گیا؟ شاید اس طرح کی کہانی کوئی پہلے سناتا تو وہ اسے بھی محض فریب جھوٹ اور بنان جلانے کی بات سمجھتا لیکن وہ اس واقعہ کو جو اس کے ساتھ گزرا تھا کیسے جھوٹ سمجھ لیتا۔ یہ سب اتفاقیہ طور سے ہو گیا تھا اور اسے اس بات پر حیرت بھی اور افسوس بھی کہ یہ اتفاق تھا تو اس سے پہلے کیوں نہ ہوا۔ اب اتنی دیر میں کیوں ہوا۔ نرمل نے ایسے حسین اتفاق کی کب سے تمنا کی تھی اور یہ بات اب ہوئی تھی جب کہ اس تمنا اور آرزو کو گھٹ گھٹ کر دم توڑتے ہوئے بھی زمانہ گزر چکا تھا۔

نرمل سطحی طبیعت کا انسان تھا اس کے اور چندرا کے رومان کی اس کے کسی دوست کو خبر نہ تھی ورنہ اسے بھی اس نے کچھ نہ بتایا تھا۔ اس رومان کے بارے میں ان دونوں کے علاوہ صرف نیا اور چندرا کی دو خاص سہیلیاں جانتی تھیں۔

نرمل ایک لا ابالی اور بے فکر قسم کا شخص تھا لیکن چندرا نے اس کی زندگی میں آ کر اس کی زندگی بدل دی تھی۔ اب وہ اپنا خاص خیال رکھنے لگا۔ اب اس کا بال بنانے پینٹ کی کریز سدھارنے، بوٹوں کی پالش اور کپڑوں کے انتخاب میں کافی وقت صرف ہونے لگا تھا اب وہ چندرا کے ساتھ سینما میں بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ دونوں ایک دن ایک مزاحیہ انگریزی تصویر دیکھ رہے تھے کہ ایک سین پر نرمل بہت زور سے ہنس پڑا اور غیر ارادی طور پر چندرا کے ہاتھ پر اس کا ہاتھ پڑ گیا۔ چندرا نے اس بات کا کوئی نوٹس نہ لیا لیکن نرمل نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا

نرمل معمول کے مطابق ڈیڑھ سو روپے اپنے لئے رکھ کر باقی پیسے گھر بھیج دیا کرتا تھا۔ اس کا اپنا کام سو روپوں میں چل جاتا تھا۔ وہ پچاس روپے سیونگز بینک میں جمع کرتا تھا۔ کسی آڑے وقت کے لئے لیکن جب چندرا سے اس کی ملاقات کافی گہری ہو گئی تو ڈیڑھ سو میں بھی گزر کرنا اس کے لئے مشکل ہو گیا اور کئی مہینے سے وہ صرف سو روپے گھر بھیج سکا تھا اس نے اس کی وجہ اپنی بیماری لکھ دی تھی۔ گھر سے تاکید بھی آئی تھی کہ وہ اپنی صحت اور کھانے پینے کا خاص خیال رکھے۔

ایک شام چندرا نرمل سے ملی، وہ اتنا حسین لباس پہنے ہوئے تھی کہ سینے کا زیر و بم نمایاں تھا۔ اس کا جوان پیکر دیکھنے والوں کو مسحور کر رہا تھا۔ وہ بے اختیار بول اٹھا۔

"چندرا آج تم کتنی دلکش معلوم ہو رہی ہو، تمہیں خیام کا تصور کہوں کہ کیٹس کا تخیل"
"آپ تو یہی کہتے ہیں کوئی نئی بات آپ کو آتی نہیں" چندرا نے شرماتے ہوئے کہا
"چندرا میرا دل تو پھڑپھڑا رہے سے گھبرانے لگا ہے"
"پھر؟"
"آج میں چاہتا ہوں کہیں پرسکون جگہ بیٹھ کر باتیں کریں" نرمل نے کہا اور چندرا تیار ہو گئی۔

دونوں حضرت محل پارک کی طرف بڑھے۔ پھر محل پیٹ کے قریب بجلی کی روشنی میں ایک بڑا سا سائن بورڈ چمک رہا تھا۔ "بلیک اینڈ وہائٹ وسکی" نرمل نے زور سے پڑھا۔

"یہ کیا؟" چندرا بولی
"شراب!"
"شراب تو ہے ... کیا آپ پیتے ہیں؟" چندرا نے جھجکتے ہوئے پوچھا
"جی!"
"آپ نے مجھے اس سے پہلے نہیں بتایا؟"
"تو اب بتا رہا ہوں کہ پیتا ہوں، تم بھی تو ایک وسکی کی بوتل سے کم نہیں!"
"اوہ" چندرا نے اطمینان کی سانس لی "میں تو ڈر گئی تھی۔"

پارک بالکل سنسان تھا۔ رات ہو چکی تھی، چاند پوری طرح نہیں نکلا تھا، چاندنی رات کی تاریکی پر چھا رہی تھی، فضا بہت خوشگوار تھی اور رومان پرور ایک دو جوڑے دور دور بیٹھے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ نرمل اور چندرا بھی ایک گوشے میں جا بیٹھے۔

دونوں یہاں باتیں کرنے کی غرض سے آئے تھے لیکن کافی دیر تک یونہی خاموش بیٹھے رہے کسی نے کوئی بات نہیں کی کبھی کبھی خاموشیاں بھی ایسی ہوتی ہیں کہ ان پر ہزاروں تکلم قربان! بیٹھے بیٹھے جب کافی وقت گزر گیا، چاند بھی اوپر آ گیا۔ چاندنی بھی پوری طرح پھیل گئی تو نرمل نے سکوت توڑا۔

"تمہارا کیا خیال ہے چندرا؟"

مانگیں کے بارے میں ۔"

"اپنے بارے میں ۔"

"میں سمجھی نہیں ۔"

"یہی کہ ہم اس طرح کب تک ملتے رہیں گے ؟

"ہمیشہ !"

تمہارے گھر کے لوگوں کیلئے میں پریشانی ..... میرا مطلب ہے تمہارے گھر کے لوگ تو کچھ نہیں کہیں گے ۔"

"ابھی جلدی کیا ہے "

"جلدی کوئی نہیں ماں کا خط آیا ہے ۔ پوچھا ہے اب تو نوکری ملے بھی چار سال ہو گئے اگر تمہاری نظروں میں کوئی لڑکی ہے تو بہت اچھا ہے ورنہ کوئی اچھی لڑکی دیکھ کر وہ رشتہ طے کر لیں ۔ اب تم بتاؤ انھیں کیا لکھ دوں ۔"

"ماں کو تمہاری شادی کا بڑا ارمان ہے !"

"کس ماں کو نہیں ہوتا ؟"

"ہوں ۔"

"ہوں کیا ؟"

"مجھے بھی اپنی ماں یاد آ رہی ہے ۔

"کیوں خیریت تو ہے کیا کوئی خط آیا ؟"

"کچھ نہیں ۔ مجھے یہاں ضروری کام ہے ۔ اگلے منگل کو میرا جنم دن ہے میں گھر نہ پہنچ سکوں گی ماں کو بڑا افسوس رہے گا ۔"

"ارے اتنی سی بات ! میں تو ڈر گیا تھا ۔ تو کیا ہے تم اپنی سالگرہ یہیں مناؤ میرے ساتھ ۔"

"نہیں میں آپ کے ساتھ نہیں مناؤں گی آپ بہت تکلف کریں گے ۔"

"اب ہم اس قابل بھی نہیں کہ ہمارا تحفہ بھی قبول کیا جائے ۔"

"تم برا مان گئے ؟ چندرا نے مسکراتے ہوئے کہا ۔ اور جواب میں نرمل نے چندرا کے

گالوں پر ہلکی سی چپت لگا دی۔

منگل کو چندرا کی سالگرہ تھی۔ یہاں نرمل اور ایک دو سہیلیوں کے سوا اس کا اور کون تھا۔ نرمل نے اس دن کی رخصت لی۔ ساڑھے دس بجے وہ کافی ہاؤس آنے والی تھی۔ ٹھیک دس بجے وہ بینک پہنچ گیا۔ کچھ روپوں کی اسے خود ضرورت تھی اور کچھ چندرا کے لئے تحفے خریدنے تھے۔ بینک سے نکالنے کے بعد وہ سیدھا کافی ہاؤس پہنچ گیا۔ چندرا وہاں موجود تھی۔ اس کے ساتھ اس کی دو اور سہیلیاں بھی تھیں۔

چائے پینے کے بعد تحفے خریدنے کی باری تھی۔ چندرا نے اپنی پسند کا کچھ بھی نہیں خریدا۔ نرمل نے ایک بڑی دکان سے ایک نفیس اور عمدہ ڈیزائن کی ساڑی اور اسی سے میچ کرتا ہوا بلاؤز کا کپڑا خریدا۔ ڈیزائن بھی اس کی سہیلیوں ہی نے پسند کیا۔

کپڑے خرید کر جب آئے تو چندرا کی ایک سہیلی۔ جس نے ڈیزائن پسند کیا تھا ساڑی کی تعریف کرتی ہوئی بولی "بالکل ماڈرن ڈیزائن کی ہے۔"

"ہاں لیکن اس پر یہ سینڈل کچھ زیادہ بھلی نہیں معلوم ہوگی۔" دوسری بولی۔ نرمل کے پاس پیسے تھے اور پیسے جب پاس ہوتے ہیں تو نرمل کو خرچ کی پروا نہیں ہوتی۔ اس نے سینڈل بھی خریدی اور ایک انگوٹھی بھی۔ چندرا نہیں نہیں کہتی رہ گئی۔

شاپنگ کرنے کے بعد چاروں نرمل کے گھر پہنچے جہاں اس نے برتھ ڈے پارٹی کا انتظام بھی خود کر رکھا تھا۔ برتھ ڈے کیک کا آرڈر ایک دن پہلے ہی ایک مشہور بیکری سے دے رکھا تھا۔

ہنسی گانوں اور دوسری دلچسپیوں کے درمیان چائے پہ چندرا نے ستائیس موم بتیاں روشن کر کے بجھائیں اور کیک کاٹنے کی رسم ادا ہوئی۔ سب نے مل کر آوازیں "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" سالگرہ کی مبارک باد دی۔ نرمل کی طرف سے دی گئی پر تکلف پارٹی بہت ہی بے تکلف ہو کر کھائی گئی۔

اس رات کو جب وہ پکچر دیکھ کر واپس ہوا تو ضرورت سے زیادہ ہی تھک گیا تھا۔ رات کو سونے سے پہلے اس کی جیب کی حالت ویسی ہی تھی جیسی صبح بینک جانے سے پہلے۔

سالگرہ کے بعد کئی دن تک چندرا سے ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ کسی کام سے باہر چلا گیا تھا۔ وہاں سے واپس آیا تو اسے ماں کا خط ملا۔ طبیعت کے بارے میں پوچھا تھا اور لکھا تھا کہ اس کو دیکھ بھال کرنے والی کی سخت ضرورت ہے۔ نوکر میری بھی تو کب ہے۔

"ہاں اب زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا!" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

اتوار کی شام کو چندرا آنے والی تھی۔ نرمل اتوار کو صبح دیر تک سوتا رہا۔ نو بجے سو کر اٹھا، تو چندرا کو اپنے ہی گھر پر منتظر پایا۔ اسے دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"اس وقت کیسے مہربانی ہو گئی ہے" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"ایک اطلاع دینے آئی ہوں۔ آج ہم لوگ ایک ضروری کام سے جا رہے ہیں۔ شام کو ملاقات نہ ہو سکے گی۔ میں نے سوچا تمہیں خبر کر دوں ورنہ تم خواہ مخواہ پریشان ہو گے۔"

چندرا یہ کہہ کر چلی گئی لیکن شام کو نرمل حسب معمول تیار ہو کر حضرت گنج پہنچ گیا۔ گھر پڑے پڑے ویسے بھی بور ہوتا۔ بہت دنوں کے بعد وہ پھر اکیلا تھا۔ وہ پہلے بھی بغیر کسی ساتھی کے گھوما کرتا تھا اور کتنا خوش رہتا تھا۔ لیکن وہی نرمل بہت کمی محسوس کر رہا تھا۔ اسے اب احساس ہوا کہ چندرا ہر پل اس کے ذہن پر چھائی رہتی ہے۔ یہی نہیں وہ اس کی زندگی پر بھی چھا گئی ہے۔

گنج میں اس کا دل نہ لگا۔ دکانیں بھی بند تھیں آج اسے سناٹا محسوس ہو رہا تھا۔ اتوار اور چھٹیوں کے دن بنارسی باغ میں شام کے وقت چہل پہل زیادہ رہتی ہے۔ اس نے سوچا شاید ادھر طبیعت بہل جائے۔ اس نے ادھر ہی کا رخ کیا۔

وہ بہت آہستہ چل رہا تھا اس کے آگے دو لڑکیاں باتیں کرتی ہوئی شاید ادھر ہی طرف جا رہی تھیں۔ نرمل نے محسوس کیا کہ وہ باتوں میں اتنی مشغول ہیں کہ انہیں پیچھے آنے والے کا ذرا بھی احساس نہیں۔ اس نے لڑکیوں کے پیچھے اس طرح چلنا مناسب سمجھ کر اپنی رفتار دھیمی کر لی۔ اسی وقت دو لڑکے جو شاید کسی کالج کے رہنے ہوں گے، سامنے سے گزرے اور ایک نے دوسرے کو ٹھوکا دے کر کہا۔

"سالے دیکھ! بالکل جیسے اپسرا! دیکھ!" شاید عورت کے حسن کا معیار اس کی نظروں میں

یہی تھا، اس نے جان بوجھ کر ان دونوں کو سنانے کیلئے یہ بات کہی تھی اور نرمل کو اس کی یہ حرکت بہت بری لگی تھی۔ وہ یہ تو نہ دیکھ سکا کہ ان لڑکیوں نے کیا کیا لیکن اس کے جسم کی حرکت اور گردن ایک عجیب انداز سے مڑنے پر اس نے سمجھا کہ انھوں نے بہت برا سا منہ بنایا ہوگا۔

دونوں کے گزر جانے کے بعد ایک لڑکی دوسرے سے بولی

"تجھے کہہ رہا تھا آشا یار دیکھ!"

"مجھے کیوں کہہ رہا تھا؟ تجھے کہہ رہا ہوگا!"

"میں بھلا آشا پاریکھ لگتی ہوں؟"

"نہیں! میں لگتی ہوں اور تو تو جیسے ..... " اس نے ایک بھدی سی ایکٹریس کا نام لیتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں کی باتیں سن کر مسکرا دیا۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کی بوریت کم ہوگئی نیارسی باغ میں خوب ہیل پہل تھی۔ چھٹی کا دن تھا۔ لوگ سیر و تفریح میں مشغول تھے کچھ تو چھوٹی ٹکڑیوں میں بیٹھے تھے۔ اور کچھ ادھر ادھر تفریح کر رہے تھے۔ یونیورسٹی اور کالج کی حسین لڑکیاں تتریوں کی طرح اڑتی پھر رہی تھیں۔ من چلے نوجوان ان پر فقرے کس رہے تھے۔ وہ بظاہر عجیب سی شکلیں بنائیں لیکن دل ہی دل میں خود بھی لطف اندوز ہوتی پھر رہی تھیں۔

یہاں کا سماں دیکھ کر اسے پھر چند یاد آنے لگی وہ ایک وسیع لان میں کنارے کی طرف ایک گھنے درخت کے نیچے پڑی ہوئی بنچ پر بیٹھ گیا۔ اور وہیں سے لطفِ نظارہ لینے لگا۔ یہاں اسے سکون ملا تھا۔

نرمل کے قریب ہی لان پر ایک جوڑا بیٹھا تھا ان کے ساتھ سوا سال کا بچہ بھی تھا۔ بچہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور وہ دونوں اسے چلنے مشق کرا رہے تھے۔ ماں تھوڑی دور پر گیند لئے ہوئے اسے بچے کو دکھا کر اپنی طرف بلا رہی تھی اور بچہ دھیرے دھیرے لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ابھی تک سات آٹھ ہی قدم اٹھائے ہوں گے کہ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور گرنے ہی کو تھا کہ ماں نے لپک کر اسے گود میں اٹھا لیا اور اس کے

گالوں اور منہ کو چومنے لگی۔ ماماتا سے بھرا پیار!

ماں نے بچے کو پھر کھڑا کیا اور اب کی بار بچہ باپ کی طرف منہ کئے ایک ہاتھ میں گیند تھامے آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چند ہی قدم اٹھا کر وہ رک گیا۔ اور اپنے ہاتھ کی گیند اچھال دیا۔ گیند لڑھکتی ہوئی نرل کے پاس آ گئی۔ نرل گیند اپنے ہاتھ میں لئے بچے کی طرف بڑھا۔ گیند اسے دے کر بچہ کو گود میں اٹھا لیا۔ یہ بچہ اسے بہت پیارا معلوم ہوا۔ ان دونوں کو دیکھ کر اسے چندرا کی یاد آگئی اور وہ کچھ سوچ کر مسکرا اٹھا۔

شام کا جھٹپٹا تاریکی میں تبدیل ہونے لگا، دھیرے دھیرے بھیڑ کم ہونے لگی۔ اکّا دکّا ادھر ادھر لوگ رہ گئے۔ تو اس نے بھی سوچا اب اٹھنا چاہیئے۔ وہ اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ اس کے پیچھے گھنی ہوئی جھاڑیوں سے سرگوشیوں کی آواز آئی۔

"کل پھر کہاں مل رہی ہو؟" یہ کسی مرد کی آواز تھی

"ایک ضروری کام ہے اس لئے کل نہ مل سکوں گی" یہ کسی عورت کی آواز تھی اور سو فیصدی چندرا کی آواز سے ملتی جلتی تھی۔

"پرسوں تو تمہارا جنم دن ہے" مرد کی آواز آئی

"ہاں ڈیئر تم مجھے کیا تحفہ دے رہے ہو۔"

"دل!"

"وہ تو پہلے ہی دے چکے ہو۔"

"تو بس اب جان باقی ہے وہ بھی لے لو!"

اس کے بعد ایک نسوانی ہنسی کی آواز ابھری۔ اس کی ہنسی بھی بالکل چندرا جیسی تھی

نرل نے سوچا ـــ چندرا... مگر چندرا..... اوں ہونہہ وہ یہاں ہرگز نہیں ہو سکتی

پھر بھی وہ اس چندرا جیسی آواز اور اس کی طرح ہنسنے والی لڑکی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اٹھ کر اس نے دیکھا تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ دونوں جب وہاں سے تو نرل بھی پیچھے ہو لیا۔

روشنی میں آنے پر نرل نے دیکھا واقعی وہ چندرا ہی تھی! نرل کے چہرے پر حیرت اور رنج کے ملے جلے تاثرات تھے۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ چندرا کے چہرے پر ایک حسین،

(باقی صفحہ پر)

ایک ایکٹ پلے

آباد ہے تنہائی میری

نور پرکاش رانکوٹی

رگھوناتھ راؤ - - - - - - - - - - ایک مارواڑی
گوپال ٹھکر - - - - - - - - - - مالک مکان
رمن داس - - - - - - - - - - ایک کنٹریکٹر
رام بابو - - - - - - - - - - پھل بیچنے والا
جگناتھ ویاسکر - - - - - - - - - - ایک حجام
مراری لال - - - - - - - - - - شراب بیچنے والا
جناردھن - - - - - - - - - - ایک مزدور

جب پردہ اٹھتا ہے تو اسٹیج کے ایک کونے میں ایک کھاٹ نظر آتی ہے اور اس کھاٹ پر جناردھن نامی ایک مزدور بیٹھا ہوا ہے۔ چہرے پر گھنی داڑھی کم بڑھاپے کی وجہ ہاتھوں میں لرزش ہے۔ کھاٹ پر صرف ایک گدڑی پڑی ہے۔ پاس میں ایک ٹوٹا سا مٹکا رکھا ہوا ہے۔ اور جسم پر ایک کمبل ہے۔ کھانستا جاتا ہے اور اپنی عینک آنکھوں سے لوگوں کو دیکھتا جاتا ہے۔ مالک مکان گوپال ٹھکر ایک رسالہ پڑھنے میں منہمک نظر آتا ہے سامنے ایک ٹیبل ہے۔ اس پر کئی فائلیں پڑی ہیں۔ ایک گھنٹی رکھی ہوئی ہے۔ اور مہمانوں کے بیٹھنے کیلئے چند کرسیاں اور بنچ رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے پچھلے جانب کئی تصویریں ٹنگی ہوئی ہیں۔ جن میں بزنس کے نیتاؤں کے ساتھ ان کی بلڈنگوں کی تصویریں بھی چسپاں ہیں۔ اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے جناردھن سے۔

گوپال ٹھکر:- ابھی تک کوئی نہیں آیا، جناردھن

جنار دھن :۔ (کانپتی آواز میں) آتے ہی ہوں گے
گوپال ٹھاکر :۔ مگر وقت تو ختم ہو رہا ہے (پھر ایک بار اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہیں)
جنار دھن :۔ وقت کبھی ختم نہیں ہوتا۔ گوپال ٹھاکر وقت کسی کے لئے نہیں رکتا۔ انسان تباہ ہو جائے پھر بھی وقت کی رفتار کم نہیں ہوتی۔
گوپال ٹھاکر :۔ میں تمہارا فلسفہ سننا نہیں چاہتا۔ میری یہ آٹھویں عمارت ہے اور مجھے باقی عمارتوں کی طرح بھی بیوقوفوں سے ہزاروں روپیہ اینٹھنا ہے۔

جنار دھن کچھ کہنا چاہتا ہے اس کا لرزتا ہوا ہاتھ دھیرے دھیرے نیچے کی طرف آجاتا ہے۔ کیونکہ سامنے سے رگھو ناتھ راؤ ارواڑی آتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ رگھو ناتھ راؤ ایک دھوتی اور شرٹ پہنے ہوئے ہے، آنکھوں پر عینک لگی ہوئی ہے۔ آتے ہی گوپال ٹھاکر کو پرنام کرتا ہے۔ گوپال ٹھاکر رگھو ناتھ راؤ سے بیٹھنے کیلئے کہتا ہے۔

رگھو ناتھ راؤ :۔ بلڈنگ بن گئی ہے۔؟
گوپال ٹھاکر :۔ جی ہاں!
رگھو ناتھ راؤ :۔ سامنے والا کمرہ میری نئی دکان کیلئے دے دیجئے، بڑی مہربانی ہوگی
گوپال ٹھاکر :۔ کوئی اور دکان بھی ہے۔؟
رگھو ناتھ راؤ :۔ جی ہاں پہلے پھیری کر کے کپڑا بیچتا تھا پھر جنگ کا کال آگیا۔ ملٹری کیلئے کمبل مہیا کرنے کا کام میرے ذمہ کیا گیا۔ کیا پوچھتے ہو سیٹھ صاحب خوب کمایا اتنا کمایا کہ پھیری چھوڑ دوکان کھولی اور آج آپ کے پاس نئی دکان کیلئے آدھمکا ہوں۔
گوپال ٹھاکر :۔ اس دوکان میں مال کہاں سے آتا ہے؟
رگھو ناتھ راؤ :۔ چور بازار گیٹ سے۔ بڑی کمپنی ہے اپنا مال وہیں سے آتا ہے
گوپال ٹھاکر :۔ تمہیں کمرہ چاہیئے۔ دکان کے لئے، ایڈوانس کتنے ۔؟

رگھوناتھ راؤ : اسی لئے تو میں آپکے پاس آیا ہوں
گوپال ٹھکر :۔ تم بزنس کرتے ہو، میں بھی بزنس میں ہوں، میرے یہاں کا مال کھولنی ہے تو مال بلیک سے آئیگا۔ پگڑی الگ دینا ہوگی کرایہ الگ اور بلیک کا مال بیچوگے اس کا حصہ الگ۔ (بالکل رازدارانہ انداز سے کہتا ہے) تمہیں یہ شرائط منظور ہیں تو کل ہی کمرہ دیکھ جائیے۔ ورنہ۔ ۔ ۔
رگھوناتھ راؤ :۔ لیکن بلیک کا مال کہاں سے آئے گا؟
گوپال ٹھکر :۔ اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا
رگھوناتھ راؤ :۔ کیسے،
گوپال ٹھکر :۔ معلوم ہوتا ہے اس معاملے میں بالکل نئے ہو۔ ہر ماہ گودی میں نیا جہاز آتا ہے۔ جہاز بندرگاہ پر لگتے ہی مسافر سامان بیچتے ہیں۔ بس وہی خرید لیجئے اس پر لیبل لگانے کا کام میرے ذمے ہوگا، میڈان امریکہ میڈان جاپان، روس جرمنی، سبھی قسم کی لیبلیں تیار ہیں۔
رگھوناتھ راؤ :۔ میڈان انڈیا کیوں نہیں۔؟
گوپال ٹھکر : روپیہ کمانا ہے تو ہندیا کو بھول جاؤ۔ دیکھتے نہیں، چالیس کروڑ کس نام پر مرتے ہیں۔ کھاتے ہیں بدیشی، پہنتے ہیں بدیشی چلتے ہیں بدیشی، نہ ان کا دماغ ہندستانی نہ ان کا دل ہندستانی!
جنار دھن گھاٹ پر بیٹھا کھانسنے لگا، دونوں ایک ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہیں پھر دونوں سوچتے ہیں کچھ دیر جاتے ہیں
رگھوناتھ راؤ :۔ اچھا سیٹھ صاحب اب اجازت چاہونگا، آپ کی سیوا میں کل پھر حاضر ہو جاؤں گا،
گوپال ٹھکر :۔ اگر تمہیں میری شرائط منظور ہیں تو کل ہی سے تیاری کئے دیتا ہوں
رگھوناتھ راؤ واپس چلا جاتا ہے۔ جنار دھن بھیانک نظروں سے گوپال ٹھکر کو دیکھتا ہے
گوپال ٹھکر :۔ تم ایسی نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہو، معلوم ہوتا ہے ابھی کھا جاؤ گے۔

جناردھن :- میں یہ سوچ رہا ہوں، تم کتنے مہان آدمی ہو! (جناردھن خاموش ہو جاتا ہے۔ گوپال ٹھکر اپنی جگہ چھوڑ تصویروں کو دیکھنے لگتا ہے اتنے میں رام بابو پھل بیچنے والا داخل ہوتا ہے۔ آدھی پتلون پہنے ہوئے ہے۔ چہرے پر پریشانی کے آثار ہیں۔ کرتا جگہ جگہ پھٹ گیا ہے۔ خالی ٹوکری خالی پر سر پر رومال بندھا ہوا ہے۔ آتے ہی فرش پر بیٹھ جاتا ہے۔

رام بابو :- سلام سیٹھ

گوپال ٹھکر :- سلام سلام کیسے آنا ہوا ہے

رام بابو :- تمہاری نئی بلڈنگ کے سامنے ہم گاڑی پر پھل بیچیگا، تم ہم کو اجازت دے گا نا۔ ہم اس کے بدلے میں کچھ دینگا تو نہیں، تمہارے بال بچے کتنا چاہیے کھا سکتے ہیں۔ گریب آدمی ہوں، ریلوے پھاٹک کے پاس مونگ پھلی بھجور بیچتا تھا۔ لائسنس اپنے پاس نہیں۔ روز پولیس کو ہفتہ کہاں سے دیگا۔ اور پھر لائسنس کو بھی تو روپیہ چاہیئے۔ سیٹھ صاحب اتنا روپیہ گریب کے پاس کہاں سے آئے گا

گوپال ٹھکر :- تم کو یہاں بھی ہفتہ دینا ہوگا۔

رام بابو :- کیسا ہفتہ سیٹھ صاحب تم تو بہت بڑا آدمی ہے۔ ہم صرف وہاں گاڑی پر مال بیچے گا پھر ہفتہ کاہے کا؟

گوپال ٹھکر :- تم میری عمارت کے سامنے پھل بیچو گے۔ یقیناً وہاں گاہک زیادہ ملیں گے تمہیں زیادہ فائدہ ہوگا۔ تو پھر کیا تمہیں ہفتہ دینا مشکل ہوگا۔

رام بابو :- لیکن ہم بولا نا، بچہ جتنا چاہے کھا لے۔

گوپال ٹھکر :- (سخت ہو کر) مجھے روپیہ چاہیئے اور کچھ نہیں میں تمہاری بکواس سننا نہیں چاہتا۔

رام بابو :- آجادی کے بعد تو ہم نے سنا کہ اپنے دیش میں بڑا بڑا لوگ پیدا ہو گیا ہے جو غریب کی مدد کرتا ہے کیا وہ سب بڑا آدمی سیٹھ صاحب تمہارے ہی جیسا ہوتا ہے

اور اپنی جیسے کورٹ کری پڑا رہتا ہے۔

گوپال ٹھاکر :۔ (آپنے سے باہر ہو کر) مگر صدا آزاد ہیں، نالائق گاڑی میں صرف پھل بیچتا ہے اور منہ میں اتنی لمبی زبان رکھتا ہے۔ لوگ تو اپنی بہو بیٹیوں کا سودا مجھ سے کرتے ہیں۔ اور کبھی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کی جرأت نہیں کرتے
مجھے ہر سودا منظور ہے — یہاں تھوڑے اس ہاتھ لے، عجب ریت ہے
اور اس ریت میں کوئی گناہ نہیں۔ وہ ہو جا اگر اپنی سلامتی چاہتا ہے۔

رام بابو :۔ میں گریب آدمی ہوں سرکار، بہو بیٹیوں کے سودے تو اپنے یہاں نہیں ہوتے بڑے لوگوں کے سودے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ میں رام بابو ہوں اور صرف پھل بیچتا ہوں۔ رام رام کہہ کر رام بابو بھاگ جاتا ہے

(گوپال ٹھاکر بڑبڑانے لگتا ہے، پھر اپنی جگہ چھوڑ تصویریں دیکھنے لگتا ہے پھر خیالوں سے مخاطب ہوتا ہے)

گوپال ٹھاکر :۔ یہ جو تصویریں تم دیکھ رہے ہو۔ یہ میری آزادی کے بعد کی بنائی ہوئی عمارتیں ہیں۔ ہر عمارت میں بسنے والے بلیک کرنے والے ہیں اور بلیک ہوتا ہے شراب کا کپڑوں کا، عورتوں کا، اور روپیہ ملتا ہے بلیک کا۔ اسی بلیک کے ذریعہ میں نے آٹھ عمارتیں کھڑی کر دی ہیں اور نویں عمارت کا کنٹریکٹ اب مجھے دیا جا رہا ہے۔
(اتنے میں ہی اس ایک کنٹریکٹر داخل ہوتا ہے۔ ہاتھ میں کچھ کاغذات ہیں آتے ہی کرسی پر براجمان ہو جاتا ہے اور گوپال ٹھاکر سے مخاطب ہوتا ہے)

رمن داس :۔ آپ نے نئی زمین خرید لی؟

گوپال ٹھاکر :۔ جی ہاں خرید تو لی لیکن اب تک جھونپڑے والوں نے سامان نہیں سمیٹا۔ کل شام حولدار وہاں پہنچنے والا ہے۔ اگر وہ نہیں جائیں گے تو میں نے جھونپڑیاں توڑنے کا حکم دے دیا ہے۔

(اتنے میں حنا رد حسن کھانسنے لگتا ہے اور کچھ کہنا چاہتا ہے مگر گوپال ٹھاکر کی آنکھیں اسے کہنے سے روک دیتی ہیں۔)

رمن داس کنٹریکٹ مجھے منظور ہے۔
گوپال ٹھاکر یہ تو میں جانتا ہی ہوں صرف یہ بتاؤ بلڈنگ کتنے سالوں کے لئے بنے گی؟
رمن داس آپ کا مطلب ؟
گوپال ٹھاکر جیسے بلڈنگ بنانے کا کنٹریکٹ ہوتا ہے اسی طرح سالوں کا بھی کنٹریکٹ ہوتا ہے اور وہ کنٹریکٹ دس سال تک ہوگا اور زیادہ سے زیادہ بارہ سال تک اس کے بعد بلڈنگ گرنا ضروری ہے تاکہ میں اپنے نئے کرایہ دار داخل کر سکوں۔ یا پھر لوگوں سے مرمت کے روپئے وصول کر سکوں۔ بھئی یہ بزنس ہے کھیل نہیں ہے۔!
رمن داس اگر بلڈنگ اس کے پہلے گر گئی تو۔؟
گوپال ٹھاکر اگر سچ مچ تو پھر اس کے ذمہ دار تم ہو گے۔ اور ذمہ داری صرف معافی مانگنے سے ختم نہیں ہوتی اس کے لئے کچھ روپئے چاہئیں۔ انگریز لوگ واپس چلے گئے اب صرف ساری پر خون معاف نہیں ہوتا۔ اب حکومت ہماری ہے ہم آزاد ہیں اور جو بھی چاہے کر سکتے ہیں۔ رمن داس :- کیا تم کو حکومت کا بھی خوف نہیں۔
گوپال ٹھاکر (قہقہہ لگا کر) حکومت کا خوف اور مجھے (طنزیہ انداز میں) ہر ناکے دار سے لے کر منسٹر تک میرے یہاں سے حصّہ لیتے ہیں اسی لئے میرے کنٹریکٹ بہت جلد پاس ہو جاتے ہیں اسی لئے پولیس والے مجھے سلام کرتے ہیں اسی لئے بیک وقت میرے آنگن میں تم کئی کاریں دیکھتے ہو۔ یہ سب کس کی کرامات ہیں روپئے کی۔ روپئے کو اپنے بس میں کر لو بس ساری کائنات تمہارے ہاتھ میں ہے !
رمن داس کیا تمہیں اپنے ضمیر کا بھی خوف نہیں۔؟
گوپال ٹھاکر ضمیر ...... انگریزوں کی واپسی کے ساتھ ساتھ ضمیر بھی ہندوستان سے نیست و نابود ہو چکا ہے ایسے ہندوستان کا ضمیر مر چکا ہے۔ تم پہلے آدمی ہو رمن داس۔ جو ایسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو ورنہ یہاں تو جو بھی آیا وہ زندگی کے لئے پہلے ہی مر چکا تھا۔

رمن داس: کیا خبر تھی تم اتنے کمینے ہو۔ ایک عمارت بنا رہے ہو ڈھانے کے لئے۔ تعمیر کر رہے ہو چند روپیوں کے لئے۔ حاصل کر رہے ہو وہ خوشی جو ابدی نہیں ہے وہ عمارت گر جائے گی تو نہ جانے کتنے بے گناہوں کا خون ہوگا۔ کتنے بچے بلک بلک کر دم توڑیں گے۔ کتنی سہاگنیں بیوہ کہلائیں گی۔ اتنا بڑا پاپ مجھ سے نہیں ہوگا۔ ٹھکر گوپال یہ خون مجھ سے نہیں ہوگا۔ یہ خون مجھ سے نہیں ہوگا...... یہ خون.... (رمن داس یہ جملے کہتا ہوا بھاگ جاتا ہے)

[اس کے بعد گوپال ٹھکر ایک نظر جباردھن کو دیکھتا ہے۔ مگر جباردھن منہ پھیر لیتا ہے اتنے میں مراری لال ایک شراب بیچنے والا داخل ہوتا ہے۔ پاجامہ اور شرٹ پہنے ہوئے ہے آنکھیں لال دکھائی دیتی ہیں بالکل گھبرایا ہوا نظر آتا ہے۔ آتے ہی گوپال ٹھکر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے]

مراری لال: (گھبرائے انداز میں) بچالو حضور۔ میرے پیچھے پولیس آرہی ہے۔ میں شراب کا دھندا کرتا ہوں۔ میری بوتلیں برآمد کی گئی ہیں۔ گھر میں فاقہ ہے اور بچہ بیمار ہے۔ میری جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں (ایک ہی سانس میں کہتا ہے۔

گوپال ٹھکر: ذرا دم سادھ لو۔ تمہارا کوئی بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔

[اتنے میں دو پولیس داخل ہوتے ہیں اور آتے ہی گوپال ٹھکر سے کہتے ہیں]

پہلا پولیس: ہم اس آدمی کے پیچھے آئے ہوئے ہیں سرکار... شراب کی بوتلیں....

گوپال ٹھکر: (رعب کے ساتھ) یہ میرا آدمی ہے تم جا سکتے ہو

[دونوں پولیس چپ چاپ باہر چلے جاتے ہیں]

مراری لال: (خوش ہو کر) آپ کتنے مہان آدمی ہیں۔ آپ کا احسان میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا

[اتنے میں جباردھن کھانسنے لگتا ہے۔ دونوں ایک ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہیں اور پھر محو گفتگو ہو جاتے ہیں۔]

گوپال ٹھکر: اس سے پہلے کہاں دھندا کرتے تھے؟

بند کر لو۔ ایسے جینے سے تو وہ ہتھکڑی ہی اچھی ہے۔ تم سے تو لاکھ درجہ جولدار بلم کھمہ بہتر ہے جو چوتی آ لیتا ہے مگر مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ خود کو فرشتہ دکھا کر خون تو نہیں چوستا۔ بدکار کہیں کے!

گوپال ٹھکر	زبان کو لگام دو۔ ورنہ دو منٹ میں زبان تالو سے باہر ہوگی۔

مراری لال	کیا تم نہیں جانتے ہو آدمی اپنی آنکھوں کا پانی بوتل میں بند کر دیتا ہے اور سر راہ بیچتا ہے اس کی آنکھوں میں صرف خون باقی رہتا ہے۔ مگر وہ بھی جینے پر مجبور ہے اپنے لئے نہیں۔ گھر والی کے لئے ننھے بچوں کے لئے۔ لو مجھے ہتھکڑی پہنا دو مجھے سولی پر چڑھا دو۔ ایسی زندگی سے تو موت ہزار درجہ بہتر ہے۔

گوپال ٹھکر	ہاں۔ نالی کا کیڑا نالی میں جنم لیتا ہے اور اسی میں مر جاتا ہے میں تمہیں ایک موقع اور دیتا ہوں ہو سکے تو اپنے دماغ کو ٹھیک کر لو۔ ورنہ سمجھو موت تمہاری منتظر ہے . . . .

مراری لال	میں جا تو رہا ہوں مگر دھیان رکھنا۔ یا تو تمہاری موت کا سامان لئے حاضر ہو جاؤں گا یا پھر خود کو موت کے حوالے کر دوں گا (مراری لال غصہ میں باہر چلا جاتا ہے اتنے میں جگناتھ ویلاسکر ایک حجام داخل ہوتا ہے۔

جگناتھ ویلاسکر	مجھے ایک سیلون کھولنا ہے۔ مجھے بھی ایک کمرے کی ضرورت ہے

گوپال ٹھکر	اس سے پہلے کیا کرتے تھے؟

جگناتھ ویلاسکر	اس سے پہلے دیہات میں تھا۔ پھر بمبئی آ گیا۔ اب فٹ پاتھ چھوڑ کر سیلون کھولنے کے ارادے سے آپ کے پاس آ پہونچا ہوں۔

گوپال ٹھکر	وقت کم اور کام زیادہ ہے۔

جگناتھ ویلاسکر	لیکن . . . .

گوپال ٹھکر	لیکن ویکن کچھ نہیں میری شرطیں اگر منظور ہوں تو دوکان کل ہی کھول سکتے ہو

جگناتھ ویلاسکر	میں سن تو لوں۔

مراری لال سمجھ گئے بہ ۔ وہاں بھی بھتہ بھرتا تھا۔ اب نیا حوالدار آگیا ہے۔ ابھی جان پہچان نہیں ہوئی ہے۔ سالے دو ٹکے کے ہوتے ہیں ہوتی ٹکا دو اپنا کام پورا کر لو۔ کیا بتاؤں سرکار دوپہر کے وقت تو کتنی لاریاں شراب سے بھری ہوئی پاس ہو جاتی ہیں اور پولیس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔

گوپال شنکر مگر یہ تو گھوس ہے ۔۔ مرارری لال

مرارری لال آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ کیا بتاؤں لوگ کیسے کیسے گھوس لیتے ہیں۔ ابھی جو شکر پر پرمٹ ہو گیا نا۔ بلیک سے شکر ملتی ہے۔ مگر بہت مہنگی۔ ہم گڑ کی چائے پیتے ہیں اور گڑ کی شراب بناتے ہیں۔ ہم غریبوں کو تو چائے پی لو یا پھر شراب۔ دونوں میں زہر اتنا ہی ہوتا ہے۔

گوپال شنکر تو سن تو کان کھول کر۔ دھندے کی بات ہر جگہ ہوتی ہے۔ کبھی مہنگا۔ کبھی سستا تم غریب ہو تم سے زیادہ نہیں لوں گا۔ میری نئی عمارت بن کر تیار ہے۔ مارواڑی کی دوکان کے پیچھے کے نیچے تم اپنی بوتلیں چھپا سکتے ہو۔ پولیس کا کوئی آدمی نہیں نہیں روک سکے گا۔ البتہ .... بھتہ!

مرارری لال آپ کیوں غریب سے مذاق کرتے ہیں آپ اور بھتہ مجھ سے لیں گے۔ ابھی اور آپ کیوں میرا امتحان لے رہے ہیں۔

گوپال شنکر (غصہ میں) میں اس وقت مذاق نہیں کر رہا ہوں عمارت روپیہ خرچ کر کے تعمیر کی ہے یوں ہی بھکاریوں کے رہنے کے لئے نہیں۔ کچھ فائدہ مجھے نہیں لے گا تو بھی پولیس...

مرارری لال آپ کا مطلب ۔۔؟

گوپال شنکر ! اے نمک حرام۔ کیا اسی لئے میں نے تمہیں بچایا تھا؟

مرارری لال اور آستین کے سانپ (آپے سے باہر ہو کر) کیا اسی لئے تم نے مجھے بچایا تھا کہ میں شراب کا دھندا کروں اپنی جھنڈ پر کھیل کرا دو تم اس کا فائدہ اٹھاؤ۔ تجوری میں

گوپال ٹھاکر پہلی شرط پگڑی کی دوسری کرایہ کی تیسری بال صرف مردوں کے ہیں کاٹے جائیں گے بلکہ ......

جگناتھ وہاکر ہاں اب تو زمانہ بدل گیا ہے لڑکیاں بھی بال کٹواتی ہیں ۔ وہ تو فیشن بنتا چلا ہے میں اچھے اچھے کاریگر دوکان میں رکھ لوں گا۔ دگنا فائدہ ہوگا۔ اب تک کی شرطیں مجھے منظور ہیں۔ اور بھی کوئی شرط ہے ۔ ؟

گوپال ٹھاکر ہاں اور بھی شرطیں ہیں مگران تینوں شرطوں سے بڑھکر۔ آنے والی ہر لڑکی کی پرکھ پرکھ کے مطابق دانہ اور دام۔ تاکہ تمہارا بھی دھندا چلتا رہے اور میرا کام بھی نہ رک سکے۔

جگناتھ وہاکر یعنی آپ کا مطلب لڑکیوں کے بلیک سے ہے ۔؟

گوپال ٹھاکر کھانڈ، گڑ، چاول، کپڑا، شراب روپیہ اور لڑکی کے بلیک سے بھی کوئی اور بلیک ہو تو وہ بھی بتا دو میں کرنے کے لئے تیار ہوں۔

[اتنے میں جنارد ھن پھر ایک بار کھانسنے لگتا ہے]

جگناتھ وہاکر ہم بھی جیتے ہیں مگر اتنی کمینگی کے ساتھ نہیں۔ روکھی سوکھی میں ہم بھی خوش ہیں مگر تمہاری طرح کے کرتوتوں کے ذریعہ نہیں۔ تمہارے اندر شرافت کا لبادہ ہے اور اسی کے اندر بھیانک اور خوفناک چہرہ ہے۔ نہ جانے تمہارے کتنے چہرے ہیں ہر چہرے میں ایک مکاری چھپی ہوئی ہے۔ لعنت ہے ایسی زندگی پر گوپال ٹھاکر اگر حکومت میرا خون مجھے معاف کر دے تو جانتے ہو میں کس کا خون کروں گا؟

گوپال ٹھاکر (زور سے ہنستا ہے) ہا۔ ہا۔ ہا۔ جانتا ہوں تم میرا خون کرو گے۔ یہ میرے اکیلے کا چہرہ نہیں۔ یہ چہرہ رام رتن کا ہے۔ یہ کھنڈوبل کا ہے۔ یہ چہرہ بھیتومل کا ہے۔ یہ امرت لال سے یہ چہرے دوار سے لیکر گیٹ وے تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جن کی کئی بلڈنگیں ہیں جن کے منہ پر شرافت کا لبادہ ہے اور اس کے اندر بھیانک اور خوفناک چہرہ ہے۔ جہاں یہاں ہر ایک چیز بلیک سے خریدی اور بلیک سے بیچی جاتی ہے سانپ اپنا پھن پھیلائے ہر وقت ڈسنے کیلئے تیار رہے کیا ان چہروں کو تم ختم کر سکتے؟

جگناتھ دیاکر پہلے اس ایک ٹھکر کو تو ختم کر لوں باقی کا حساب . . .

[اتنے میں لڑ تا ہوا جنار دھن اپنی کھاٹ پر سے اٹھتا ہے اور کہتا ہے]

جنار دھن رک جاؤ جگناتھ . . . . [کھانسنے لگتا ہے]

گوپال ٹھکر کیا تمہارے دن بھی پھر گئے ۔ مرنے سے پہلے کھاٹ کا کرایہ تو دیتے جاؤ ۔ کون ہے تمہارا اس دنیا میں تمہاری دیکھ بھال کرنے والا ۔ جنگ کے بعد سے تم میرے یہاں ہی ہو سرکار سے جو پیسے آتے ہیں انھیں تم میرے ذمے کرتے ہو ۔ یہ بات سچ ہے مگر اتنے سستے داموں تمہیں مرنے کے لئے اتنی جگہ کون دے گا ۔ کھاٹ کی طرف اشارہ کر کے جانتے نہیں ہو پگڑی کتنی لی جاتی ہے ؟

جنار دھن میں نے تمہاری ہر حرکت کو دیکھا اور پرکھا ہے ۔ میری رگوں میں دوڑتا ہوا خون آج بھی زندہ ہے ۔ میری آنکھوں کا پانی ابھی مر نہیں گیا ۔ ٹھکر ۔ میں غریب مزدور کا بیٹا ہوں جو اپنی محنت کی روٹی کھاتا ہے جو اپنی عزت و آبرو کے لئے اپنی جان تک دے دیتا ہے ۔ گوپال میں نے بھارت کی آزادی کے لئے ایک خون انگریز کا کیا اور آج دوسرا خون بھی سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف کرتا ہوں [اپنا ڈنڈا فضا میں بلند کرتا ہے اتنے میں رام بابو ۔ مراری ۔ اور رمن داس داخل ہوتے ہیں ۔ جنار دھن کو روک دیتے ہیں]

مراری لال جنار دھن . . . یہ خون ہم سب مل کر کریں گے ۔ یہ خون صرف گوپال ٹھکر کا نہیں بلکہ ہر اس جاگیر دار کا ہو گا جو انسانیت کے ماتھے کا کلنک ہے اور جس نے ہر دور میں ایک نیا فتنہ کھڑا کر کے ہم لوگوں کی زندگی کو اجیرن کر رکھا ہے جس نے ہمارے بل بوتے پر عمارتوں کی بنیاد رکھی ہے ۔ بیشمار کاروں کو خریدا ہے اور اسی عمارت کے نیچے ہیں کھلا ہے ہماری بہو بیٹیوں کو بری نظر سے دیکھا ہے اور روپیہ کمانے کے لئے ہر وہ گناہ کیا ہے جو اسے نہیں کرنا چاہئے تھا ۔

آواز پس پردہ [گوپال ٹھکر کو رام بابو ۔ مراری لال رمن داس پکڑ کر حوالات میں بند کرتے کیلئے لے جاتے ہیں]

[جنار دھن دھیرے دھیرے اپنی کھاٹ پر بیٹھ جاتا ہے پھر کچھ سوچ کر آہستہ آہستہ اٹھنے لگتا ہے)

من ـــ مگر اس سے کچھ نہیں ہوگا کچھ نہیں ہوگا (دھیرے دھیرے اسٹیج کے درمیانی حصہ میں آتا ہے) اور کہتا ہے ۔ یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب میں جنگ کے مورچے سے واپس آگیا تھا اور ملک بھر میں ہندو مسلم فساد کی آگ پھیلی ہوئی تھی میرے بچے فساد کی نذر ہو گئے ۔ میرا گھر جل گیا اور میری بچی ..... (کانپتا جاتا ہے) میری بچی ہوس کا نشانہ بن گئی ۔ (کچھ دیر رکنے کے بعد) تم نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے [یہ جملہ کہتے ہی وہ اپنے جسم سے کمبل ہٹا دیتا ہے ۔ ایک کونے سے اس کے جسم پر روشنی پڑتی ہے ۔ اس روشنی میں اس کے جسم کے ناسور دکھائی دیتے ہیں جگہ جگہ زخم ..... ان زخموں اور ناسوروں سے بہتی ہوئی پیپ دکھائی دیتی ہے]

دیکھ لو یہ ناسور ..... یہ ناسور ہی نہیں ہیں ۔ ان ناسوروں میں میری روح کا غم سمایا ہوا ہے اس میں ایک ایک یاد پنہاں ہے ۔ مجھے اپنی بیوی بچوں اور گھر کے کھونے کا کوئی غم نہیں ان ناسوروں میں ہندو مسلم فساد کی یاد پنہاں ہے ۔ اس میں بنگال کا قحط ہے ۔ پونہ کا سیلاب ہے ۔ پنجاب کی تقسیم ہے اور سب سے بڑا ناسور ہے ہند و پاک بننے کا (اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اٹھاتا ہے اور پوچھتا ہے) کیا یہ غم عام دل کے انسان کی موت کے لئے کم ہے ؟ کیا انسان کی موت کے لئے اتنا غم کافی نہیں ہے ؟ کچھ دیر خاموش رہ کر کوئی احساس اب زندہ نہیں ۔ خود پر بہانے کے لئے آنسو کی دو بوندیں تک نہیں مجھے تنہائی ڈس رہی ہے ۔ آخر یہ تنہائی کا احساس مجھ سے کم کیوں نہیں ہوتا جبکہ میں سنتا ہوں یہاں کوئی اکیلا نہیں شاید ہر کسی کا کوئی نہ کوئی ہے ..... مگر میرا کوئی نہیں ..... آج میں اکیلا ہوں ۔ میں اکیلا ہوں ۔ میں اکیلا ہوں [یہ جملے ادا کرتے ہوئے وہ پھر اپنی کھاٹ پر بیٹھ جاتا ہے اور آہستہ آہستہ پردہ گر جاتا ہے]

ـــ آباد ہے تنہائی میری آباد

افسانچے

ضیا حسینی

سیاہ رو اور سرخ رو۔

اسٹر بدرالحسن بدر فتحپوری مرحوم مولانا حسرت موہانی کے ہم جماعت تھے ایک دن انھوں نے مولانا کا ایک واقعہ سنایا جو ان کے زمانہ طالب علمی سے متعلق ہے

گورنمنٹ ہائی اسکول فتحپور کے سالانہ "ہفتہ اطفال" کے سلسلہ میں "قلم اور تلوار" کے موضوع پر مباحثہ ہوا۔ مولانا تلوار کے موضوع پر بولے اور فرسٹ پرائز حاصل کی۔ انھوں نے تقریر ختم کرتے ہوئے فرمایا:

"قلم اپنا کام کر کے سیاہ رو ہوتا ہے۔ اور تلوار اپنا کام کر کے سرخ رو۔"

انسان اور جانور ایک جگہ

مجھے کانپور میں کہیں رہنے کا ٹھکانا نہ ملا تو میں اپنے ایک ہم وطن کی باہری نشست میں رہنے لگا۔ بڑے شہروں میں مسئلہ مکان ایسا الجھا ہوا ہے کہ انسان تنگ سے تنگ جگہ پر گزر بسر کر لیتا ہے پھر وہ تو پختہ کمرہ تھا۔ جہاں مجھے رہنے کا ٹھکانہ مل گیا۔ وہاں مجھے ایک تکلیف بھی تھی۔

میرے کمرے سے ملی ہوئی مالک مکان کی بکریاں بندھی رہتی تھیں۔ اکثر جناب ثاقب کانپوری تشریف لے آتے اور مجھے اس اذیت میں دیکھ کر خود بھی تکلیف محسوس کرتے ایک دن، مالک مکان کی موجودگی میں وہ تشریف لے آئے۔ اور انھیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا .. آپ انسانوں اور جانوروں کو ایک جگہ باندھتے ہیں۔ ثاقب صاحب کا یہ جملہ میرے لئے مفید ثابت ہوا اور بکریاں کہیں دور بندھنے لگیں۔

گرم اور ٹھنڈا

وہ دو جنوری کی ایک سرد اور کہر آلود صبح تھی۔ وجیشوری تھانے کے قریب ایک مقام ہے جہاں گندھک کے گرم پانی کی کنڈیاں ہیں۔ اسے نہانا تھا اس نے تولیہ کاندھے پر ڈال کر وہ گرم پانی کی پہلی کنڈی کی طرف بڑھا۔ وہ قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ کچھ لوگ کنڈی کے پاس جمع ہیں پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ایک بڑھیا کا چشمہ پانی میں گر گیا ہے اور پانی انتہائی گرم ہونے کی وجہ سے کوئی نکالنے پر راضی نہیں ہوتا۔ بڑھیا سردی کے مارے بید مجنوں کی طرح کانپ رہی تھی۔ جا بڑھیا جا تیرے دو پیسے کے چشمے کیلئے کون پانی میں کودے گا؟ ایک موٹے سیٹھ نے کہا اور اشلوک پڑھتے ہوئے گرم پانی اپنے اوپر انڈیلنے لگا۔ بڑھیا لکڑی ٹیکتے ہوئے ایک طرف چل دی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ دوسری کنڈی پر سے نہا کر واپس ہو رہا تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس کنڈی پر بھی ہجوم ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک میم صاحب کی سینڈل کنڈی میں گر گئی ہے۔ کچھ لوگ میم صاحب کے بدن کو یوں گھور رہے تھے جیسے ان کی آنکھیں کہہ رہی ہوں ہم میم صاحب کے ننگے بدن کو دیکھتی ہوں؛ اور بہت سے لوگ اس گرم پانی کی کنڈی میں سینڈل تلاش کرنے کیلئے غوطے لگا رہے تھے ان میں وہ موٹا بنیا بھی پیش پیش تھا۔ وہ سوچنے لگا گرم پانی ایکا ایک ٹھنڈا کیسے ہو گیا۔ باوجود کوشش کے وہ ٹھنڈے اور گرم پانی کا ذو اضعاف اقل نہ نکال سکا!

آج کا ادب

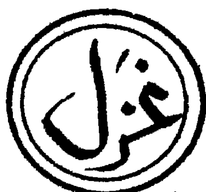
ایک نوجوان پریشان حال ۔ ایک کتب فروش کی دکان پر کھڑا ہے ہاتھ میں چند کتابیں ہیں شاید بیچنا چاہتا ہے۔ سر جھکائے وہ بڑے انہماک سے دکاندار کو کتابیں بتا رہا ہے۔ صاحب یہ میکسم گورکی کی "ماں" یہ کرشن چندر کا "ہم وحشی ہیں"۔ یہ دیکھئے شفیق الرحمن کی "مزید حماقتیں" یہ کنھیا لال کپور کی "نرم گرم" یہ پریم چند کی "گؤدان" ۔ ٹیگور کی گیتانجلی اور احمد ندیم قاسمی کی "طلوع و غروب" اور عصمت چغتائی کی "معصومہ" بھی ہے۔ "یہ ہاتھ میں کیا ہے" دکاندار سب کتابیں دیکھنے کے بعد کہتا ہے۔ "یہ ہے طوفان کا بچہ" تو پھر یہ نصف قیمت پر دیدو ورنہ بیچنے کی ضرورت نہیں

سب رنگ

(مشتاق ابن مومن بھیری)

ٹکراؤ

کیبے کل مہر میں بیٹھے بیٹھے جب شام غروب ہوتی ہے اور لڑکیاں اپنے آپکو مارلن منرو، لولو برجیٹ، صوفیہ لارین اور برڈٹ باردو بنائے ہوئے آتی ہیں تو وہ چاروں بھی آنے والی نت نئی لڑکیوں پر تنقید اور تبصرے شروع کر دیتے ہیں اور جو انھیں پسند آ جائے اسے اپنا دوست بنانے کی سعی کرتے ہیں۔ اور اس میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ ایک قبول صورت ہے اور محبوب شخصیت رکھتا ہے۔ ایک مشہور آرٹسٹ ہے دوسرا ایک ادیب، تیسرا ایک ابھرتا ہوا گلوکار اور چوتھا ایک مشہور اداکار۔ سچ پوچھا جائے تو ان کی زندگی دو ہی چیزوں پر منحصر ہے۔ شراب اور لڑکی آج بھی ان کی باتوں کا موضوع ایک لڑکی ہے۔ جو شائد پہلی مرتبہ اس کیبے میں اپنی ساتھی لڑکیوں کے ساتھ آئی ہے۔ حسب معمول سب نے اپنی اپنی رائے ایک ایک چٹھی پر لکھ کر دی، پہلی چٹھی پر لکھا تھا جو غالباً آرٹسٹ کی تھی "- وہ اجنتا کی کوئی تصویر نہیں ہے جسے دیکھ کر مجھے کوئی تراشا مجسمہ یاد نہیں آیا ـــ آبشار نے جلترنگ نہیں بجایا لیکن وہ مجھے پسند ہے۔ ایک لڑکی ہونے کی وجہ سے - ایک دوشیزہ ہونے کی خاطر ــ ادیب نے لکھا کہ اتنے سرخ ہونٹ تو چیل تازہ گوشت کے دھوکے میں جھپٹ پڑے۔ اداکار نے لکھا ـ دیکھ کے تارے ٹٹ ٹٹ جاوَن کہی سوہنیاں تیری چالاں" (تیری چال کتنی حسین ہے، تجھے دیکھ ستارے مارے شرم کے ٹوٹ جاتے ہیں ــ) آخری چٹھی گلوکار کی تھی جو کہ اس پارٹی کا سرغنہ تھا۔ گلوکار نے لکھا تھا ـ تم لوگ جس لڑکی کے بارے میں اپنی رائے دے رہے ہو، جسے اپنی ہوس کا شکار بنانا چاہتے ہو۔ اور جسے اپنی کمپنی میں شامل کرنا چاہتے ہو ـ وہ میری سگی بہن ہے ــ" دوسرے ہی لمحے ایسا محسوس ہوا جیسے چار ربڑ کے غباروں میں بیک وقت کانٹا چبھ گیا ہے۔



مولانا ناطق گلاؤٹھی

اور کچھ عفوِ معاصی کا نہ ساماں ہوتا! | میں پشیماں جو نہ ہوتا تو پشیماں ہوتا
کون تھا دشمنِ جاں اپنے مقدر کے سوا | یہ نہ ہوتا تو خدا اللہ نگہباں ہوتا
حسرتیں ہستی موہوم کی توبہ، توبہ | کوئی ارمان تو ارمان سا ارماں ہوتا
عرض مطلب میں نہیں شرم تماشائی ہو اگر | ہم بھی کہہ دیتے کچھ ان سے اگر امکاں ہوتا
غم سے آخر دل بیمار میں باقی کیا تھا | چارہ گر کون سی امید پہ درماں ہوتا
کہیں ظالم جو کفن چور نہ ہوتی یہ زمیں | آدمی عرصۂ محشر میں نہ عریاں ہوتا
کیا مصیبت ہے کہ گھر نام ہے غم خانے کا | میں پریشان نہ ہوتا جو یہ زنداں ہوتا
دوست سامانِ تباہی کیلئے تھا سب کچھ | دشمنوں کا ہمیں کس واسطے ارماں ہوتا

اشک باری میں بھی کچھ بات ہے ورنہ ناطق
ابر پر کوئی مصیبت تھی جو گریاں ہوتا



حضرت مسلم فریدی

آؤ نئی طرح سے چمن کو سجائیں ہم
کانٹوں کو بھی حریفِ گلستاں بنائیں ہم

اٹھ کر بدل دیں نظمِ زمانہ بہ عزم تو
بجلی کو پاسبانِ نشیمن بنائیں ہم

تب زندگی میں پائیں گے آثارِ زندگی
جب دار پر بھی نعرۂ وحدت سنائیں ہم

دامانِ گل سے خار نہ کوئی الجھ سکے
ایسا مزاجِ رنگِ گلستاں بنائیں ہم

طوفان بھول کر بھی ادھر کا نہ رخ کرے
اپنی نگاہِ گرم جدھر بھی اٹھائیں ہم

ہے ننگِ آشیاں جسے محتاجِ آشیاں
بن جائے آشیانہ جہاں بیٹھ جائیں ہم

دل ہی نہیں کسی کے خلوص و وفا یہاں
مسلم کسے رموزِ محبت بتائیں ہم



شمع بزم ناز بن کر جو شبستانوں میں ہے
زندگی کی وہ چمک ہم سوختہ جانوں میں ہے

اک طرف کانٹوں میں دامن اک طرف دامن میں پھول
اب یہی نظارہ دنیا کے گلستانوں میں ہے

انجمن در انجمن ہے، داغ دل کی روشنی
ایک یوسف جلوہ آرا کتنے کنعانوں میں ہے

تو نہ ہو دل سے جدا اے یادِ صبح زرنگار
تیرے ہی پرتو سے کچھ رونق سیہ خانوں میں ہے

ایک اُمی نے جو چھیڑا تھا حجازی ساز پر
آج بھی اس نغمۂ فطرت کی لے کانوں میں ہے

رشک کرتے ہوں فرشتے جن پہ انساں ہے وہی
یوں تو کہنے کو ہر اک انسان، انسانوں میں ہے

جھیلتا ہوں ہر ستم احباب کا ہنس کر ادیب
یہ سلوکِ خاص بھی منجملہ احسانوں میں ہے

غزل

سلیمان اریب

نہیں تو کوئی نہیں ہو تو کل جہاں اپنا
کوئی تو ہوتا مگر زیر آسماں اپنا

کبھی ہے دشتِ وفا میں کبھی ستارۂ نہیں
کہاں کہاں نہیں بھٹکا ہے کارواں اپنا

زمیں کبھی اپنی نہیں ہو یہ راز آج کھلا
سمجھ رہے تھے دِوانے ہے آسماں اپنا

کریں تو کس سے کریں تیری پیار کی باتیں
رقیب بھی کوئی نکلا نہ ہمزباں اپنا

تری گلی بھی ہوئی تنگ دردمندوں پہ
نہیں یہاں بھی ٹھکانہ تو پھر کہاں اپنا

نہ جانے کتنی زبانوں میں آگئی لکنت
اریب ذکر چھڑا نے جہاں جہاں اپنا

شفا گوالیاری



ہونے کو تو یوں شام بھی ہوتی ہے سحر بھی
لیکن کسی صورت سے ہو تسکین نظر بھی

آئیگی اس انداز سے اب شب بھی سحر بھی
سن پائیں گے آہٹ نہ کوئی شمس و قمر بھی!

ممنون ہوں اس دعوت نظارہ کا لیکن
ہوتا ہے سکوں دل کو تو اٹھتی ہے نظر بھی

ہم اپنی تباہی پہ ذرا غور تو کر لیں
کیا ظلم ہے اے گردش ایام ٹھہر بھی

آیا ہوں سنانے کو وہاں غم کی کہانی
ہو جاتے ہیں ناکام جہاں دیدۂ تر بھی

ہیں گرد ترے عزم کے آگے مہ و خورشید
کیا سوچ رہی ہے نگہ شوق گذر بھی

لے آئی کہاں جستجوئے حسن میں وحشت
جس راہ گزر پہ نہیں خود ان کا گزر بھی!

پھولوں کے دلوں میں تو نظر آ گئے شعلے
دیکھا نہ کسی نے کبھی شبنم کا جگر بھی

اللہ رے آشفتگی دور اسیری
جب آئے رہا ہو کے تو یاد نہ گھر بھی

آتی ہے شفا شعر نگاری میں وہ منزل
ہو جاتا ہے بے رنگ جہاں خون جگر بھی



خورشید احمد جامی :

اب اس جگہ ہے ایک سرمئی سا دھواں — کل تھیں جہاں بہار کے خوابوں کی بستیاں

تخلیق کے جمال کو بڑھ کر نہ چھو سکیں — تنقید کے مزاج کی بیمار تلخیاں

محوِ خرامِ ناز ہے یادوں کی چاندنی — نکھرا ہوا ہے اور بھی گیتوں کا آسماں

لکھتا ہوں خونِ دل سے غموں کی بیاض میں — اک جانِ آرزو کے تبسم کی داستاں

تو ہی غمِ حیات ذرا سوچ کر بتا! — ہم میکدے سے دور ملے تجھ کو کہاں کہاں

گزرا ہے یادِ صحبتِ یاراں کا قافلہ — ملتے ہیں دل کی راہ میں جلتے ہوئے نشاں

کچھ لوگ زندگی کے تعاقب میں تھے مگر! — پہنچے تری پناہ میں اے دشتِ بیکراں

فن کا نیا شعور زر افشاں سہی مگر
جامی کھڑا ہوا ہوں مزاروں کے درمیاں

خوابوں کی فصیلوں پہ سحر ڈھونڈنے والو
تاریک فضاؤں میں نئے زخم اچھالو

بے نام صلیبوں کے در و بام سجا لو
کچھ دیر سہی جشنِ چراغاں تو منا لو

اک عمر کے جاگے ہوئے مایوس خیالو
اب تھک کے کمندیں تو مہ و مہر پہ ڈالو



زلفوں کے دھندلکے بھی ہیں صہبا کی پری بھی
ایسے میں ذرا گردشِ دوراں کو بلا لو!

جو نقش نظر آئے تمہیں جادۂ دل میں
الفت کا تقاضا ہے کہ پلکوں سے اٹھالو



دو چار حقائق ہیں سلگتے ہوئے دل میں
بن جائے تو ان سے کوئی افسانہ بنا لو

شہزادہ نقی علی خاں ثاقب

دنیائے مہ و مہر کی تسخیر سے پہلے
اک بار فضائے دلِ انساں تو کھنگالو

ہے منتظرِ تیشہ زنی کوہِ مصائب
قسمت کی لکیروں کی طرف دیکھنے والو

سب کچھ ہے شعورِ غمِ ایام کی دولت
اس کو تو زمانے کی نگاہوں سے بچا لو!



حنیف دھولیوی

سکوں تلاش جوانی کا دور ختم ہوا — سرور بخش کہانی کا دور ختم ہوا

ابھی تمام ہوا بھی نہ تھا فسانۂ شوق — کہ نامراد جوانی کا دور ختم ہوا

اب اپنی اور ہی کچھ ہے طلسم ہوشربا — فضول قصہ کہانی کا دور ختم ہوا

فسانۂ غم ماضی کا تلبکے ماتم — اٹھو کہ مرثیہ خوانی کا دور ختم ہوا

چلو کہ اہل گلستاں کا جائزہ لیں — سنا ہے فیض رسانی کا دور ختم ہوا

چمن میں گریۂ شبنم تو آج بھی ہے وہی — خبر تھی اشک فشانی کا دور ختم ہوا

اب اور رنگ میں ڈوبا ہوا ہے میخانہ
حنیف اصغر و فانی کا دور ختم ہوا



بیتاب نظامپوری

مجھ سا گلشن میں کوئی بخت کا مارا نہ ہوا
چارۂ تسکیں کا سہارا بھی سہارا نہ ہوا

بیوفا تم ہمیں کہتے ہو تو کہہ لو لیکن
ہم کسے جا کے کہیں کوئی ہمارا نہ ہوا

ان کو کیا جلووں سے بھر دیتے یہ ساری دنیا
سچ تو یہ ہے کہ کوئی وقفِ نظارہ نہ ہوا

دلِ ناداں سے کوئی اور شرارت ہوتی
یہ بھی اچھا ہوا جنت میں گزارا نہ ہوا

جن کی دنیا کی نگاہوں میں بڑی وقعت ہے
ایسے لوگوں سے کبھی ساتھ ہمارا نہ ہوا!

غم کے آنسو مری پلکوں پہ بہت چمکے تھے
حیف صد حیف کوئی بخت کا تارا نہ ہوا

ہم نے جب چاہا اسے دل سے لگایا بیتاب ٭ غم سے بڑھ کر کوئی محبوب ہمارا نہ ہوا



اختر رشیدی برہانپوری

یہ خاکی فرش نیلا شامیانہ　　نگاہِ جستجو کا قید خانہ!

جسے برقِ جمالِ یار کہیے　　وہی مرغِ نظر کا آشیانہ

حیاتِ مختصر ثابت ہوئی ہے　　جہاں پر اک نگاہِ طائرانہ

ملو جس سے نمود و نام کی بات　　جہاں جاؤ ہوس کا کارخانہ

ہوئی جاتی ہے دنیا میری دشمن　　عداوت ہے تمہارا دوستانہ

تمنائے چمن فطرت ہے اختر!

مقدر ہے قفس کا آب و دانہ،



سہیل انصاری دہلیہ

فضول ہم سے نہ حور و پری کی بات کرو
جو ہو سکے تو کسی آدمی کی بات کرو

نہیں زیادہ تو ہو ظرف جس قدر جس کا
جو دسترس ہے تو دریا دلی کی بات کرو

ستا رہی ہے مجھے یاد اہل زنداں کی!
چمن میں بیٹھ کے تم دل لگی کی بات کرو

نئے چراغ نئی روشنی کے پروانو!
کبھی کبھی تو مری تیرگی کی بات کرو

ابھی کچھ اور بھی باقی ہیں کیا فریب و ستم
خطا معاف نہ اب دوستی کی بات کرو

یہاں تو چور ہے زخموں سے دل وہ کہتے ہیں
خوشی کے گیت سناؤ خوشی کی بات کرو

فسانۂ علم پہ داغ کون سنتا ہے!
سہیل مہر و مہ و مشتری کی بات کرو

غزل

اکرم دھولیوی

ابھی تک یادگارِ حسرتِ برباد باقی ہے
مرے اجڑے ہوئے دل میں کسی کی یاد باقی ہے

کہاں کی منزلِ مقصود کیسا عیش کیا راحت
یہاں اک اک قدم اب تک وہی افتاد باقی ہے

ابھی تک چونک چونک اٹھتا ہے دل پر زخم ہیں
جنوں باقی نہیں لیکن جنوں کی یاد باقی ہے

چمن میں اب نہیں صیاد کا حکمِ ستم لیکن!
نشیمن کیلئے بیدادِ برق و باد باقی ہے

زمانہ ہر طرح دادِ تباہی دے چکا مجھ کو!
بس اب اک نکلی جان ہے صیاد کیا باقی ہے

سنے جاتے نہیں کیوں شیوۂ تسلیم کے طعنے
جب اے دل تجھ میں ہوشِ نالہ و فریاد باقی ہے

خدا جانے ابھی کیوں ان کا رنگِ تمکیں بدلے
ابھی سنتے سنانے کو مری روداد باقی ہے

تغافل اک ادائے حسن ہے فطرت نہیں لیکن
ابھی امیدِ تسکینِ دلِ ناشاد باقی ہے

سنے جاتے نہیں کیوں شیوۂ تسلیم کے طعنے!
جب اے دل تجھ میں ہوشِ نالہ و فریاد باقی ہے

زبانِ خلق حکمِ حرفِ آخر ہی سہی لیکن
مرے حق میں ابھی تک آپ کا ارشاد باقی ہے

قفس کی زندگی نے مجھ سے اکرم کیا نہیں چھینا
غنیمت ہے اگر دل میں چمن کی یاد باقی ہے



شبیر احمد راہی جھیڑی

زندگی میں کوئی بے سہارا نہیں
ہاں مگر وہ جو دل سے تمہارا نہیں

حق کی راہوں میں کانٹے ہی کانٹے سہی
گمرہی پھر بھی مجھکو گوارا نہیں

اک زمانہ ہوا ہم نے طے کر لیا
جو تمہارا نہیں وہ ہمارا نہیں

دوستو تم کہاں ہو سہارا تو دو
مجھ میں اب غم اٹھانے کا یارا نہیں

اس لئے ڈوب جاتے ہیں سب اہل دل
بحر الفت کا کوئی کنارا نہیں

منکشف کتنے اسرار ہم پر ہوئے
راز ہستی مگر آشکارا نہیں

لاکھ راہی کا دشمن زمانہ ہوا
زندگی میں کسی سے وہ ہارا نہیں

غزل

سید حرمت الاکرام

آ اے زمانہ! قصورِ طرح فال لیے ہوئے
ہم ایک چراغ ہیں تہِ داماں لیے ہوئے

اُٹھ کر جھکی ہے جھک کے اُٹھی ہے کوئی نگاہ
اک اک فسانہ کے کئی عنواں لیے ہوئے

کہتا ہوں عقل سے کہ مری رہبری کو آ
ہاتھوں میں اپنا چاکِ گریباں لیے ہوئے

لیلائے زیست! چہرہ محمل اٹھا بھی دے
آیا ہوں نذر کو دل و ایماں لیے ہوئے

سفاک کس قدر ہے یہ وضعِ حیا بھی
میں جی رہا ہوں جینے کا ارماں لیے ہوئے

کس کو ازل سے ڈھونڈ رہا ہے خبر نہیں
انساں امانتِ غمِ پنہاں لیے ہوئے

تاریکیٔ حیات سے الجھا ہوں تا حیات
پلکوں پہ آنسوؤں کا چراغاں لیے ہوئے

اک ملتفت سی برہمی دکھا کے اک کرم
کیا کیا نہ ہے وہ حسن پشیماں لیے ہوئے

حرمت ہماری بیدوری بھی عجیب ہے
بیٹھے ہوئے ہیں وسعتِ امکاں لیے ہوئے



وقار خلیل

یوں بھی جینے کی تمنا میں جیا جائے ہے
عمر بھر زہر امیدوں کا پیا جائے ہے

اب بھی ہوتا ہے یہاں جنس وفا کا سودا
شہر دل مصر کا بازار بنا جائے ہے

موسلا دھار برستی ہیں گھٹائیں غم کی!
کس سے مٹی کے گھروندے میں رہا جائے ہے

نیم ویران سی راہوں میں غم دل کا چراغ!
ہجر کی رات اکیلا ہی جلا جائے ہے

سنگ باری کا زمانہ ہے لہو کا موسم
کج کلاہوں سے کہاں آنچ رہا جائے ہے

دور رہ نزدیک نہیں سایۂ گیسو کا فریب
وقت کی دھوپ میں ہر خواب جلا جائے ہے

کس سے حالات کی الجھی ہوئی راہوں میں وقار
شعلۂ سر کی مانند رہا جائے ہے

ممتاز راشد

پھر تصور ان کی جلوہ گاہ تک پہنچا تو ہے
ذہن و دل کی تیرگی میں چاند اک اُبھرا تو ہے

رنگ لائی کُشتگانِ زندگی کی — خامشی
شہر میں اک سمت اس کے ظلم کا چرچا تو ہے

ساعتوں کی دھوپ گھڑیوں کی تپش لمحوں کی آنچ
تیری زلفوں سے بچھڑ کر ہم نے یہ پایا تو ہے

کھو گئے یادوں کے آہو دشتِ ماہ و سال میں
اب بھی لیکن سنگِ ماضی سے لہو رِستا تو ہے

سُولیوں کے لب سے ہو یا ہو گُلے دار سے
ہم نے اس کے عشق کا نغمہ مگر گایا تو ہے

کیا ہوا گر اس کا پیراہن نہ رنگیں کر سکے
خونِ دل کو صرف کر کے نکے لئے صحرا تو ہے

ہر نفس ہر آب ہر لمحہ بلا سے جاں سہی
اے نگارِ زندگی پھر بھی تجھے چاہا تو ہے

سپیدۂ تمنا

★

جو کسی کے پیار کی دین تھے وہ نقوش میں نے مٹا دیئے
جو جلائے تھے کبھی شوق سے وہ چراغ خود ہی بجھا دیئے

مری منزلیں ہیں اداس کیوں، کہاں کھو گئے ترے نقشِ پا
مرے سجدے جن پہ نثار تھے وہ نشان کس نے مٹا دیئے

تجھے کیا خبر ہے، اے بے خبر تری آبرو کے خیال سے
میں نے اپنی آنکھوں کو سی لیا میں نے اپنے ہونٹ جلا دیئے

مرے دشمنوں کا سلوک بھی جنھیں آج تک نہ دکھا سکا
غمِ زندگی کے وہ دن مجھے مرے دوستوں نے دکھا دیئے

حسرت جے پوری

باب

اسیرانِ محبت گلبدن کی بات کرتے ہیں !
انھیں کانٹوں سے کیا لینا چمن کی بات کرتے ہیں
جو سچے ہیں کسی ظلم و ستم سے ڈر نہیں سکتے
شہیدانِ وفا دار و رسن کی بات کرتے ہیں
ہمیں تو شرم آتی ہے تمہارا نام سن سن کر
جہاں والے تمہاری انجمن کی بات کرتے ہیں
کسی کافر نظر نے اپنی توبہ توڑ ڈالی ہے
خدا سے ہم اسی توبہ شکن کی بات کرتے ہیں
مئے انگور ناجائز، لہو انساں کا جائز ہے،
یہ قبلہ شیخ جی دیوانے پن کی بات کرتے ہیں
کوئی آئے ہمیں بھی آزمائے بخدا حسرتؔ
وطن کے ہم ہیں دیوانے وطن کی بات کرتے ہیں

غزل

جوہر امروہوی

ناسور ہے ہر زخم نہاں میری غزل میں
غم دیکھتے ہیں آپ عزیزاں میری غزل میں

یا جنس مسرت ہی زمانہ میں نہیں ہے
یا جنس مسرت ہے گراں میری غزل میں

جذبات کے تنکوں پہ جو اک برق گری تھی
اب تک ہے نشیمن کا دھواں میری غزل میں

خاموش گزر جاتا ہوں ہر منزل غم سے
شکوؤں کا نہیں نام و نشاں میری غزل میں

وہ بات جو آئینہ حالات نہیں ہے
اب ایسی کوئی بات کہاں میری غزل میں

دنیا کے تقاضوں کا یہاں نام ہے سلمیٰ
ق
عذرا نہ کوئی نور جہاں میری غزل میں

ایسی بھی کوئی آرزو دل میں نہیں جوہر
مومن کا ہے انداز بیاں میری غزل میں

رقصِ نجوم

اب اس کے سنور جانے کا امکاں تو نہیں ہے
تقدیرِ مری گیسوئے جاناں تو نہیں ہے

ساحل کی طرف مجھ کو لئے جاتی ہیں موجیں
ابھی بھی کوئی سازشِ طوفاں تو نہیں ہے

اک جام شکستہ کو کلیجے سے لگا کر!
میں سوچ رہا ہوں مرا ارماں تو نہیں ہے

جس شہر میں قاتل کو کہا جائے مسیحا
اس شہر میں جینا کوئی آساں تو نہیں ہے

تقدیر ڈبوئے تو الگ بات ہے انجم
ویسے مجھے اندیشۂ طوفاں تو نہیں ہے

نجم رومانی

مرزا عزیز جاوید

زمانہ قدر دانی پر جب آئے — تو قطرے کو سمندر سے ملائے

گھڑی رفتار اپنی بھول جائے — نظر جس وقت جلوؤں میں نہائے

وہی باتیں چھپا سکتا ہے دل کی — جو آئینہ میں منہ اپنا چھپائے

پیامِ دل کے اس بارِ گراں سے — قدم نظروں کے اکثر ڈگمگائے

خوشی کے پھول ہو جائیں نچھاور — ترے غم کا جو سبزہ لہلہائے

اب ان کی یاد یوں آتی ہے دل میں — کہ جیسے شہر میں چاند آ کے جائے

تمہاری یہ غزل جاوید صاحب !!
جو بیٹھیں حضرتِ مجروح جائے

سیدہ زہرہ بریلوی

غزل

اشک آنکھوں میں چھپاتے ہوئے جی ڈرتا ہے
سوزِ غم اور بڑھاتے ہوئے جی ڈرتا ہے

پھر اسی شاخ کے سائے میں غمِ دل کی قسم
آشیاں اپنا بناتے ہوئے جی ڈرتا ہے

ضبطِ غم نے جنھیں آنکھوں میں چھپا رکھا ہے
ان ستاروں کو لٹاتے ہوئے جی ڈرتا ہے

اے لبِ خشک پہ مجبورِ محبت کی قسم
آپ کا نام بھی لاتے ہوئے جی ڈرتا ہے

در کو کعبہ نہ بنا دے مری بے چین جبیں!
سر کو سجدے میں جھکاتے ہوئے جی ڈرتا ہے

جس کی تلخی نے غمِ دل کو سکوں بخشا تھا
اب وہی جام اٹھاتے ہوئے جی ڈرتا ہے

ان کی پلکوں پہ نظر آتے ہیں آنسو زہرہ
دل کے ناسور دکھاتے ہوئے جی ڈرتا ہے

عبدالقیوم نازاں

صبحِ نو کا یہ بانکپن دیکھو
زر فشاں ہے کرن کرن دیکھو

ہم ستاروں کی سمت جاتے ہیں
تم حسینوں کی انجمن دیکھو

سیکڑوں دل ہیں چور زخموں سے
گل کھلے ہیں چمن چمن دیکھو

پہلے سینچو لہو سے گلشن کو
پھر بہارِ گل و سمن دیکھو

جو حوادث سے ڈر گئے نازاں
ان پہ دنیا ہے خندہ زن دیکھو



غیرت انصاری کھمبٹی

سرِ شام کس نے یہ چلمن ہٹادی
ہوا عشق صدقے جنوں نے دعا دی

سبھی کہہ رہے ہیں کہ وہ بے وفا ہیں
مگر ہم نے تو دل کی بازی لگادی

ہوئی شامِ غم شمعِ حسرت جلادی
تری یاد نے گھر کی رونق بڑھادی

شبِ غم نے جب اپنے گیسو بکھیرے
بہت ہم نے صدرہ کے تم کو دعا دی

گر جانا تھا سرِ راہ غیرت
کراتے ہیں منزل نے بڑھ کر صدا دی

لطفی آفاقی بھیمڑی

اگر آپ کی مہربانی نہیں ہے
تو خلدِ نظر زندگانی نہیں ہے
بہت تنگ تیرے غم سے مانوس ہے دل
کہ اب خواہشِ شادمانی نہیں ہے
جہاں اپنا دشمن بھی ہو خود غرض کیا
خود اپنے سے گر بدگمانی نہیں ہے
رقابت پہ اس کی بھروسہ نہ کیجیے
کسی کی یہ دنیائے فانی نہیں ہے
تمنا میں منزل کی بیٹھے ہوئے ہیں
یہ کیا گمرہی کی نشانی نہیں ہے
عجب انقلابِ زمانہ ہے لطفی
کہیں اُن کی حکمرانی نہیں ہے

غزل



جب دلوں میں عزائم جواں ہوگئے قافلے خود ہی منزل نشاں بن گئے
صبحِ امید کی مسکرائی کرن حادثاتِ شبِ غم دھواں بن گئے

بات اتنی زیادہ تو کچھ بھی نہ تھی کچھ خطا تھی مری کچھ قصور آپ کا
چند جملے جو کل وجہِ تکرار تھے بات بڑھتی رہی داستاں بن گئے

راہ بھی منزل تو کی دشوار تر سعیِ پیہم مگر رنگ لا کر رہی
بے حقیقت تھے کل تک مگر نقشِ پا آج رشکِ صد کہکشاں بن گئے

آپ بیٹھے رہے کل تک جو بے خبر جستجو میں بھی کوئی راہِ سفر
ٹھوکروں میں زمانے کے تھا جن کا سر سر اٹھاتے ہی وہ آسماں بن گئے

تمنا کے خونِ جگر سے ہیں گل آتشیں، ان کا گلشن پہ فہیمی کوئی حق نہیں
اور کل تک جو گلچیں تھے صیاد تھے وہ محافظ بنے باغباں بن گئے

الحبیب فہیمی بھیمڑی

شاکر ارنڈولسوی

یہ بدلتا رنگِ عالم کس سے دیکھا جائے ہے
ہائے الفت کا چلن دنیا سے اٹھا جائے ہے

چاند سا چہرہ پسینہ میں جو ڈوبا جائے ہے
اک اندھیرا سا نگاہوں میں مری چھا جائے ہے

گردشوں کی دھوپ جب جب مجھکو تڑپا جائے ہے
تیری زلفوں کی گھنیری چھاؤں یاد آجائے ہے

بیٹھے بیٹھے موت کا جب بھی خیال آجائے ہے
زندگی کا ایک شعلہ دل میں لہرا جائے ہے

سرد ہوتی جا رہی ہیں زندگی کی مشعلیں
ہائے کن آنکھوں سے یہ طوفان دیکھا جائے ہے

جانے کن جلووں میں الجھا ہے مرا حسنِ نظر!
عشق کا رازِ حقیقت مجھ پہ کھلتا جائے ہے

خاک پہنچے گا وہ اپنی منزلِ مقصود تک
جو کہ منزل کے تصور سے ہی گھبرا جائے ہے

ہم کو شاکر یہ سزا کس جرم کی ملنے لگی!
بے سبب سارا زمانہ ہم سے روٹھا جائے ہے

زاہد المحوی دیولالوی

بھری بہار میں، صحنِ چمن میں آگ لگی
کلی کلی کے نئے پیرہن میں آگ لگی

ہمارا خون کہاں رائیگاں گیا قاتل
لہو کی بوند سے دار و رسن میں آگ لگی

ابھی چراغ جلے تھے کسی کی محفل میں
کہ بدنصیب پتنگوں کے من میں آگ لگی

یہ صرف میرے نشیمن کی واردات نہیں
چلو اے اہلِ چمن بھرے چمن میں آگ لگی

لرز کے قطرۂ خوں اک گرا تھا مژگاں سے
زمیں سے تا بہ فلک دم زدن میں آگ لگی

یہ آج کون ہے مصروفِ گریہ و ماتم
یہ کس کے اشک سے میرے کفن میں آگ لگی

نظر نظر سے ملی تھی کہ دفعتاً زاہد
مرے ہی دل میں نہیں، انجمن میں آگ لگی



ضیا ہانی

مذاقِ فکر و نظر ہو جس کا تقدس و آگہی کا محرم
اسی کے قدموں کو چومتا ہے ہمیشہ بام فلک کا زینہ
اسی کے ہاتھوں سے لکھے جاتے ہیں فیصلے وقت کی جبیں پر
عمل کے میدان میں اتر کر جو ایک کرتا ہو "خون پسینہ"

نمودِ گل کی خوشی میں مالی ہزار، تا حسب اظہار ہو !
اسے یہ احساس تک نہیں ہے کلی کا بھی شق ہوا ہے سینہ
وہی سیاہی، وہی اندھیرے وہی تلاطم وہی تھپیڑے
ابھی ہے تقدیر گردشوں میں ابھی ہے گرداب میں سفینہ

عمل اسی کا یقیں اسی کا، خودی اسی کی، خدا اسی کا — !
جو آرزوؤں کے خون پر بھی لٹا نہ دے صبر کا خزینہ



محمد عمر شفق کشمیری

نوکِ مژگاں کو ذرا کچھ اور نم ہونے تو دو
جگمگائیں گے ستارے شامِ غم ہونے تو دو
قلقل مینا سے اٹھے گی صدا مرحبا!
پھر سرِ میخانہ کچھ ذکر حرم ہونے تو دو
ناخدا کی ناخدائی کا بھرم کھل جائیگا
کشتئ دل کو حریفِ موجِ غم ہونے تو دو
دیکھو ہی لوگے محبت کی کرشمہ سازیاں !
دل کو بربادِ تمنا کم سے کم ہونے تو دو،
آستانِ یار ہوگا، آستاں اپنا شفق — شوق سجدہ میں سرِ تسلیم خم ہونے تو دو

شمع ادبی معمہ نمبر ۱۶ کا ممکنہ حل

اشارے دائیں سے بائیں
مستقل الفاظ (۱)، خون (۱۱) ذات
(۱۴) اثر
(۵) ازل، اول
دونوں کے معنی ایک ہی ہیں لیکن ابتدا آفرینش کی موجودگی میں ازل زیادہ موزوں ہے
(۱۳) بنا، کھلا
اشارہ میں آدمی کے "بوڑکو" لکھا ہے اس کی موجودگی ہیں "بنا" لکھنے پر مجبور کرتی ہے
(۱۵) جام، کام، نام
دنیا میں ایسے انسان بھی ہیں جنہیں صرف کام سے عشق ہوتا ہے۔ وہ دن رات کام کرتے رہتے ہیں کام کلید کامیابی ہے۔
(۱۷) کچھ، کئی۔
اردو افسانہ نگاروں میں مشاہیر کی تعداد زیادہ ہے۔ اس لئے کئی مناسب جواب ہے
(۲۰) جنگ، رنگ، سنگ

اشارہ میں لفظ "جنگ" لکھا گیا ہے اس جملہ سے رنگ واحد جواب ہے

اوپر سے نیچے
مستقل الفاظ (۴) کر سکتا (۶) حالی (۱۱) آپ (۱۲) دیا، (۱) خاص، خاک
بول چال میں خاک پڑھا لکھتے ہیں لہٰذا "خاک" لکھ کر خاص پر خاک ڈالئے
(۲) مرد، فرد،
فرد میں سبھی آجاتے ہیں اشارہ میں عورت کی موجودگی مرد کا انتخاب کرتی ہے۔
(۳) دو، نو
عام طور پر لوہار چھ بجے ہی کام ختم کرتے ہیں لیکن اگر نو بجے تک کرتا رہے تو وہ فرض عوام کے اطمینان کے لئے کافی ہے۔ دو یہاں مناسب نہیں
(۷) مرض، فرض
بہت سے محنت مزدوری کرنے والے مقروض بھی ہوتے ہیں لیکن مریض بہت

لہٰذہ محنت کے ساتھ مرض کا انتخاب
مناسب ہوگا۔

ظالم ۔ ظالم

ظالم کی ترکیب بالکل غلط ہے ۔
اس کے ساتھ ظالم لکھنا ہی درست ہوگا
اوپر سے نیچے ۔

(۹) اعتبار ، اعتراض
مشہور ہے کہ عورت کی ذات پیٹ کی
ہلکی ہوتی ہے اس پر اعتبار کرنا ٹھیک نہیں
لہٰذا اعتبار لکھیے ۔

(۱۰) بگڑا ، جکڑا ۔

اشارہ ہیں زلفوں کی موجودگی میں بولچال کے
لحاظ سے جکڑا ہی صحیح جواب ہو سکتا ہے

(۱۳) اب ، آج ،
زمانہ اور وقت کے لحاظ سے آج قرین قیاس ہے

(۱۴) کبھی کبھی ،
کبھی میں کبھی کی نسبت زیادہ زور پایا جاتا ہے
چنانچہ ہم کبھی کبھی کو ترجیح دیتے ہیں

(۱۹) جس ، جن ،
اشارہ میں واقعات پر زور دیا گیا ہے
جو ترجیح ہے جن ہی لکھا جا سکتا ہے

اعلان ملکیت و دیگر تفصیلات زیر دفعہ ۸ فارم چہارم

بابت ماہنامہ نقاش ۵۰ نظام پور بھیمڑی

(۱) مقام اشاعت .... ۵۰ نظام پور بھیمڑی
(۲) وقفہ اشاعت .... ماہ نامہ
(۳) پرنٹر کا نام .... حنیفی نظام پوری
قومیت ... ہندستانی ، پتہ ۔ ۵۰ نظام پور بھیمڑی
پبلشر کا نام .... حنیفی نظام پوری
قومیت .. ہندستانی ۔ پتہ ۔ نظام پور بھیمڑی ۔
ایڈیٹر کا نام .. حنیفی نظام پوری ۔ پتہ نظام پور بھیمڑی

ان افراد کے نام اور پتے جو اخبار کے مالک ہیں
یا حصہ سرمایہ میں ایک فیصد سے زیادہ کے حصہ دار } حنیفی نظام پوری نظام پور بھیمڑی

میں کہ حنیفی نظام پوری اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین
کی حد تک درست ہیں ۔

حنیفی نظام پوری پبلشر
مورخہ ۱۰ مارچ فروری سنہ ...

شمع ادبی معمہ نمبر ۱۶۱ ماہنامہ شمع آصف علی روڈ نئی دہلی

ایک لاکھ روپے کے انعامات

اشارے

بائیں سے دائیں

۱۔ ماں باپ کے — کا اثر اولاد میں کچھ نہ کچھ ضرور آتا ہے

۳۔ صبح پانچ بجے یا رات کے — بجے اگر آپ کے ہاں سے ہتھوڑے کی آواز آئے تو اسے شکر آپ کا تمغہ راہ اگلے چھ ماہ تک سکھ کی نیند سوئے گا

۴۔ اِنا اگر آپ یا نہ سے باہر نہ نکلے تو شکار کیونکر — ہے!

۵۔ روز — تخلیق آدم کے وقت فرشتوں نے خالق مطلق سے یہ کہا تھا کہ تو اس ہستی کو پیدا کر رہا ہے جو زمین پر فساد بپا کرے گی اور خون بہائے گی

۶۔ بجٹ کا بڑا حصہ عوام کے — اور تہذیبی معیار کو بلند کرنے پر خرچ ہوتا ہے

۷۔ جمنت ادھ — ایسی دو چیزیں ہیں جو کبھی یکجا نہیں ہوتیں

۸۔ جاہل، — ننگی عورتوں کے جلوس کو دیکھ کر خوش ہوں۔ بچوں کے سر نیزوں پر لٹکائے پھریں، عورتوں کی سرِ عام عصمت دری پر نازاں ہوں۔ لوٹ مار کو اپنا مسلک بنائیں اور ان حرکتوں کا مذہب یا سیاست کے نام پر جواز ثابت کریں تو سمجھ لینا چاہئے کہ ہم ایک ایسے — دور میں سے گزر رہے ہیں جس میں انسان کی شکل اس قدر مسخ ہو چکی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی

۹۔ عورت پر — نہیں کرنا چاہئے

۱۰۔ جیسے پرندہ ڈھیلے دام میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پریشان زلفوں نے مجھے — رکھا ہے

۱۱۔ جنت میں سرکشی کے لئے جا رہے ہیں — یہ تو جناب شیخ قباحت کی بات ہے

۱۲۔ خدا سے بڑھ کر کوئی — زیادہ مستحکم، محفوظ تر اور یقینی نہیں

۱۳۔ پیٹ کی آنچ آدمی کو سب کچھ — دیتی ہے

۱۴۔ پاس تھا ناکامیٔ صیاد کا اے ہمصفیرا ورنہ میں اڑ جاتا — کے آتا ایک دانے کے لئے

۱۴۔ بیشتر ایشیائی ملکوں میں — بھی غربت لوگوں کی بڑی تعداد کا مقدر بنی ہوئی ہے

۱۵۔ لوگ عشق کو صرف عورت تک کیوں محدود کر دیتے ہیں — کا عشق بھی تو ہو سکتا ہے

۱۶۔ علم صرف بڑی بڑی کتابوں میں — پڑا ہے

۱۷۔ اردو میں — افسانہ نگار بہت مقبول ہوئے جن میں سے مولانا راشد الخیری اور منشی پریم چند صاحب کی کتابیں قابلِ فخر ہیں

۱۷۔ ایک بات یاد رکھنا — دشمن کا اعتبار نہ کرنا

۱۸۔ اردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی زمین میں — اگر فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا

۱۹۔ انسانی تاریخ ایسے ایسے ہولناک واقعات سے لبریز ہے — کے پڑھنے سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں

۲۰۔ — بھی ایک ضروری چیز ہے

۲۱۔ ہمیشہ وہی کرو جو حق ہے خواہ لوگ کچھ ہی — کریں

اوپر سے نیچے

۱۔ کتب — کا لوگوں کو ہی اتنا اچھا معلوم ہوتا ہے جو پڑھتا — نہ ہو۔ البتہ ذرا ذرا سی بات پر چھٹی دے دیتا ہو

۲۔ عورت کے دل کے حال سے کوئی — کا حقہ واقف نہیں ہو سکتا

۱۰۰۰۰۰

ایک لاکھ روپے

نقد انعام

ایمان داری سے انعامات کی شان دار تقسیم، دل چسپ معنی خیز اشاروں اور موزوں جوابات کے ذریعے شمع ادبی معمے ایک ہی سال میں ہندوستان اور پاکستان بھر میں ہر دل عزیز بن گئے ہیں۔ شمع ادبی معموں کی یہ کامیابی جہاں آپ کی غیر معمولی دل چسپی اور ہمت افزائی کا ثبوت ہے۔ وہاں شمع (نئی دہلی) کے وسیع ذرائع، عمدہ تنظیم، ٹھوس وسائل اور معموں کے میدان کی قیادت کے برسہا برس کے تجربے کا بھی نتیجہ ہے۔ بڑے انعام دل چسپ اشارے، موزوں جواب اور ایمان داری سے تقسیم انعام۔ یہ سب خوبیاں آپ کو ہمیشہ کے لیے شمع ادبی معموں کا گرویدہ بنائے رکھیں گی —— آج ہی اپنے حل بھیجیے!

تفصیلات کے لیے تازہ ماہنامہ شمع (نئی دہلی) یا ماہنامہ روبان (کراچی) ملاحظہ فرمائیے

The "NAQQASH" Monthly

Wide Cerculated Urdu Magazine

l. 3 APRIL 1964 S. No. 1-2-3